معاصرینِ داغ دہلوی
داغ دہلوی کے ۱۶۲ معاصرینِ حیدرآباد کا تذکرہ
مرتّب
ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خاں

معاصرینِ داغ دہلوی

داغ دہلوی کے ۱۶۲ معاصرینِ حیدر آباد کا تذکرہ

معاصرینِ داغ دہلوی

داغ دہلوی کے ۱۶۲ معاصرینِ حیدر آباد کا تذکرہ

مرتّب

ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خاں

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

MAASREEN-E-DAGH DEHELVI

Edited by

Dr. Mohd. Ataullah khan

Year of Edition 2009

ISBN 978-81-8223-602-8

Price Rs. 400/-

نام کتاب : معاصرینِ داغ دہلوی

(داغ دہلوی کے ۱۶۲ معاصرینِ حیدرآباد کا تذکرہ)

مرتب : ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خاں

پتہ : 16-4-678/B, Chanchal Guda, Hyderabad-24

سنِ اشاعت : ۲۰۰۹ء

قیمت : ۴۰۰ روپے

مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com

website: www.ephbooks.com

مندرجات

☆☆

فہرست

معاصرینِ داغ دہلوی

☆☆

مصنف کی سوانح

نام	:	محمد عطاء اللہ خاں عطاؔ حیدرآبادی
ولدیت	:	الحاج محمد ضیاء اللہ خان ضیاؔء حیدرآباد
مقام پیدائش	:	رسالہ عبداللہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
ملازمت	:	پرنسپل اورینٹل اردو کالج۔ پی۔ جی اینڈ ریسرچ سنٹر اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد 500029
فون: آفس	:	04023221414
مکان	:	04024414156
موبائیل	:	9849141590
اعزازی خدمات	:	ریسرچ گائیڈ اورینٹل فیکلٹی عثمانیہ یونیورسٹی
رہائش پتہ	:	مکان نمبر 16-4-678/B نیو روڈ چنچل گوڑہ، حیدرآباد 500024

☆☆

انتساب

ان محققین کے نام
جن کے اقتباسات آئندہ
صفحات کی زینت ہیں

عطاء اللہ

☆☆

تعارف

ڈاکٹر محمد عطا اللہ خان میرے عزیز شاگرد ہیں۔ میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب کہ وہ پوسٹ گریجویٹ کالج حیدر آباد میں ایم۔ اے اردو کے طالب علم تھے۔ ایم۔اے کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۸۸ء میں حیدر آباد یونیورسٹی سے ''مجلّہ عثمانیہ کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر ایم۔فل اور پھر اسی جامعہ سے ''عہدِ محبوبیہ کے اردو شعرا'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ اسی دوران انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے مخطوطہ شناسی کا پوسٹ ایم۔اے ڈپلوما بھی کیا جس کی وجہ سے انہیں مخطوطہ شناسی کے فن میں کمال حاصل ہے۔ اس وقت وہ اورینٹل اردو کالج اردو ہال میں پرنسپل اور ریسرچ گائیڈ فیکلٹی اورینٹل لینگوئجس عثمانیہ یونیورسٹی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی نگرانی میں پانچ طالب علم پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی اور چھ طلباء ان کے زیر نگرانی تحقیق کر رہے ہیں اور ایم فل کے تین طلبا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عطا اللہ کو علمی اور ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے ان کے دادا رحمت اللہ خاں رحمتؔ اور والد ضیاء اللہ خان ضیاءؔ اردو اور فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ عطا اللہ نے اپنے دادا کے کلام کا ایک انتخاب ۱۹۹۲ء میں ''انتخاب کلام رحمت'' کے نام سے شائع کیا تھا اور پھر ۱۹۹۷ء میں ''گلستان رحمت کا تنقیدی جائزہ'' آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جزوی مالی اعانت سے شائع کیا۔ ان کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر عطا اللہ نے راقم کے اشتراک سے مملکت گولکنڈہ کے ساتویں حکمران عبداللہ قطب شاہ کے دیوان کی ترتیب و تدوین کی ہے جو مختلف جامعات میں شاملِ نصاب ہے۔ راقم الحروف سے متعلق مشاہیر ادب کے مضامین و مقالات پر مشتمل ایک کتاب ''ڈاکٹر محمد علی اثر ایک مطالعہ'' ۱۹۹۳ء میں شائع کی ہے۔ ڈاکٹر عطا اللہ کا

ایک اہم تحقیقی کارنامہ ''کلیات فدوی کی تنقیدی تدوین ہے''، جس میں انہوں نے سراج اورنگ آبادی کے ایک ہم عصر باکمال شاعر فدوی خان اورنگ آبادی کی حیات وشاعری پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے غیر مطبوعہ دیوان کو بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر عطااللہ ایک بارصلاحیت اور ایسے محنتی اسکالر ہیں جنہیں عرف عام میں Self Made کہا جاسکتا ہے انہوں نے اپنی تصنیفات اور تالیفات بڑی محنت اور جاں فشانی سے مرتب کی ہیں۔ زیر نظر کتاب ''معاصرین داغ'' ڈاکٹر عطااللہ کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جسے انہوں نے ''عہد محبوبیہ کے اردو شعرا'' کے عنوان سے پروفیسر ثمینہ شوکت کی نگرانی میں تحقیق کر کے ۱۹۹۳ء میں حیدرآباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی۔ ہماری جامعات میں پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے زیادہ تر محض ضابطہ کی تکمیل کے لیے لکھے جاتے ہیں ان میں سے بیشتر زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو پاتے۔ اگر مقالہ نگار اپنے تحقیقی کام کو ٹھکانے لگانے کے لئے اسے منظر عام پر لانے کی کوشش کرتا ہے تو اردو کے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اس کی مالی اعانت سے گریز کرتے ہیں اور اگر مصنف اپنے ذاتی سرمائے سے شائع کرتا ہے تو اسے انعام کا مستحق قرار نہیں دیا جاتا۔ ڈاکٹر عطااللہ کا تحقیقی مقالہ ان معدودے چند تحقیقی مقالوں میں سے ایک ہے جنہیں من وعن شائع کیا جاسکتا ہے تاہم ان کی محققانہ دروں بینی نے انہیں نہ صرف اپنے مقالے کے عنوان کی تبدیلی کی طرف راغب کیا بلکہ مقالے کے بہت سے اجزا میں ترمیم واضافہ پر بھی اکسایا۔ ایک سو بانسٹھ شعرا کا یہ تذکرہ ادب میں ایک نادر اضافہ ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔

اس کتاب میں ابتدا دکن کے سیاسی سماجی اور ادبی پس منظر کو اجاگر کیا گیا ہے اور پھر آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خان کے واقعات حیات پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے خانوادہ آسف جاہ کا شجرہ آصف جاہ سادس کی ولادت، تخت نشینی، ریجنسی کا قیام، تعلیم وتربیت، شعر وادب کا فروغ، بیرونی شعرا کی آمد، مقامی شعرا کی شاعری اور نثری کارنامے آصف جاہ کی شاعری وغیرہ کو زیر بحث لایا ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم اور طویل باب داغ کے حیدرآبادی معاصرین شعرا سے متعلق ہے جس میں بہ شمول نواب محبوب علی خان آصف اور داغ دہلوی جملہ ایک سو

بانسٹھ شعرا کا تذکرہ شامل ہے۔ کتاب کا یہ حصہ چار سو سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں ضروری حواشی اور حوالہ جات کے ساتھ مختلف شعراء کے سوانحی اشارے خصوصیات کلام اور ان کا نمونہ عرق ریزی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

معاصرین داغ کے ہم عصر حیدرآبادی شعرا کا ایک مستند تذکرہ ہے اور اس موضوع پر آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں ڈاکٹر عطااللہ کو اس تحقیقی کارنامے پر مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اپنے تحقیق و تدوین کے کام کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

پروفیسر محمد علی اثر

جامعہ عثمانیہ

اگست ۲۰۰۹ء

☆☆

دیباچہ

حیدرآباد دکن میں شعروشاعری کی روایت صدیوں پرانی ہے اس خطہ دکن میں بہمنی اور قطب شاہی سے لیکر آصف جاہی عہد تک ہزاروں شاعر پیدا ہوئے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد سرزمین دکن پر پانچ خود مختار سلطنتیں نظام شاہی، برید شاہی، عماد شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی قائم ہوئیں۔ ان میں سوائے عادل شاہی اور قطب شاہی کے باقی تین سلطنتیں برائے نام تھیں۔ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے تسخیر گولکنڈہ کے بعد قطب شاہی سلطنت کو دہلی کی مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا اور تاناشاہ دولت آباد کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا۔ دہلی کی مغلیہ سلطنت میں اب وہ گرفت باقی نہیں رہی صرف چند مفاد پرستوں کے ہاتھوں مغلیہ سلطنت کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے بادشاہ بدلتے گئے۔ آخر میں جب ۱۸۲۴ء میں احمد شاہ دہلی کے تخت پر جلوہ گر ہوئے تو انہوں نے دکن کے علاقے پر نظام علی خاں کو گورنر بنا کر بھیجا۔ دکن میں صوبہ برار سے تیس کوس دور شکر کھیڑ موضع کے قریب نظام علی خاں اور مبارز خاں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور مبارز خان میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ اس دن سے دکن میں نظام علی خان نے اپنی حکومت کی باضابطہ بنیاد رکھی اور خود مختاری کا اعلان کردیا۔ نظام علی خان کے بعد ان کے بیٹے آصف جاہ ثانی اور پھر آصف جاہ ثالث اور آصفجاہ رابع حکمران ہوئے۔ جب افضل الدولہ آصفجاہ خامس حیدرآباد دکن پر حکمران ہوئے تو کچھ عرصہ کے بعد آپ کے ہونہار صاحبزادے نواب میر

محبوب علی خاں آصف جاہ سادس ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۸۶۶ء کو تولد ہوئے آپ ابھی دو سال سات ماہ اور سات دن کے تھے کہ نواب افضل الدولہ ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء کو اچانک انتقال کر گئے۔

آصف جاہ سادس کے سوائے افضل الدولہ کو کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے حیدرآباد دکن کی سلطنت وہ اس شیر خواری کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ اس سلسلہ میں کونسل کا تقرر کیا گیا جس کے چیرمن نواب سر سالار جنگ مختار عام مقرر ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حیدرآباد دکن پر بیرونی جنگ وجدل کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چنانچہ ریاست کے عوام خوش حال تھے۔ شاہ دکن اس پر سکون ماحول میں حکمران رہے وہ خود ایک قادر الکلام شاعر اور علم وادب کے دل دادہ تھے۔ اس پر کشش ماحول کو دیکھ کر ہندوستان بھر سے شاعر اور اہل علم دکن میں آنے لگے۔ نواب میر محبوب علی خان نے شاعروں اور ادیبوں کی بھرپور سر پرستی کی۔ اس دور مین شاعری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ محبوب علی خان نے ان کی دل کھول کر ہمت افزائی کی۔ دہلی سے مرزا داغ سارے ہندوستان کی خاک چھان کر روٹی روزگار کے لئے حیدرآباد دکن کی طرف آئے اور یہاں ان کی قسمت ایسی چمکی کہ بادشاہِ وقت کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ اسی کے ساتھ حیدرآباد کے سینکڑوں شعرا نے داغ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور تلامذہ داغ میں شامل ہونے لگے۔ پیشِ نظر کتاب ''معاصرینِ داغ'' میں دکن کے ایک سو باسٹھ (۱۶۲) شعرا کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نواب میر محبوب علی خان آصف جاہِ سادس نہایت پر گو اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ آصف تخلص فرماتے تھے انہیں شاعری کا مذاق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کو شاعرانہ ماحول بھی ملا جب آپ سن شعور کو پہنچے اس وقت دکن میں شعر و شاعری کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اس وقت مرزا خاں داغ دہلوی کا شہرہ ہندوستان بھر میں تھا۔ شاہِ وقت نے انہیں اپنا استادِ سخن مقرر کر لیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد ہندوستان بھر میں صرف حیدرآباد دکن ہی اہلِ علم کی تنہا پناہ گاہ باقی رہ گئی تھی جو اپنی پچھلی روایتوں کے مطابق علم وفضل کی قدر کر رہی تھی۔ داغ کی آمد کے بعد شعر وادب کا بازار کافی گرم ہو گیا تھا۔ شالی ہند اور مختلف مقامات سے کئی نامور شعرا حیدرآباد دکن میں جمع ہو گئے جن کی طویل فہرست آئندہ

0.40KB/s 3:02 87%

صفحات میں پیش کی جائے گی۔ یہاں صرف اہم شعرا کے اسماء گرامی پیش کئے جاتے ہیں۔ بیرونی شعراء میں حضرت امیر مینائی، ظہیرالدین دہلوی، ظہیر — جلیل حسن جلیل مانکپوری جانشین امیر مینائی، سید کاظم حسن شیفتہ لکھنوی، محمد عبدالجلیل نعمانی رام پوری، حضرت ترک علی شاہ ترکی، سید معین الدین چشتی سالک دہلوی شاگرد غالب مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی، ضیا لکھنوی، محمد عبداللہ خان، صغیر لکھنوی، محمد باقر فکر کانپوری، عدیل کنتوری، قدر بلگرامی، شمس الحق میکش تھانوی ان کے علاوہ سینکڑوں شعرا حیدرآباد آئے اور اپنے وطن واپس ہوئے جن میں میرانیس لکھنوی بھی شامل ہیں۔ کتاب کے پہلے باب میں سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہد محبوبیہ حیدرآباد دکن کا سنہری دور تھا۔ دوسرے باب میں نواب آصف جاہ سادس کی شخصیت اور ان کے تمام اہم کارناموں سے مفصل بحث کی گئی ہے اور ان کی شعری تخلیقات کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں ''معاصرینِ داغ'' کے ایک سو باسٹھ (۱۶۲) شعرا کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے اس باب میں راقم الحروف نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ تمام اصناف سخن کے نمونے پیش کئے جائیں۔ آخر میں زیرِ نظر کتاب کے مواد کی فراہمی میں جن میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف اور ادبی علمی رسائل، گلدستوں اور مقالات سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی مکمل کتابیات پیش کی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب دراصل راقم کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ جو پروفیسر ثمینہ شوکت صاحبہ کی نگرانی میں رقم کیا گیا۔ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد سے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی گئی۔ میں محترمہ ثمینہ شوکت صاحبہ کا ممنون کرم ہوں۔ استاذ محترم پروفیسر محمد انور الدین صاحب شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس مقالہ کی ترتیب میں میری رہنمائی فرمائی۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے مفید مشوروں کا بھی میں شکر گزار ہوں۔ ہندو پاک کے ممتاز محقق پروفیسر محمد علی اثر صاحب نے نہ صرف اس کتاب پر اپنے تاثرات تحریر کرنے کی زحمت گوارا فرمائی بلکہ اپنے مفید مشوروں سے بھی میری رہنمائی کی۔ اس سے قبل سخن وران عہد محبوبیہ کے عنوان سے راقم نے اس کتاب کو شائع کیا جس کی مقبولیت اور اہمیت کے پیش نظر دوبارہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ اشاعت عمل میں آرہی ہے میں ایجوکیشنل پبلکشن کے ارباب مجاز کا ممنون ہوں۔

3

آخر میں میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی دعاؤں سے تحقیق کی دشوار گزار راہیں آسان ہوگئیں۔

اگست ۲۰۰۹

محمد عطاء اللہ خاں

پرنسپل اورینٹل اردو کالج۔ پی۔ جی اینڈ ریسرچ سنٹر

گلشن حبیب، حمایت نگر، حیدر آباد۔ ۲۹

☆☆

دکن کا سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر

دکنی زبان وادب کا آغاز اس وقت ہوا جب علاء الدین خلجی کی فوجیں پہلی بار جنوبی ہند پہنچیں یہ تیرھویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے دوسرا اہم واقعہ جس کی وجہ سے دکن میں اردو کے فروغ اور دکنی تہذیب وتمدن کو پروان چڑھنے کا موقع ملا وہ محمد تغلق کے کے دور حکومت ۱۳۲۵ء۔۱۳۱۵ء میں پیش آیا محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں اپنی سلطنت کے حدود کو وسیع کرنے کے لئے دہلی کے بجائے دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا اور حکم جاری کیا کہ دہلی کی ساری آبادی دولت آباد منتقل ہو جائے۔ بادشاہ وقت کے حکم کی تعمیل میں دہلی کے عوام جن میں فوجی، صوفی، تاجر، اہل ہنر، امیر غریب، امراء وشرفا بھی شامل تھے دولت آباد پہنچ گئے۔ چودھویں صدی عیسوی کے ربع دوم میں جب دہلی کے تغلق حکمران کمزور ہو گئے تو جنوبی ہند کو ایک بار پھر مستحکم ہونے کا موقع ملا یہاں تک کہ ۱۳۴۷ء میں علاء الدین حسن بہمنی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس طرح دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ بہمنی سلاطین نے ایک طرف اپنی سلطنت کے استحکام پر توجہ دی اور دکن کے عوام میں محبت اور اخوت کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی تو دوسری علوم وفنون اور شعر وادب کی سرپرستی میں بھی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس دور کے صوفیوں اور شاعروں میں حضرت خواجہ بندہ نواز، اشرف بیابانی نظامی بیدری، میراں جی شمس العشاق، لطفی مشتاق اور فیروز بیدری کے نام قابل ذکر ہیں۔

دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد اس کے کھنڈر پر پانچ خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان پانچ خود مختار حکومتوں میں عماد شاہی، برید شاہی، اور نظام شاہی یہ تینوں حکومتیں برائے نام تھیں۔ البتہ عادل شاہی اور قطب شاہی کا عروج تاریخ دکن کا زرین دور ہے۔ ان دو سلطنتوں سے علم وفضل کے چشمے پھوٹے۔ علم وعرفان کی پرزور اشاعت ہوئی۔

ان سلطنتوں کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کے عروج کے ساتھ فارسی ادب اور دکنی زبان کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

دکن کی تاریخ میں قطب شاہی عہد کو خاص خصوصیت حاصل ہے قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا یکے بعد دیگرے قطب شاہی سلطنت میں سات حکمران تقریباً دو سو سال حکمران رہے۔ قطب شاہی خاندان کے آخری حکمران سلطان ابوالحسن تانا شاہ کو ۱۰۹۹ھ م ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں شکست ہوئی قطب شاہی سلطنت کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر کے تانا شاہ کو دولت آباد کے قلعہ میں قید کر دیا گیا (۳) اس طرح گولکنڈہ مغلیہ سلطنت کی ریاست بن گئی اورنگ زیب کا ۱۸/ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں انتقال ہوا۔ دہلی کی مغلیہ سلطنت میں اب وہ گرفت باقی نہیں رہی تھی جو اورنگ زیب کے زمانے میں تھی۔ اس افراتفری کے عالم میں دہلی کی سلطنت پر یکے بعد دیگرے کئی حکمران آئے اور گئے آخر ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۲۰ء میں محمد شاہ رنگیلے تخت دہلی پر متمکن ہوئے۔ انہوں نے نواب نظام الملک آصف جاہ اول کو مالوہ کا صوبیدار مقرر کیا۔ آصف جاہ اول اس نظامِ حکومت سے خوش نہیں تھے۔ بالآخر دل برداشتہ ہو کر دکن کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا لیکن دارالحکومت دہلی لوٹ آئے۔ مالوہ پر عظیم اللہ خان کو نیا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ دہلی کی مغلیہ سلطنت نے ۱۱۳۶ھ م ۱۷۲۴ء میں مبارز خان کو دکن کا صوبیدار بنایا۔ آصف جاہ اول کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا چنانچہ وہ فوراً اورنگ آباد پہنچے۔ ۲۳/محرم ۱۱۳۷ھ م ۱۱/اکتوبر ۱۷۲۴ء کو عماد الملک مبارز خان اور آصف جاہ اول میں بمقام شکر کھیڑ ضلع برار سے تیس کوس پر زبردست جنگ ہوئی اس جنگ میں مبارز خان اور اس کے تیس جرنل اور دو فرزند قتل کر دئے گئے (۴)

تمام ریاست دکن آصف جاہ کے قبضہ میں آ گئی کوئی مزاحم ہونے والا نہیں رہا۔ نظام آصف جاہ اول نے اپنی صوبیداری ہی نہیں بلکہ اپنے صوبہ دکن کی عملداری بھی شروع کر دی سلطان دہلی محمد شاہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے آصف جاہ کے خطاب سے نوازا اور منصب نو ہزاری کی اجازت بھی دی کہ جب تک چاہیں دکن میں رہیں ساتھ ہی وکیل المطلق کا اعزاز بھی دیا (۵) آصف جاہ اول نے اس موقع پر بھی دہلی کی شاہی ملازمت

اور وفاداری سے انحراف نہیں کیا انہوں نے نہ تو شاہی اقتدار کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی بادشاہ کا لقب اختیار کیا نہ ہی اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور نہ ہی سکہ جاری کیا بلکہ دہلی کی شاہی حکومت سے وابستگی اور خاندانی ملازمت کا لحاظ رکھتے ہوئے صوبہ دکن کا نظم ونسق خود مختار فرمانروا کی طرح انجام دیتے رہے۔ نظام الملک آصف جاہ اول عملاً اس صوبہ دکن کے بااقتدار حکمران تھے۔ اور پایہ تخت اورنگ آباد تھا(۶)

آصف جاہ اول فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے پہلے شاکر اور بعد میں آصف تخلص اختیار کیا، بعض تذکروں میں ان کی اردو شاعری کے نمونے مل جاتے ہیں مثلاً

ادھر دیکھو تو کس ناز و ادا سے یاد آتا ہے
مسیحا کی سوئی امت کو ٹھوکر سے جگاتا ہے (۷)

آصف جاہ اول کے عہد کے اہم شعرا امین جنیدی، حیرت، عاقل، مطلع، فدوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آصف جاہ اول کے زمانے میں فارسی اور اردو شاعری نے کافی ترقی کی جب کہ نثری کارناموں کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ آصف جاہ اول کی شاہانہ سرپرستی نے شمالی ہند کے ادیب شاعر وعلماء مشائخ کو دکن آنے پر آمادہ کیا اور یہاں آکر وہ حسب حوصلہ ولیاقت انعام واکرام پانے لگے۔ اس کے علاوہ آصف جاہ اول کے دور میں مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ مدرسہ حیدرآباد کی بنیاد ڈالی گئی یہ مدرسہ مکہ مسجد میں قائم ہوا(۸)۔ آصف جاہ اول کے بعد ناصر جنگ شہید خاندان آصفیہ کے دوسرے جانشین تھے۔ ناصر جنگ کے عہد میں جن شعرا کا ذکر تاریخ کے حوالوں سے ملتا ہے ان میں مرزاداؤد اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی، حمید، نورالدین خان رنگین، جمال اللہ عشق، ملا باقر شہید، عارف الدین خان عاجز، عبدالولی عزلت، اور لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی قابل ذکر ہیں۔ ناصر جنگ شہید کی شہادت کے بعد صلابت جنگ مسند نشین ہوئے اور تقریباً گیارہ برس برسراقتدار رہے اور ۲۰ ربیع الاول۔۱۱۷۷ھ کو انتقال کر گئے۔

میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی جو آصف جاہ اول کے چوتھے فرزند تھے۔ مملکت آصفیہ کے جانشین ہوئے۔ یہ دکن میں ۴۲ سال حکمران رہے(۹) اس عرصے میں آپ کو سینکڑوں مسائل طے کرنے تھے انہوں نے اپنی صلاحیت سے انہیں سلجھایا یہاں مزید تفصیلات

کی گنجائش نہیں ہے ان کا انتقال ۱۷؍ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ کو ہوا مکہ مسجد کے صحن میں تدفین عمل میں آئی۔ آصف جاہ ثانی کے بعد آپ کے فرزند سکندر جاہ ثالث ۲۲؍ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ کو مسند نشین ہوئے (۳) آصف جاہ ثالث کے وزیر اعظم ارسطو جاہ تھے ان کے عہد میں بہت سے کارنامے دکن کی مملکت میں ترقی پذیر ہوئے۔ سکندر جاہ کے عہد میں اردو ادب اور فنون لطیفہ کے کئی قدرداں موجود تھے۔ جن میں قابل ذکر چندولال شاداں ہیں جنہوں نے اپنا دربار شعراء سے سجائے رکھا تھا۔ شیخ محمد حفیظ چندولال کے دربار کے ملک الشعرا تھے (۱۱) ان کے علاوہ اس عہد کے اہم شعرا میں قاضی محمد علی صابر، شیر محمد خان ایمان، مولوی تراب، میر عنایت علی، حافظ تاج الدین مشتاق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سکندر جاہ کے انتقال کے بعد آصف جاہ رابع ۱۹؍ذیعقدہ ۱۲۴۴ھ کو مسند نشین ہوئے۔ چندولال نے آپ کے نام سے شہر میں منادی کروادی آپ کے تخت نشین ہونے پر نواب منیر الملک امیر الامرا مدار المہام ہوئے اور راجہ چندولال کو نائب مدار المہام مقرر کیا گیا (۱۲)

آصف جاہ رابع کے عہد میں دکن کی سیاسی حالت بہت خراب تھی حکومت کا خزانہ خالی تھا انگریز سرکار اور مقامی ساہوکاروں کا قرضہ تقریباً ڈھائی کروڑ روپے تھا (۱۳) آصف جاہ رابع معاشی پریشانیوں سے حکومت کرتے ہوئے ۲۲؍رمضان ۱۲۷۳ھ کو انتقال کر گئے۔ آپ کی جگہ آصف خامس جاہ جانشین ہوئے سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں آتے ہی آپ انتظامات سلطنت بڑی خوبی سے انجام دینے لگے۔ معاشی استحکام کے نئے نئے اصول بنائے گئے حکومت کو دیوالہ پن سے آزاد کروایا۔ افضل الدولہ کے مدار المہام سالار جنگ اول شعر و ادب کے دلدادہ تھے ان کے عہد میں اردو شعراء کا ایک خاص طبقہ دکن میں وجود میں آیا جن میں قابل ذکر مرزا عبداللہ بیگ ہوش، میر احمد علی عصر، میر شمس الدین فیض، سید احسن علی احسن، سدانند جوگی، بہاری لال رمز، محمد حفیظ الدین پاس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افضل الدولہ ۱۲ سال حکمران رہ کر نوجوانی میں ۱۳؍ذیعقدہ ۱۲۸۵ھ بروز (جمعہ انتقال فرما گئے ان کے جانشین ڈھائی سال کے فرزند نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس کو اپنے والد کی زیارت کے دوسرے دن مسند نشین کیا گیا جن کے تفصیلات آگے اوراق میں مفصل آئے گی۔

☆ حواشی

(۱) رحم علی الہاشمی اسٹارڈ ائرکٹری، الہ اباد ۱۳۲۷ھ، صفحہ۔۱۰۷

(۲) حامد حسین قادری، تاریخ ادب اردو، حیدر آباد، صفحہ۔۲۴

(۳) مانک راو وٹھل راؤ، بستان آصفیہ جلد اول، حیدر آباد، ۱۳۳۳ھ، صفحہ۔ ۴۱

(۴) سید ابوالا مودودی دکن کی سیاسی تاریخ حیدر آباد، ۱۹۴۴ء، صفحہ۔۱۷۸

(۵) ملک حسن اختر ڈاکٹر، ابہام گوئی کی تحریک لاہور پاکستان ۱۹۸۶ء، صفحہ۔۲۰

(۶) نصر اللہ خان، تاریخ عہد حالیہ حیدر آباد، ۱۹۴۴ء، صفحہ۔۲۹

(۷) نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ۔۳۶۹

(۸) ڈاکٹر زور اردو شہ پارے، حیدر آباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ۔۳۳۴

(۹) میر محمد علی آصف جاہ ثانی حیدر آباد۔۱۹۲۸ء، صفحہ۔۴۰

(۱۰) شیخ یعقوب علی عرفانی حیات عثمان جلد اول، حیدر آباد ۱۹۳۶ء، صفحہ۔۹۸

(۱۱) پروفیسر ثمینہ شوکت چندولال شاداں حیات اور کارنامے، حیدر آباد ۱۹۸۳ء، صفحہ۔۴۳۶

(۱۲) ....ایضاً............ایضاً............ایضاً

(۱۳) عبدالحئی مملکت آصفیہ پاکستان، ۱۹۷۸ء، صفحہ۔۱۴۹

☆☆

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

تفصیلی حالاتِ زندگی مع نمونۂ کلام

☆☆

3

خاندان آصفیہ کا شجرہ

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کا سلسلۂ نسب ددھیال کی طرف سے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے اور ننھیال سے چونکہ ماں سیدزادی تھیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ سلاطین آصفیہ کے خاندان میں علماء وفضلا کا سلسلہ دائمی چلا آیا ہے۔ آصفجاہ اول کے پردادا سمرقند کے قاضی تھے خواجہ عابد المعروف عابد قلیچ خاں سمرقند سے ہجرت کر کے عہد شاہجہاں میں ہندوستان تشریف لائے۔ آپ کی قابلیت اور علم وفن کی قدردانی وحوصلہ افزائی کر کے شاہجہاں نے اپنے دربار سے وابستہ کرلیا اور اک معزز عہدہ پر فائز کیا۔ نیز پانچ ہزاری منصب سے سرفراز فرمایا۔ آپ ایک نیک سیرت دیانت دار اور وفادار بزرگ تھے۔ شاہجہاں پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر ہوا۔ محمد فاضل نے سیرت شاہانہ میں خاندانِ آصف جاہ سادس کا جو تفصیلی شجرہ درج کیا ہے اسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔(۱)

(۱) حضرت امیر المومنین خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ

(۲) حضرت محمد بن ابوبکر

(۳) ابوالقاسم بن محمد

(۴) عبدالرحمٰن بن ابوبکر

(۵) عبداللہ النضر بن عبدالرحمٰن

(۶) محمد قاسم بن عبداللہ النضر

(۷) نصیرالدین النضر بن محمد قاسم

(۸) قاسم (علی رومی) بن نصیرالدین

(۹) حسین بن قاسم

(۱۰) سعید بن حسین
(۱۱) محمد عبدالرزاق بن عبداللہ
(۱۲) محمد عبدالرزاق بن عبداللہ
(۱۳) عبداللہ بقدائی بن عبدالرزاق
(۱۴) محمد الکبریٰ السہر وردی بن عبداللہ
(۱۵) شیخ الشیخ شہاب الدین سہروردی
(۱۶) ابوالحفعی محمد
(۱۷) قطب الاقطاب زین العابدین
(۱۸) حضرت شیخ علاء الدین
(۱۹) شیخ تاج الدین
(۲۰) شیخ فتح اللہ
(۲۱) شیخ نجیب اللہ
(۲۲) شیخ فتح اللہ ثانی
(۲۳) شیخ جاوید ملقب بہ سرمست
(۲۴) شیخ فتح اللہ شیخ ثانی
(۲۵) شیخ جاوید شاہ ثانی
(۲۶) شیخ محمد درویش
(۲۷) شیخ محمد مومن
(۲۸) شیخ محمد عالم شیخ
(۲۹) خواجہ عزیزاں سمرقندی
(۳۰) شیخ خواجہ امیر اسمٰعیل ملک العلما
(۳۱) الحاج خواجہ میر عابد قلیچ خان (بعہد شاہجہاں)
(۳۲) غازی الدین خاں فیروز جنگ
(۳۳) میر قمرالدین کاں آصف جاہ اول

(۳۴) میر نظام علیخاں آصفجاہ ثانی

(۳۵) سکندر جاہ آصفجاہ ثالث

(۳۶) ناصر الدولہ آصفجاہ رابع

(۳۷) افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(۳۸) میر محبوب علیخاں آصفجاہ سادس (موضوع تحقیق)

(۳۹) میر عثمان علیخاں آصف سابع (اختتام حکومت آصفیہ (۲)

☆ پیدائش آصف جاہ سادس

مملکتِ آصفیہ حیدر آباد دکن کے نظام پنجم آصف جاہ خامس نواب افضل الدولہ کے فرزند میر محبوب علی خاں بروز جمعہ ۵/ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۷/اگست، مسرت محل (پرانی حویلی) حیدر آباد میں واحد النسا بیگم صاحبہ کے بطن سے پیدا ہوئے (۳)

تاریخ کے حوالوں سے آپ کی ولادت ۵/ربیع الثانی کی شب ہوئی مگر صحیح وقت کا پتہ تحقیق طلب ہے۔ میر شمس الدین فیض اپنے وقت کے جید عالم اور شاعر تھے آپ نے فن ابجد کے لحاظ سے تاریخ ''چراغ دکھن'' نکالی ہے جس سے سن ۱۲۸۳ھ بر آمد ہوتا ہے۔

آپ کی ولادت کے موقع پر مختلف شعرائے دکن نے قطعہ تاریخ کہے ہیں ان میں سے ایک قطعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

در محل افضل الدولہ شہِ آصف شکوہ
شد تولد نور عین از فضل بے پایانِ حق
ملہمِ لاغیب تاریخِ ولادت گفت فیض
گشت پیدا آصفِ سادس زہے احسانِ حق (۴)

۱۲۸۳ ہجری

شہزادہ کی ولادت چونکہ ربیع الثانی کے مہینہ میں ہوئی تھی جو محبوب سبحانی سید عبد القادر جیلانی کی ولادت کا مہینہ ہے اسی مناسبت سے آپ کا نام میر محبوب علی خاں رکھا گیا (۵)

میر محبوب علی خاں کی ولادت کے موقع پر سارے شہر میں سینکڑوں اشرفیاں اور

ہزاروں روپے خیرات کیے گئے۔تمام شہر میں جشن منایا گیا۔نواب افضل الدولہ کو میر محبوب علی خاں سے پہلے تین لڑکے اقبال علی خاں (۲۳رشوال ۱۲۷۴ھ)،علی رضا خاں ۳رشوال ۱۲۷۶ھ)اور حفاظت علی خاں (۱۲رربیع الثانی ۱۲۸۷ھ) تولد ہوئے تھے(۶) لیکن تینوں فرزند بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔افضل الدولہ کو سلطنت آصفیہ کے وارث کی سخت ضرورت تھی۔اس لیے افضل الدولہ ایک روز حضرت شاہ ظہیر الدین المعروف خواجہ میاں مجذوب قدس سرہ العزیز کی خدمت میں پہنچے اور اولاد نرینہ کے لئے طالب دعا ہوئے۔حضرت نے ولادت فرزند کی خوشخبری سنائی(۷)۔

اس واقعہ کے ٹھیک ۹ ماہ بعد واحد النسا بیگم کے بطن سے میر محبوب علی خاں تولد ہوئے۔غرض میر محبوب علی خاں کی ولادت بادشاہ اور رعایا دونوں کے لئے باعثِ مسرت ثابت ہوئی۔افضل الدولہ کے حضور میں تمام امرائے عظام نے نذرانے پیش کیے۔شعرا نے قصائد و قطعات لکھ کر خدمتِ اقدس میں نذر کیا اور صلہ میں انعام و اکرام سے نوازے گئے۔

ولادت کی رسم و رواج کی تقریبات چھٹی، چھلہ وغیرہ نہایت شان و احتشام سے منائی گئیں۔حسب رواج سلاطینِ مشرقی انائیں، دایائیں اور آغائیں وغیرہ نو عمر شیر خوار شہزادے کی پرورش پر مامور کی گئیں۔ابھی آپ دو سال سات ماہ دس یوم کے تھے کہ والد بزرگوار افضل الدولہ ۱۳رذیعقدہ ۱۲۸۵ھ م ۲۶رفروری ۱۸۶۹۔بوقتِ شام بروز جمعہ انتقال کر گئے۔آصفیہ جاہ سادس کے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا۔جیسے ہی مختار الملک سر سالار جنگ صدر المہام کو اطلاع ہوئی،قدیم شہر کے تمام دروازے بند کر دیے گئے اور تمام امرا نے بہ اتفاق رائے آصف جاہ سادس کو جانشین بنا دیا(۸)

☆ تخت نشینی

افضل الدولہ کی زیارت ۲۸رفروری ۱۸۲۹ء کو ہوئی اور اسی شام میں رسمِ تخت نشینی ادا کر دی گئی۔سارے شہر میں منادی کر دی گئی کہ نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس وارثِ سلطنت آصفیہ تخت نشین ہوں گے۔جیسے ہی یہ اطلاع ریزیڈنٹ کو ہوئی اس نے دھمکی دی کہ ہم مسند نشینی کے دربار میں نہیں آئیں گے کیونکہ مسند نشینی کے سلسلے میں ہم کو لاعلم

رکھا گیا کوئی مشاورت طلب نہیں کی گئی۔اس موقع پر سالار جنگ اور شمس الامرا نے جرات سے کام لیتے ہوئے جواب دیا کہ آئین آصفی کے مطابق ولی عہد کو جانشین بنایا گیا ہے اور ان کی فرمانروائی کو رعایا تسلیم کرتی ہے۔انگریزی حکومت سے استمزاج یا استفسار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔بالآخر ریزیڈنٹ اور ان کے ساتھی اس شرط پر مسند نشینی کے دربار میں شریک ہونے پر رضامند ہوگئے کہ ان کے اسٹاف اور فوجی افسروں کے لئے دربار میں کرسیوں کا انتظام کیا جائے۔انگریزوں کے لئے دربارِ آصفی میں جو طریقہ رائج تھا اس کے مطابق انگریز فرش پر بیٹھا کرتے تھے۔(۹) ایک طرف حیدرآباد دکن کی اندرونی سازش، دوسری طرف انگریزی سرکار کی سیاسی مصلحت۔اس کے نتیجہ میں انگریز چاہتے تھے کہ مرحوم افضل الدولہ کے بھائی روشن الدولہ جانشین بنیں(۱۰) سر سالار جنگ مع چند امرا کے دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔شہزادہ والا شان آغوشِ دایہ میں رونق افروز ہوئے۔شاہی تخت پر بٹھائے گئے ریزیڈنٹ نے کہا خدا مبارک کرے۔پھر تمام یوروپین افسران اور اعیانِ دولت آصفیہ کے افسران فوج وغیرہ نے بھی مبارک بادی اور نذرانے پیش کئے۔

☆ ریجنسی کا قیام

نواب میر محبوب علی خاں بہادر کو دو سال سات ماہ دس یوم کی عمر میں مسند نشین کر کے عوام پر یہ ظاہر کیا گیا کہ میر محبوب علی خاں سلطنت آصفیہ کے مالک ہیں لیکن صغیر سنی کی وجہ سے ملک کو ایک ذمہ دار حالت میں رکھنا بھی ضروری تھا۔اس لیے نواب شمس الامرہ عمدۃ الملک کو ایجنٹ اور مختار الملک سالار جنگ کو خود مختار صدر المہام بنایا گیا۔اس تقرر کے ایک سال بعد شمس الامرا کا انتقال ہو گیا اب صرف سالار جنگ خود مختار اور ذمہ دار تسلیم کر لیے گئے۔۲۶ ر رجب ۱۲۸۶ھ کو جریدہ اعلامیہ جاری ہوا اور اسی سال سے چار صدر المہام نواب مدار المہام کے ماتحت مقرر ہوئے۔

☆ تسمیہ خوانی

۱۱ ر شعبان ۱۲۸۷ھ م ۵ ر نومبر ۱۸۷۰ء روز شنبہ کو میر محبوب علی خاں کی تسمیہ خوانی نہایت شاندار طریقہ پر انجام پائی۔۶ ماہ قبل سے غریبوں میں کپڑے تقسیم کیے جانے لگے۔

Maasreen-e-Dagh Deh Search

تسمیہ خوانی کی تقریب مہندی ڈیوڑھی (اندروں پرانی حویلی) میں انجام پائی۔ حضرت نورالدین شاہ قادری نے سورہ اقراء کی آیتیں پڑھائیں جس کے بعد نہایت جوش و مسرت سے مبارک باد کی صدائیں بلند ہوئیں۔ رات میں آتشبازی کا اہتمام کیا گیا۔ سرکاری دفاتر کو دوروز عام تعطیل دیدی گئی۔

☆ تعلیم وتربیت

نواب میر محبوب علی خاں کی تعلیم وتربیت کے لئے حکومت ہند نے خاص ہدایات جاری کیں ایک مراسلہ ۱۸/ مارچ ۱۸۶۹ء میں ان کو ہر قسم کی تعلیم دینے کی ضرورت پر زور دیا (۱۱)۔

چنانچہ مختار الملک سرسالار جنگ نے اپنے نوخیز آقا والی سلطنت آصفیہ کی تعلیم و تربیت کا ایسا خاص انتظام کیا کہ عربی وفارسی کی تعلیم کے لئے مولوی زماں خاں صاحب جیسے جید عالم کا انتخاب کیا۔ ان کے بعد ان کے بھائی مولوی محمد مسیح خاں شاہجہاں پوری مقرر ہوئے ان کے ماتحت کئی عالم فاضل اور خوشنویس مقرر تھے۔ علوم متداولہ کی تعلیم وتدریس کا بھی انتظام کیا گیا۔ انگریزی تعلیم کے لئے کپتان جارج کلارک، کپتان کلارڈی کلارک اور کروو ہن کی خدمات حاصل کی گئی۔ (۱۲) آصف جاہ سادس کو مختلف زبانوں پر بھی عبور حاصل ہوا جیسے عربی، فارسی، اردو، انگریزی، کنڑی، تلگو اور مراٹھی کی علمی قابلیت ساتھ ساتھ فن سپہ گری، شہسواری اور دوسرے علوم وفنون میں بھی آپ نے مہارت حاصل کی۔ نشانہ بازی میں آپ اپنے معاصرین میں یکتا تھے، نیزہ بازی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ آپ کی ہم مکتبی کے لئے امرا واعزہ کے نیک طبیعت اور خوش مزاج لڑکے منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے آٹھ امیر بھی منتخب کئے گئے تاکہ دو دو امیر باری باری سے حاضری دیا کریں۔ اس شاہانہ تعلیم کا مجموعی طور سے یہ اثر ہوا کہ آصفجاہ سادس میں لاثانی اوصاف مجتمع ہوگئے۔

آصفجاہ سادس کو نظر اختصاص سے دیکھا جائے تو وہ دنیا کے ایک ایسے منفرد شہزادے تھے جن کو گہوارہ میں بادشاہت نصیب ہوئی۔

Maasreen-e-Dagh Deh
☆ جلوس سواری پہلی مرتبہ

جب آپ کی عمر (۸) سال کی تھی اور ابھی آپ مکتب میں زیر تعلیم تھے ان دنوں رعایا کی آرزو تھی کہ شہزادہ کا دیدار کریں۔ ۱۲۹۱ھ میں آپ کو ایک شاندار ہاتھی پر سوار کیا گیا اور آپ محل سے باہر آئے۔ اس وقت نواب مختار الملک سر سالار جنگ اور نواب عمدۃ الملک بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ تمام فوج جلوس میں شریک تھی۔ سارا شہر سڑک کے دونوں جانب آپ کا دیدار کر رہا تھا۔ ہر شخص آپ کی درازی عمر کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ ہزاروں اشرفیاں خیرات کرتے ہوئے شاہ کی سواری پرانی حویلی سے آصف نگر تک گئی اور واپسی تک شام ہوگئی (۱۳) آپ کی تعلیم و تربیت کے ساتھ حفظان صحت کے لئے خاص خاص حکما اور ڈاکٹر مقرر تھے جن میں قابلِ ذکر حکیم وزیر علی خاں جو اپنے وقت کے مشہور حکیم تھے صحت کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

سر سالار جنگ کی خواہش تھی کہ جلد از جلد نوعمر بادشاہ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیں لیکن یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوئی۔ ۸ر فروری ۱۸۸۳ء کو ساڑھے سات بجے شام بروز پنجشنبہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر (۵۶) سال تھی۔ اس لائق مدبر کے گزر جانے سے حیدرآباد دکن آصفجاہ سادس کے ایک وفادار وزیر سے محروم ہوگیا۔ سالار جنگ کے انتقال پر ریزیڈنٹ نے نہایت افسوس کا اظہار کیا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند میر لائق علی خاں کو انتظامی امور پر مامور کیا گیا اور راجہ نریندر پرشاد پیشکار مقرر ہوئے۔

☆ بیرونی سفر (پہلی مرتبہ)

میر محبوب علی خاں نے ۱۸۷۷ء میں پہلا سفر دہلی کا کیا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف بارہ برس کی تھی۔ ان دنوں دہلی میں انگلستان کی ملکہ کا دربار منعقد ہوا تھا۔ اس سفر میں آپ کے اعیان سلطنت نواب مختار الملک، سر سالار جنگ آپ کے ہمرکاب تھے۔

☆ جشن مسند نشینی

آصف جاہ سادس ۷ر ربیع الاول ۱۳۰۱ھ مطابق ۵ر فروری ۱۸۸۳ء کو کامل اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہوگئے۔ آپ کے جشن تاجپوشی میں وائسرائے ہند لارڈ رپن کلکتہ سے

حیدرآباد تشریف لائے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک انگریز وائسرائے جشن تاجپوشی میں مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوا۔ اس موقع پر وائسرائے ہند نے تقریر کی جس میں آپ کی ذات سے بہت سی توقعات وابستہ کیں (۱۴)

شعرائے حیدرآباد دکن نے اس مسند نشینی کے موقع پر متعدد قطعات تہنیت نظم کیے ذیل میں ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے۔

قطعہ

میر محبوب علی شاہ دکن والا خطاب
لے لیا ذمہ میں اپنے سلطنت کا کاروبار
خوب ہے سال جلوس حکمرانی اے عزیز
حاصل شہ ہوگیا ہے آج ملکی اقتدار

۱۳۰۱ ہجری

مسند نشین ہوتے ہی میر محبوب علی خاں نے ایک فرمان جاری کیا اس میں سرکاری طور پر اپنی مسند نشینی کا اعلان کیا اور اپنی حکومت کا لائحۂ عمل پیش کیا۔ فرمان کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''میرے لئے کوئی خوشی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی کہ میں اپنی رعایا کو آسودہ حال، پرامن صاحب دولت، غالب معلم پر افادہ انسان ریاست دیکھوں اور اسی کے ساتھ میری دلی خواہش ہے کہ مدارالمہام اور دوسرے امرائے دولت کو جو میری حفاظت پر تکیہ کئے ہوئے ہیں ہمیشہ نیکی زیادہ کرنے اور برائی کے نہ کرنے میں سرگرم رہیں اور لوگوں کے حقوق کی بلا رو رعایت حفاظت کریں۔'' (۱۵)

مسند نشینی کے جشن میں آپ کو خطابات والقاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ میر محبوب علی خاں اپنے خاندانی خطابات فتح جنگ، نظام الدولہ، مظفر الملک اور آصف جاہ بہادر کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ نیز اعلیٰ حضرت حضور پرنور سرکار عالی، بندگان عالی، سرکار نظام،

حضور نظام ان کے لئے القاب مقرر ہوئے (۱۶)

مسند نشینی کے دن ہی میر محبوب علی خاں نے میر لائق علی خاں سالار جنگ دوم (مختار الملک عماد السلطنت) کو مدار المہامی کے عہدے پر سرفراز فرمایا۔ اس کے علاوہ ایک ''کونسل آف اسٹیٹ'' قائم کی جس کی صدارت خود میر محبوب علی خاں کرتے تھے۔ اس مجلس میں بشیر الدولہ خورشید خاں، وقار الامرا اور نریندر پرشاد، آسماں جاہ ارا کین مقرر ہوئے (۱۷)

میر محبوب علی خاں نے اپنی مسند نشینی کے بعد بڑی پہلی تبدیلی کی۔ نوجوان سالار جنگ دوم اور میر محبوب علی خاں دونوں ہم مکتب تھے لیکن جب عنان سلطنت ہاتھ میں آئی تو نواب سے ویسے تعلقات نہیں رہے جیسے کہ امید تھی۔ اس کی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ دونوں اختلافات پیدا ہوگئے۔ تین سال کے اندر ہی آصفجاہ نے سر سالار جنگ دوم کو مدار المہامی سے علیحدہ کردیا اور خود ایک معتمد اور ایک مشیر کے ذریعہ دو سال تک تمام انتظامات سلطنت خود انجام دیتے رہے (۱۸) اس کے بعد نواب آسماں جاہ بہادر نے پانچ سال تک مدار المہامی کے فرائض انجام دیے۔ آسماں جاہ کے بعد ان کے چچازاد بھائی وقار الملک مدار المہامی پر متعین ہوئے۔ آپ نے اک سال تک خدمت انجام دینے کے بعد رخصت حاصل کرلی۔ ان کی جگہ مہاراجہ کشن پرشاد شاد مدار المہام مقرر ہوئے۔ آپ کا تفصیلی ذکر معاصرین داغ میں کیا جائے گا۔

میر محبوب علی خاں انگریزوں کے وفادار اور سچے دوست تھے۔ آپ نے ایک تقریر میں سرکار انگریز کو مخاطب کرکے فرمایا۔

میں ہر وقت روپیہ، فوج اور تلوار سے مدد دینے کے لئے مستعد ہوں (۱۹)

آپ کے دور حکمرانی میں اندرونی اور بیرونی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا سوائے رود موسیٰ کی طغیانی کے جس سے حیدرآباد کو نا قابل تلافی، مالی اور عملی نقصانِ عظیم پہنچا۔ اس کے علاوہ علاقہ برار کی واپسی کے لئے سالار جنگ آخر دم تک جدوجہد کرتے رہے لیکن اس وقت یہ مسئلہ طے نہ ہوسکا۔ ۱۹۰۲ء میں انگریز حکومت نے صوبہ برار کو ہمیشہ کے لئے ۲۵ لاکھ روپے سالانہ ٹھیکہ پر لے لیا۔ اکثر چھاؤنیاں توڑ دی گئیں اور افواج کنٹونمنٹ میں تخفیف کردی گئی (۲۰)

☆ مملکت آصفیہ کے دورے

نواب میر محبوب علی خاں کو رعایا کا حال معلوم کرنے کی ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکت کے مختلف ضلعوں کا دورہ کرنا شروع کیا تا کہ بچشم خود مشاہدہ کر سکیں چنانچہ تخت نشین ہوتے ہی متعدد سفر اور دورے کئے۔

پہلا سفر: مسند نشینی کے سلسلے میں آپ نے ۱۸۸۳ء کو پہلا سفر کلکتہ کا بغرض ملاقات وائسرائے ہند کیا۔

دوسرا سفر: ۱۸۸۵ء میں بطور سیر و تفریح نیلگری گئے۔ وہاں ہزار ہا روپے مفلسوں اور معذوروں میں تقسیم کیے۔

تیسرا سفر: ۱۸۸۶ء میں مدراس کا سفر کیا جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تہنیت نامے پیش کئے۔

چوتھا سفر: میر محبوب علی خاں نے ریاست کا پہلا دورہ ۱۸۸۳ء میں سولہ سال کی عمر میں کیا۔ گلبرگہ شریف میں حضرت بندہ نواز کے روضہ پر حاضری دی اور نگ آباد کے مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا۔

پانچواں سفر: ۱۸۸۴ء میں لائق الدولہ کے ساتھ تعلقہ ابراہیم پٹن کا دورہ کیا۔ وہاں رعایا سے ملاقات کی اور ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ شیر کا شکار بھی کیا۔

چھٹواں سفر: اسی سال یعنی ۱۸۸۲ء میں تعلقہ میلاورم اور سیٹرم کا دورہ کیا یہاں بھی رعایا کی دادرسی کی اور ہر حصہ کے حالات سے آگاہی حاصل کی یہاں اعلیٰ حضرت نے شیر کا شکار بھی کیا (۲۱)

ہر سفر اور ہر دورہ میں میر محبوب علی خاں گویا خیرات کرنے کا ایک بہانہ ڈھونڈ تے تھے اور اس طرح وہ غریب رعایا کی ہر طرح مدد کرنا چاہتے تھے۔

☆ ترقیاتی سرگرمیاں

نواب میر محبوب علی خاں نے اپنی مملکت میں بے پناہ ترقیات سرگرمیاں انجام

3

دیں۔ ملکی و مالی انتظام کیے۔ عدالت کوتوالی، اہل قلم و اہل ہنر کی ہر علاقہ میں اصلاح ہوئی۔ دفتر بلدیہ کا قیام عمل میں آیا۔ راستوں پر روشنی اور آبپاشی کا انتظام کیا۔ شفاخانے قائم کیے گئے اور تعلقات کے انتظام کو بہتر بنایا گیا۔ تار کا محکمہ قائم ہوا۔ پہلی مرتبہ ٹپہ اور اس کے چھوٹے شعبے قائم کیے گئے۔

آپ کے عہد میں ریلوے لائن ڈالی گئی جس سے رعایا کو حمل ونقل میں مدد ملی اور تجارت میں ترقی ہونے لگی (۲۲) ملک کی آمدنی کے ذرائع میں ترقی ہوئی۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد اور حیدرآباد میں روئی اور ریشم کی صنعت قائم کی گئی۔ خوردنی تیل اور آٹے کی گرنیوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ صفائی اور حفظان صحت کا محکمہ قائم ہوا۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں دواخانے کھولے گئے (۲۳) اس کے علاوہ عدالتیں قائم ہوئیں۔ قانون کا رواج ہوا اس سے ملک کے ہر حصے میں امن وامان قائم ہوا۔ خاص کہ شہر حیدرآباد میں جو خون خرابہ اکثر ہوتا رہتا تھا اس کی روک تھام ہونے لگی۔ عدالت اور پولیس کے محکموں کے قیام سے تشدد کی روک تھام کی گئی۔ الغرض ترقیاتی سرگرمیوں کی تفصیلات کے لئے ایک علیحدہ باب درکار ہے۔

☆ تعمیرات اور ترقی

میر محبوب علی خاں کے عہد میں تعمیرات کی سرگرمیاں بھی نقطۂ عروج پر تھیں۔ بنجر، غیر کارآمد زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا گیا۔ بہت سے مقامات کو باغات میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ متعدد محلات تعمیر کروائے گئے جیسے عابد شاپ، کنگ کوٹھی، باغ عدن، باغ عامہ، ایوان سیف آباد، سرور نگر محل، وکٹوریہ میموریل اسکول، چینی محل، سردار ولا، ڈاکٹر لارڈ کا بنگلہ، میجر گاف کا بنگلہ، فلک نما، سنٹرل جیل چنچل گوڑہ محل لنگم پلی، کمان حسینی عالم، محبوب گنج، زنانہ دواخانہ وغیرہ (۲۴)

☆ اردو سرکاری زبان

میر محبوب علی خاں کے زمانے کا عظیم الشان کارنامہ انقلاب زبان ہے۔ ریاست کی دفتری زبان اور عدالتی زبان فارسی تھی۔ تمام محکمہ جات میں سرکاری مراسلت فارسی میں

ہوتی تھی۔اس کے ساتھ بہت کم مرہٹی اور تلگو کا چلن دیہاتوں میں تھا۔اس لئے ان دفتری مشکلات پر غور کیا گیا جو حسب ذیل ہیں۔

اکثر آفیسروں میں اس قدر قابلیت نہیں ہوتی تھی کہ وہ مرہٹی اور تلگو زبان میں بات چیت کرسکیں اس لئے وہ اپنے ماتحت اہلکاروں کے کام کی تنقیح نہیں کر سکتے تھے جن کے دفاتر کی زبان اردو نہیں تھی اس کا اثر مقدمات پر پڑتا تھا اور اہلکاروں کو معاملات سے واقفیت حاصل کرنے میں دشواری کا پیش آتی تھی (۲۵)

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ماتحت اہلکار جو تجاویز ان زبانوں میں لکھ کر لاتا، افسر اس پر دستخط کر دیتے تھے ان کو غور وخوص کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔اس کے علاوہ تعلقہ داران اضلاع کے پاس کام اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ ان کو اس قدر مہلت ملتی تھی کہ وہ دوسری زبانوں کے کاغذات پر لفظاً لفظاً غور کر کے دستخط کریں۔

جو احکام ان زبانوں میں تحصیلداروں کے نام لکھے جاتے تھے، اہلکاروں کی کم علمی کے سبب ان کی تحریریں مکتوب الیہ کے درجہ کے شان کے خلاف ہوتی تھیں جن سے شکایت کی صورت پیدا ہوتی تھی۔حالانکہ یہی احکام جو اردو میں لکھے جاتے تھے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔

فرمان روا آصف جاہ اور دکن کے امراو شرفا اور اکثر عہدیداروں کی مادری زبان اردو تھی۔ان کو دوسری زبانوں کے سیکھنے میں دقتیں پیش آتی تھیں۔باوجود کوشش کے دوسری زبانوں میں جواب لکھنا ممکن نہ تھا۔

اس کے علاوہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو لوگ مرہٹی جانتے تھے ان کا تقرر تلنگانہ میں ہو جاتا تھا یا اس کے برعکس یعنی تلنگی جاننے والے ملازمین کا تبادلہ مرہٹی علاقہ میں ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے زبان کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔لہٰذا یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ مختلف مقامات کے دفاتر مختلف زبانوں میں کام کریں (۲۶)

اس تعلق سے نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف ''دکن میں اردو'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ۱۲۸۸ھ میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور صرف اتنی اجازت دی گئی تھی کہ نظامت اور عدالت کی رائے ہو تو وہ گواہوں کے بیانات اردو میں قلمبند کرنے کی اجازت دیں۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ۱۲۸۳ھ میں عدالتوں کے ساتھ ساتھ دفاتر مال اور بندوبست میں بھی اردو کا چلن ہونے لگا۔لیکن فارسی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

جب یہ محسوس کیا گیا کہ فارسی اور اردو مخلوط ہوتی جا رہی ہے۔کوئی دفتر فارسی میں مراسلت کرتا تھا اور کوئی اردو میں۔کسی ناظم عدالت کا فیصلہ اردو میں ہوتا تھا تو کسی کا فارسی اور اردو سے مخلوط۔اس دو عملی سے دفتری مشکلات ہی نہیں بلکہ حصول انصاف اور معاملات کے تصفیہ میں سیانت حقوق کا سوال خطرے میں پڑ رہا تھا۔

ان تمام مشکلات کے پیش نظر میر محبوب علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے فوری بعد ایک خصوصی جریدہ ۲۳ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ کو جاری کیا جس کے ذریعہ مملکت آصفیہ کی سرکاری زبان کو بجائے فارسی کے اردو قرار دیا۔(۲۷) اس کے بعد تمام دفاتر مکمل طور پر اردو میں منتقل ہو گئے۔

☆ ملکی اصلاحات

آصفجاہ سادس کے عہد میں ملکی اصلاحات حکومت برطانیہ ہند کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملکی نظم و نسق میں بنیادی تبدیلیاں لائی گئیں۔بڑے پیمانے پر ملکی اصلاحات نافذ ہوئیں۔قدیم محکمہ جات میں نئی روح پھونکی گئی۔ نئے نئے محکمے قائم کئے گئے۔البتہ ان تبدیلیوں کی رفتار ابتدا میں سست تھی۔اس عہد کی ملکی ترقی کے تعلق سے نجم الغنی مولف تاریخ حیدرآباد رقمطراز ہیں:

> ''مہمات ریاست اور حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں نواب میر محبوب علی خاں کے عہد میں مناسب اصلاحات نہ ہوئی ہوں۔ تعلیمات،فوج،پولیس،تعمیرات غرض ان تمام خصوصیات جو آج کل مہذب سلطنت کے لئے ضروری ہیں ریاست حیدرآباد میں مکمل صورت میں موجود ہو گئے اور یہ انگریزوں کے مشورے کا طفیل تھا جنہوں نے ان تمام محکموں کو برٹش گورنمنٹ کے نمونے پر ڈھالا۔(۲۸)

آصف جاہ سادس نے صدر المہام اور معین المہام کے فرائض ایک دوسرے میں

ضم کر دیے اور ۱۳۰۰ء میں کونسل آف اسٹیٹ (مجلس سلطنت) قائم کی جس کی صدارت خود اعلیٰ حضرت فرماتے تھے۔ ۱۳۰۲ھ م ۱۸۸۵ء میں محکمہ معتمد سیاسیات اور معتمد رقومات مقرر ہوئے اس کے علاوہ ۱۳۱۰ھ میں ایک قانونچہ حصہ اول و دوم شائع ہوا۔ اس قانونچہ کے تعلق سے سید خواجہ صاحب مولف گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ ملک سرکار عالی میں قانون کی ابتداء اس سے ہوئی یہ ایک مجمل قانون ہے۔ جس میں چند فرامین شاہی مجمل طور پر نسبت انتظام شائع کیے گئے ہیں مگر وہ اصول اعلیٰ انتظام پر مبنی اور جملہ قوانین کا مبدا ہے (۲۹)

فروری ۱۸۹۳ء میں مجلس وضع قوانین قائم کی گئی تا کہ سرکاری اور غیر سرکاری اراکین کو موقع ملے کہ آپس میں مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد ملک کے لئے موزوں قوانین مرتب کریں جو بعد میں میر محبوب علی خاں کی منظوری کے بعد نافذ کیے جائیں (۳۰)

۱۳۰۸ھ میں بلدہ میں یونانی مطب کھولے گئے اور پوسٹ کارڈ کا طریقہ رائج کیا گیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون میں آصفجاہ سادس کے عہد کو جدید حیدر آباد کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''آصفجاہ سادس کے عہد تک ریاست کا نظم و نسق قدیم مغلیہ اساس پر مبنی تھا۔ ریاست کے چاروں طرف جب نئے نظام کا رواج ہوا تو ریاست کے ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ہندوستانی نظام کے ساتھ یکسانیت کے خیال نے اپنے نظام کو بدلنے پر مجبور کیا لیکن یہ کام اس نے بہ تدریج کیا اور اس کا آغاز اس عہد سے ہوتا ہے۔ یہ عہد جدید حیدر آباد کا سنگ بنیاد ہے (۳۱)

☆ مدارس کا قیام

آصفجاہ سادس نے مدارس کے قیام پر خاص توجہ دی۔ آپ کے عہد میں کئی علمی، طبی و فنی مدرسے قائم ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ملک کے ہر اک ضلع میں ابتدائی مدارس کھولے گئے۔ ۱۲۹۷ھ م ۱۸۸۰ء میں حیدر آباد کالج کھولا گیا اور ۲۱ ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ م یکم اکتوبر ۱۸۸۵ء کو چادر گھاٹ میں سول سرویس کے لئے کلاس قائم کے گئے۔ جس میں

متعدد سیویلین جیسے محکمہ مال، عدالت، کوتوالی، معتمدی میں کافی لیاقت حاصل کر کے سرکار عالی کی خدمت کے لئے تیار ہوئے اور انہیں مناسب خدمتیں دی گئیں۔

۱۳۰۴ھ میں حیدرآباد کالج کو مدرسہ عالیہ میں ضم کر کے نظام کالج نام رکھا گیا۔

۱۲۸۷ھ میں مدرسہ تعلیم فن تعمیرات قائم کیا گیا۔ مظاہرات کے مطالعہ اور ہیئت کی عملی تعلیم کے لئے رصدگاہ نظامیہ قائم کی گئی۔ ۱۳۰۷ھ کو میر محبوب علی خاں نے طلبا کی اعانت کے لئے پانچ ہزار روپے کمیٹی کے تفویض کئے تا کہ جو طلبا ناداری کی وجہ سے اقطاع ہند میں کالج کی کلاسوں میں اعلیٰ تعلیم پانے سے محروم رہ جاتے ہیں اس کو امداد بہ نام وظائف نظامیہ دی جائے۔

علاوہ ازیں جن کالجوں کو امداد دی جاتی تھی ان کے نام ذیل میں درج ہیں
(۱) علی گڑھ کالج (۲) پٹنہ کالج (۳) صوبۂ بمبئی کے کالج (۴) صوبہ مدارس کے کالج اور صوبہ پنجاب کے کالج (۳۲)

اس کے علاوہ مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ۱۸۸۵ء میں دس ملکی طلبا کو منتخب کر کے انگلستان بھیجا گیا اور ان کو یہ آزادی دی گئی کہ وہ اپنی مرضی اور رجحان کے مطابق تعلیم حاصل کریں۔ ان کے تمام مصارف کی پابجائی سرکاری خزانے سے ہوتی تھی (۳۳) اسی طرح ہر سال تین طلباء کو فنی تعلیم (ڈاکٹری و انجینری) حاصل کرنے کے لئے ولایت کو سرکاری خرچ پر بھیجا جاتا تھا۔

آپ کے دور میں تعلیم نسواں کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی۔ ۱۸۸۷ء میں زنانہ مڈل اسکول نام پلی میں قائم کیا گیا جس کو ۱۹۰۸ء میں فوقانیہ کا درجہ دیدیا گیا۔ اسی سال محبوبہ گرلس اسکول کا بھی افتتاح عمل میں آیا (۳۴)

کتب خانہ آصفیہ: عوام کی علمی و ادبی خدمات کے لئے ۲ر رمضان ۱۳۰۸ھ میں کتب خانہ آصفیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ کئی اور کتب خانے کھولے گئے۔

☆ ادبی انجمنوں کا قیام

اس دور میں حیدرآباد دکن میں کئی علمی ادبی انجمنوں کا قیام ہوا۔ جہاں پر علمی، ادبی اور مضوعاتی تقریریں، مباحث اور مذاکرات ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اردو کی اشاعت

وترقی میں ان انجمنوں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ چند اہم انجمنوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

انجمن شعروالادب: ۱۳۱۲ھ میں یہ انجمن مدرسہ دارالعلوم میں قائم ہوئی۔ اس کا اہم مقصد طلباء میں عام معلومات کی توسیع تھا اس انجمن کو حکومت سے ماہانہ امداد ملتی تھی۔

انجمن اتفاق دکن: ۱۳۲۰ھ میں اس انجمن کا قیام ہوا— یہاں علمی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی موضوعات پر ہر ہفتہ پابندی سے مضامین پڑھے جاتے تھے۔ (۳۵)

انجمن اصلاح خیالات: ۱۳۲۱ھ میں یہ انجمن قائم ہوئی۔ اس انجمن کا مقصد ملک میں اچھے مقرر پیدا کرنا تھا اور عوام کے علمی، اخلاقی اور معاشرتی معلومات میں اضافہ کرنا تھا۔ یہاں پر ہر ہفتہ پابندی سے جلسے ہوتے تھے۔

انجمن ترقی علوم قدیمیہ: ۱۳۲۲ھ یہ انجمن وجود میں آئی۔ اس انجمن کا مقصد مشرقی علوم کی نایاب کتابوں کی اشاعت تھا۔ اس کے تحت نادر کتابوں کا ایک کتب خانہ بھی تھا۔

انجمن سرمایہ تعلیمی: ۱۵/آذر ۱۳۱۶ فصلی میں اس انجمن کا قیام ہوا۔ اس کا مقصد عوام سے چندہ جمع کر کے مستحق اور ہونہار طلبا کو وظائف دیکر مدرسہ علوم علی گڑھ یا ہندوستان یا یورپ امریکہ کے کسی کالج میں خاص فنون سیکھنے کے لئے بھیجنا تھا۔ اس انجمن کے صدر نشین مولوی عزیز مرزا اور مولوی عبدالحق بابائے اردو تھے۔ (۳۶)

انجمن معیار العلوم: ۱۹۰۶ء میں یہ انجمن قائم ہوئی اس انجمن کا مقصد طلبا یا مستحقین وشایقین علم کا امتحان لے کر ان کو اسناد عطا کرنا تھا۔ یہاں پر منشی، منشی عالم، منشی فاضل، مولوی، مولوی عالم، مولوی فاضل کے امتحانات ہوتے تھے اور نصاب پنجاب یونیورسٹی کا تھا (۳۷)

☆ آصف جاہ کے دور کی شاعری وادب

نواب میر محبوب علی خاں نہایت پرگو اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ آصف تخلص فرماتے تھے۔ آپ ابتدا میں اپنا کلام حفیظ الدین یاس جانشین شمس الدین فیض کو دکھاتے تھے۔ آپ کا کلام نہایت فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔ انہیں شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا اس لئے ان میں شاعری کا ذوق رچ بس گیا تھا۔ آپ کو شاعرانہ ماحول بھی ملا۔ جب آپ سن شعور کو پہنچے

اس وقت دکن میں شعر وشاعری کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے آپ نے تعلیم سے فراغت کے بعد شاعری شروع کی۔ اس وقت داغ دہلوی کا شہرہ ہندوستان بھر میں تھا۔ آپ نے انہیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور اپنا استادِ سخن مقرر کرلیا۔ شروع میں ایک ہزار ماہوار اور بعد میں پندرہ سو ماہوار اور انعام واکرام ومنصب سے سرفراز فرمایا اور...... السطان۔ بلبل ہندوستان جہاں استاد، ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک کے معزز خطابات عنایت کئے۔ اس قدردانی کے متعلق مانک راؤ وٹھل راؤ لکھتے ہیں:

> حیدرآباد میں داغ کو دنیاوی شہرت کا جس قدر عروج حاصل ہوا ہمارے خیال میں کسی اور شاعر کو کسی رئیس کے دربار میں نہ اس قدر عزت اور قدر ومنزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہوگی۔ مرزا داغ کے انتقال کے بعد جانشین امیر مینائی جلیل حسن جلیل کو اپنا استاد بنایا اور جلیل القدر کے لقب سے سرفراز کیا۔ (۳۸)

حقیقت تو یہ تھی کہ دہلی اور لکھنؤ کے اجزائے کے بعد ہندوستان میں صرف ریاست حیدرآباد دکن ہی اہل علم کی تنہا پناہ گاہ باقی رہ گئی تھی جو اپنی پچھلی روایتوں کے مطابق علم وفضل کی قدر کررہی تھی۔ داغ کی آمد کے بعد شعروادب کا بازار کافی گرم ہوگیا۔ نواب میر محبوب علی خاں کی علم نوازی اور قدردانی سخن کا شہرہ سن کر شمالی ہند اور مختلف مقامات سے کئی شعراء حیدرآباد میں جمع ہوگئے جن کی طویل فہرست ہے جو اگلے صفحات میں مع کلام کے پیش کی جائے گی۔ صرف بیرونی شعرا کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔ دکن میں صرف محبوبیہ دور ہی پرسکون ماحول میں گزرا تھا۔ اس سے قبل اور بعد شاید ہی اتنی زیادہ تعداد میں شعرا بیرون ملک سے حیدرآباد دکن میں نہیں آئے۔

☆ بیرونی شعرا

بیرونی شعرا کے قابل ذکر نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

سید کاظم حسین شیفتہ لکھنوی، ظہیرالدین دہلوی، جلیل حسن جلیل مانک پوری، سلام مدراسی، محمد عبدالجلیل نعمانی رام پوری، ترک علی شاہ ترکی، سید خواجہ معین الدین چشتی،

سالک دہلوی، مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی، ضیا لکھنوی، محمد عبداللہ خاں ضیغم لکھنوی، محمد باقر فکر کانپوری، عدیل کنتوری، قدر بلگرامی، شمس الحق میکش تھانوی، وحید دہلوی، والہ مدراسی، ہادی دہلوی، عاجز مدراسی، عشق مدراسی، حیدر یار جنگ نظم طباطبائی، عبدالرحمٰن بیدل سہارنپوری، امراؤ مرزا ناداں دہلوی، احسان الحق زار دہلوی، درگا پرشاد ذکا کانپوری، نادر علی برتر قنوجی، سید محمد شاہ بے نظیر، نجم الدین ثاقب بدایونی، نواب مرزا شیب دہلوی، عابد مرزا بیگم لکھنوی، ابوالحمید آزاد دہلوی، امیر حسین، فروغ لکھنوی، اصغر جنگ اصغر، اختر یار جنگ، اختر مینائی، وغیرہ ان کے علاوہ امیر مینائی نے بھی یہاں آکر رحلت کی اور مشہور مرثیہ گو انیس بھی ایام عزاداری میں مرثیہ پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔

☆ مقامی شعرا

حیدرآباد دکن کے مقامی شعرا میں خود نواب میر محبوب علی خاں آصف، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، سید نوازش علی لمعہ، لقمان الدولہ دل، میر وزیر علی خاں جوش احمد اللہ واصل، ڈاکٹر احمد حسین مائل، میر نوازش علی مست، خواجہ بہاء الدین دارا، میر حسین علی خاں افسر محمد ابوالحمید، میر محمد علی بخشش، میر اسد علی ششدر، میر تراب علی زور، میر نادر علی رند، محمد امراؤ حسین عازم، احتشام الدین تجلی، عباس حسین خاں شہید، عبدالحق بازغ، سید عبدالقادر قائم محمد سلیمان مہدی، سید عیسیٰ خاں مہدوی، حکیم عاشق حسین خاں ہاتف، نجم الدین حسین قادری افضل، میر حشمت علی حشمت، محمد اعجاز علی شہرت، سید رضی الدین حسن کیفی، غلام صمدانی خاں گوہر (مصنف تزک محبوبیہ) رحمت اللہ خاں رحمت (دادا راقم الحروف) قابل ذکر ہیں۔

آصف جاہ کے دور میں جتنے بھی شاعر ملتے ہیں ان میں سے اکثر بلکہ نو دفیصد شعرا مرزا داغ کے شاگرد تھے۔ جن کے کلام پر داغ کی زبان اور طرز بیان کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔ داغ کے آگے تمام مقامی اور بیرونی شاعروں کی شہرت ماند پڑ گئی۔ ایسے وقت میں وصفی اور ان کے حیدرآبادی شاگرد احمد اللہ واصل اور ڈاکٹر احمد حسین مائل، داغ کے مقابلہ میں اتر آئے۔ واصل نے دعوی کیا کہ حیدرآباد میں جو شاعر ہیں وہ بھی فصیح زبان لکھ سکتے ہیں۔ اسی دور میں پہلی مرتبہ غیر ملکیوں کے تعلق سے مخالفانہ جذبات ابھرے۔

واصل نے دعویٰ کیا

واصل ترقی دیں گے ہم اردو زبان کو
ملک دکن کو ہند کا ہمسر بنائیں گے (۳۹)

ایک اور شعر میں کہتے ہیں۔

مرا ذمہ زباں میں ہو دکن بھی ہند کا ہمسر
رہیں واصل اگر جلسے یونہی یاران یکدل کے

اسی طرح داغ کی مشہور تعلّی

کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

کا جواب واصل نے اس طرح دیا۔

نہیں کوئی اردو کی تخصیص واصل
کہ آتی ہے ہر اک زبان آتے آتے (۳۰)

واصل کو اپنے شاہ وقت سے شکایت تھی کہ وہ خواہ مخواہ بیرونی شعرا کو اہمیت دیتے ہیں وہ بتانا چاہتے تھے کہ حیدرآبادی شاعر بھی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ جیسی زبان لکھ سکتا ہے۔

توجہ اگر ہو تو اردو ہے کیا چیز
کہ راز خدا آدمی جانتا ہے

اس چشمک کے نتیجے میں اہل دکن میں خود اعتمادی اور زندگی کی لہر پیدا ہوئی اور اپنی اسی خود اعتمادی کی وجہ آج حیدرآباد شمالی ہند سے کم نہیں۔

شعر کے علاوہ شمالی ہند کے بہت سے ادیب اور انشا پرداز بھی اس زمانے میں حیدرآباد دکن میں جمع ہوئے جن کی آصف جاہ نے قدر کی۔ان میں قابل ذکر عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ظفر علی خاں، مولوی مشتاق حسین خاں وغیرہ۔

پروفیسر عبدالقادر سروری سالنامہ رہبر دکن میں راقم طراز ہیں:

"اس عہد میں ہندوستان کے تقریباً تمام سربرآوردہ شاعروں اور ادیبوں کا کسی نہ کسی طرح ریاست سے تعلق رہا۔ان برگزیدہ تعلقات نے

> عہد آصفجاہ سادس میں دارالسلطنت کو ہندوستان بھر میں نہ صرف قابل رشک بنادیا تھا بلکہ یہاں کی علمی مصروفیتوں میں ایک غیر معمولی چہل پہل پیدا کردی تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت حیدرآباد و اکناف ہند کے کسی قابل عالم اور ادیب کو درالسلطنت سے باہر نہ رہنے دے گی۔(۴۱)

☆ نثری کارنامے

شاعری کے علاوہ محبوبیہ دور میں نثر نگاری کو بھی کافی ترقی ہوئی۔ ہر موضوع پر کتابیں لکھی گئیں۔ذیل میں چند اہم تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے:مولوی ظفر علی خاں نے ''خیابان فارس''اور''معرکہ مذہب وسائنس'' کا ترجمہ کیا۔شمس العلماء سید علی بلگرامی نے ''تمدن عرب''اور''تمدن ہند'' کا ترجمہ کیا۔

ملاعبدالقیوم نے''استدعا تعلیم جبری''مرتب کی۔

عبدالجبار خاں ملکاپوری نے جو مشہور مورخ گزرے ہیں،تذکرہ شعرائے دکن محبوب الزمن (دوجلدیں) تذکرہ سلاطین دکن اور تذکرہ اولیائے دکن لکھ کر حیدرآباد کی تاریخ کو محفوظ کردیا۔دکن پر کوئی کتاب،ان کتابوں کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ مانک راؤ وٹھل راؤ نے''بستان آصفیہ''لکھی جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔اس میں دکن کے سلاطین،خاندانوں اور خاندان آصفیہ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے خیابان آصفیہ،دستور حکمرانی اور حالات ومقالات سقراط؟ کا تمدن وغیرہ کتابیں لکھیں۔

غلام صمدانی گوہر نے تزک محبوبیہ(دوجلدیں)لکھی۔ریاض آصف اور دربار آصف کے نام سے سلاطین ہند اور سلاطین دکن کی مکمل تاریخ قلمبند کی۔اس کے علاوہ ایک ناول صادق اور رحیم النسا بھی لکھی۔اس کے علاوہ شمس العلماء عزیز جنگ ولا اور بیسیوں ادیبوں کی تصانیف ملتی ہیں(۴۲)

اس کے علاوہ عوام میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ان کی عام معلومات میں اضافہ اور حالات حاضرہ سے واقفیت کے لئے محبوبیہ دور میں بیسیوں اخبارات ورسائل

نکلنے لگے۔ ذیل میں ہم چند اہم اخبارات و رسائل کے نام درج کرتے ہیں۔ جن سے آپ کو دکن کی نثری ترقی کا اندازہ ہوگا۔

☆ اخبارات کی اجرائی

(۱) جریدۂ اعلامیہ سرکار عالی، یہ ہفتہ وار اخبار ابتداء میں ۱۲۸۶ھ م ۱۸۶۹ء میں فارسی زبان میں جاری ہوا۔ پھر ۱۳۰۱ھ سے بجائے فارسی اردو میں شائع ہونے لگا۔

(۲) ہزار داستان، یہ روزنامہ ماہ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ میں زیر ادارت محمد سلطان جاری ہوا۔

(۳) معلم شفیق۔ یہ ہفتہ وار اخبار ماہ شوال ۱۳۰۱ھ میں مولوی محب حسین کی ادارت میں جاری ہوا۔ (۴۳)

اس کے علاوہ اخبار آصفی، افسر الاخبار، سفیر دکن، دکن پنچ، محبوب القلوب، نظارہ عالم عزیز الاخبار، دکھنی، جلوہ محبوب، علم و عمل، محبوب گزٹ وغیرہ شائع ہوتے تھے۔

☆ رسائل کی اجرائی

معلم شفیق، فنون، مذاق سخن، رفیق دکن، حسن، نغمہ ہزار، معلم نسواں، افسر، دبدبہ آصفی، دکن میڈیکل جرنل، تکمیل الاحکام، جشن آصفیہ، افسانہ دکن ریویو، معیار الانشا، صحیفہ وغیرہ (۴۴) شائع ہوتے رہے نواب میر محبوب علی خاں خود علم و ادب کے شیدائی تھے۔ ذوق سلیم سے آپ کے کلام میں شگفتگی پیدا ہونے لگی۔ زور کلام میں روانی بڑھ گئی۔

☆ طغیانی موسیٰ ندی کی

عہد محبوبیہ میں سب سے زیادہ دردانگیز واقعہ موسیٰ ندی کی طغیانی کا ہے۔ یوں تو آپ کے پیشرو سلاطین کے عہد میں بھی کئی طغیانیاں آئیں لیکن محبوبیہ عہد میں ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کو جو قیامت خیز طغیانی آئی اس نے حیدرآباد پر ایک بلائے آسمانی نازل کردی۔ شاہ آصف اس ناگہانی مصیبت سے بے حد متاثر ہوئے۔ حکومت اور فوج کو امداری کاموں پر فوری لگا دیا۔ طغیانی کے دوران خود ندی کے کنارے پہنچ کر امدادی کام کا جائزہ لیتے تھے۔ رعایا نے آپ سے فریاد کی کہ ہم بے سہارا اور بے خانماں ہوگئے۔ اس پر شاہ دکن آبدیدہ

ہوئے اور فرمایا ''غلام کا گھر حاضر ہے'' چنانچہ شاہی محلات کے دروازے مصیبت زدوں کے لئے کھول دیئے گئے۔شہر میں پانچ لنگر خانے مسلمانوں اور پانچ ہندوؤں کے لئے قائم کئے گئے۔ ہر خاندان کے نقصان کی حتی الامکان تلافی کی گئی۔ سرکاری خزانے سے بائیس لاکھ روپے تقسیم کئے گئے۔شاہ نے جس شفقت اور ہمدردی کا عملی ثبوت دیا اس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے اور آپ نے تجویز کی کہ شہر سے دور دور تالاب بنائے جائیں تا کہ آئندہ طغیانی کے خطرات سے ممکنہ حد تک نجات مل سکے۔

☆ وفات آصف جاہ سادس

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس پر ۲۹ راگست ۱۹۱۱ء کو دن میں تین بجے غشی طاری ہوئی۔ یہ سلسلہ دو دن تک جاری رہا۔حکیم نابینا صاحب کا علاج جاری رہا لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ بالآخر ۳۱ راگست ۱۹۱۱ء بروز شنبہ کے دن ساڑھے گیارہ بجے مختصری علالت کے بعد انتقال کر گئے اس خبر کے پھیلتے ہی سارے شہر میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مکہ مسجد کے صحن میں اپنے والد کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔

سرکاری طور پر سات دن کے سوگ کا اعلان کیا گیا۔محبوبیہ دور کے شعرا نے ان کے انتقال پر ملال پر تاریخیں لکھی۔

چراغِ دکن بجھ گیا آج (۴۵)   ۱۹۱۱ء سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

آصف سادس کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے نواب میر عثمان علی خاں نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔

آصف جاہ سادس کی شاعری

شاہ آصف کو شاعری کا شوق نوجوانی سے شروع ہوا۔ پہلے حضرت حفیظ الدین یاس شاگرد حضرت فیض کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ پھر مرزا داغ جب حیدرآباد آگئے تو ان مشورہ سخن کرنے لگے اور استاد شاہ کا مرتبہ دیا۔ داغ کے انتقال کے بعد جلیل حسن جلیل کو اپنا استاد بنایا۔

آصفجاہ سادس اردو کے نہایت پر گو قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی غزلیں قافیہ کی

رسائی تک طولانی ہوتی تھیں۔ مگر زبان کی شستگی محاوروں کی برجستگی، خیالات کی صفائی اور انداز بیان کی سلاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ صفائی ایسی ہے کہ داغ کے کلام کا گمان ہوتا ہے یہ صفائی وسلاست انہیں حضرت جلیل سے بھی ملی، داغ کی وفات کے بعد جن سے وہ مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ شاعری میں شاہ آصف نے گزشتہ سلاطین دکن سے زیادہ نام پیدا کیا۔ انہیں جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ غزل کے علاوہ انہوں نے مرثیے، سلام، نعت، رباعیاں اور ٹھمریاں بھی کہی ہیں۔

آصف سادس کی شاعری کا تعلق دل ودماغ سے تھا۔ انہوں نے شاعری کو تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ داخلی اور خارجی موضوعات ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ شعروشاعری سے یہ حقیقی دلچسپی بادشاہت کے ساتھ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ داغ وجلیل کی شاگردی میں شاہ آصف نے سارے ہندوستان میں شہرت حاصل کی۔ آصف ان چند معدودے سلاطین میں ہیں جنہیں ان کی زندگی ہی میں شہرت عزت اور ناموری حاصل ہوگئی تھی۔ آصف کی شخصیت اور شاعری میں بلا کی ہم آہنگی اور یکرنگی تھی۔ آصف کی شاعری ان کی زندگی کی تصویر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں نہ فلسفہ کی موشگافیاں ہیں اور نہ بیان کی پیچیدگیاں اور نہ علامتوں کی تہہ داریاں شاہ نے عشق ومحبت کا کوئی بلند نظریہ بھی پیش نہیں کیا اور نہ اندرون میں جھانکنے کی کوشش کی۔ تکلف وتصنع پر بے ساختگی اور سادگی کو ترجیح دی۔ آصف کا محبوب جنسِ بازاری نہ تھا اور نہ سطحی تھا۔ اس میں تصوف کی چاشنی بھی تھی۔ مثلاً

محشر میں کون دوست ہے مجھ داد خواہ کا
دل اپنی راہ کا ہے، جگر اپنی راہ کا (۴۶)

شاہ آصف کی غزل کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔ داغ کی اصلاح کے ساتھ:

اصل شعر:۔

چہرے سے ان کے رنگ جو ٹپکا عتاب کا
کیا ہوچلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

اصلاح داغ کے بعد

چھپتا نہیں چھپانے سے چہرہ عتاب کا
ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

آصفجاہ سادس نے حضرت آغاز ابوالعلائی صحو صاحب سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی جس میں حضرت قبلہ سے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے۔

کعبہ دل میں جو مہمان ہیں آغا میرے
دل کے دل جان کی بھی جان ہیں آغا میرے
مرشد پاک کی درگاہ ہے گویا فردوس
جمع سب طرح کے سامان ہیں آغا میرے
پائے جاتے ہیں صفات ملکوتی ان میں
گرچہ ظاہر میں تو انسان ہیں آغا میرے
آپ کے ذات سے ہے قوت دین اسلام
ایسے دیندار مسلمان ہیں آغا میرے
دل عارف سے کوئی پوچھے حقیقت ان کی
کیسے ذی مرتبہ ذی شان ہیں آغا میرے
ایسے مخدوم کی خادم کو ہے خدمت لازم
میں ہوں آصف تو سلیمان ہیں آغا میرے (۳۷)

ایک اور نظم میں انہوں نے علم کی قدر کو اجاگر کیا ہے اور جہالت کو امراض کا مجمعہ قرار دیا ہے۔ علم کو انہوں نے دولت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی عظمت کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ علم ایک ایسی شے ہے جو دانش وفہم کی ترقی کا باعث ہے۔ نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

علم کی قدر کرو قدر کرو قدر کرو
تم کو اللہ نے بخشی ہے اگر طبع سلیم

طالب علم ذکی اور ہو استاد شفیق
کیوں پسندیدہ نہ ایسی ہو جہاں کو تعلیم
فہم و دانش کی ترقی کا یہی باعث ہے
علم کی وجہ سے تھے حضرت لقماں بھی حکیم
ایسی دولت کے لئے کوشش و محنت ہے ضرور
گرچہ تقدیر عطا جس کو کرے رب کریم
یہ جو آصف نے کہا غور سے اس کو سمجھو
علم وہ شے ہے کہ اللہ کا ہے نام علیم (۴۸)

رعایا کی خوشحالی اور مذہبی رواداری کے موضوعات ان کی ایک نظم میں ملتے ہیں۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آرزو ہے یونہیں مجھ سے ہو رعایا دلشاد
مجھ پہ جیسا ہے خداوندِ تعالی کا کرم
دیتے ہیں اہلِ قلم کار ریاست انجام
شرط یہ ہے رہے ملحوظ دیانت ہردم
اہلِ تدبیر کو حاجت نہ ہو کیونکہ آصف
حفظ تقدیر کے بھی واسطے ہے لوح و قلم (۴۹)

ایک مرتبہ فوج کی جانب سے آپ کی خدمت میں ایک ایڈرس پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے اس ایڈرس کے جواب میں ایک نظم کہی جس میں فوجی نوجوانوں کو جاں نثاری اور ان کے جوہر مردانگی و بہادری کی تعریف کی ہے اور اس میں انہیں چند نصیحت کی باتیں بھی ہیں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ دولت برطانیہ کی خیرخواہی بھی پیش نظر رکھیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نظم

اے جاں نثار فوج ظفر موج شکر ہے — جوہر ہیں تجھ میں صورت شمشیر آبدار
رخ رخ سے مرد مرد کی مردانگی عیاں — رگ رگ سے فرد فرد کی جرات ہے آشکار

بیمار ہونے کا یہ بہانہ کیا ہے۔ایک جگہ تو محبوب کے بار ہا جھوٹ بولنے پر اسے شرم دلائی گئی۔غزل کے کچھ اشعار پیش ہیں۔

غزل

بس انتظار وعدہ دیدار ہو چکا
وہ آئے یا نہ آئے یہ بیمار ہو چکا
آتی نہیں ہے شرم تمہیں جھوٹ بولتے
وہ وعدہ کرتے ہو جو کئی بار ہو چکا
پوچھا نہ جھوٹے منہ بھی کسی دن مجھے ذرا
سو بار اس امید میں بیمار ہو چکا
پورا کبھی ہوا بھی ہے اقرار آپ کا
سوبار وعدہ کر چکے، سوبار ہو چکا
طاقت دل و جگر میں نہ ہے ہاتھ پاؤں میں
سامان اب تو کوچ کا تیار ہو چکا
کس کس کے آگے اس کی شکایت نہ ہو چکی
آصف تو بے خطا بھی خطاوار ہو چکا (۵۴)

ایک غزل میں آصف واعظ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ہم بادہ و بادہ خوار کی باتیں سننے کو مشتاق بیٹھے ہیں اس لئے محبوب سے کہتے ہیں کہ دل کی باتیں تیرے سوا کسی اور سے نہیں بیاں کی جاتیں۔اپنی کیفیت محبوب پر یوں ظاہر کرتے ہیں کہ اگر تم میری آنکھوں میں دیکھو تو تمہیں چشم مست کی پر خمار باتیں نظر آئیں گی۔آصف کی شوخی کا اظہار ان کے ایک شعر سے ہوتا ہے۔جس میں انہوں نے اپنے محبوب کو شہسوار سے تشبیہہ دی اور صبا سے اپنی محبوب کی خبر بتانے کو کہا ہے۔محبت میں محبوب کو بے وفا کہہ کر یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ ایک تیری خاطر ہزاروں کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔اس غزل میں استاد سخن حضرت داغ کا رنگ جھلکتا ہے:

غزل

ہم ہیں مشتاق آ سنا واعظ
بادہ و بادہ خوار کی باتیں

کیا کہیں تجھ بغیر کس سے کہیں
دل امیدوار کی باتیں

رنج کے ساتھ رنج کا ہے کلام
پیار کے ساتھ پیار کی باتیں

آنکھ سے یہ عیاں ہے دیکھو تو
چشم مست خمار کی باتیں

اے صبا کیا خبر ہے کہہ تو ذرا
میرے اس شہسوار کی باتیں

بے وفا ایک تیری خاطر سے
سن رہا ہوں ہزار کی باتیں

تجھ کو رسوا کریں، یہ ہیں آصف
اس دل بیقرار کی باتیں(۵۵)

ایک اور غزل میں تعویذ کے قافیہ کا التزام ہے۔جس میں تعویذ کے سبب محبوب کی خوبصورتی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ایسے محبوب کو نظر بد سے بچانے کے لئے وہ اپنے دل کے ٹکڑوں کی تعویذ بنا کر پہنانے کی خواہش کرتا ہے۔محبوب کے بازو سے تعویذ کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کو دیکھ کر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ رات کیسی گزری۔اس قدر ضعف کس سبب سے ہے۔غزل کے اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

غزل

یوں تو زیبا سبھی زیور ہیں ترے بازو پر
خوشنمائی میں مگر سب سے ہے اول تعویذ

نظر بد سے بچانے کے لیے اعدا کی
دل کے ٹکڑوں کی پنہاؤں تجھے ہیکل تعویذ

اس قدر ضعف ہے کیوں رات کو کیسی گزری
چہرہ اترا ترے بازو سے گیا ڈھل تعویذ

سایۂ فضلِ خدا آصفِ دیندار پہ ہے
سحر بیکار رقیبوں کا ہے مہمل تعویذ (۵۶)

ایک غزل میں عشق حقیقی کے جذبات ملتے ہیں۔ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کا عشق کسی اور پر ظاہر نہ ہو۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اے خدا تو میرے عشق سے آگاہ ہے تو بہت کافی ہے وہ اپنے آپ کو اپنے پیر کے در کا گدا کہتے ہیں۔ یہ غزل ملاحظہ ہو۔

غزل

مرا رازِ محبت ہو نہ افشا
خدایا اس سے بس آگاہ تو ہے
دل اب تو دیدیا اس بت کو میں نے
مرا یاور مرے اللہ تو ہے
نہ پایا دل کے گوشے میں کوئی اور
فقط اک زیبِ جلوہ گاہ تو ہے
ترے در کا گدا یا پیر میں ہوں
شہنشاہوں کا شاہنشاہ تو ہے
ادا سے ناز سے پاس آکے اس نے
کہا آصف سے آصف جاہ تو ہے(۵۷)

ایک غزل میں دل کو قافیہ بنایا ہے، اس غزل میں آصف کہتے ہیں کہ مرقد میں جب دل تڑپنے لگتا ہے تو گماں ہوتا ہے کہ کہیں محبوب فاتحہ دینے تو نہیں آگیا ہے دل کو کعبے سے جو اکثر تشبیہ دی گئی ہے تو اسی کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ دل کو نہ ڈھاؤں اور نہ ہی مٹی میں ملاؤں کا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ محبوب کی گلی میں بار بار نظر آنے سے یہ لوگ یہ طعنہ دیتے ہیں کہ کس قدر بے حیا دل ہے پھر چل آیا۔ محبوب کے غم کو ظاہر کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ میں وہ دل کہاں سے لاؤں جس میں تیرا غم سما سکے۔ محبوب کو ظالم قرار دیتے ہوئے التجا کی گئی ہے کہ یہ میرا دل ہے اس کو پامال نہ کر بلکہ دل کو اپنے کلیجے سے

لگالے۔غزل کے شعر درج ہیں۔

غزل

کہیں آیا نہ ہو وہ فاتحہ کو
تڑپتا ہے جو مرقد میں مرا دل
گلی میں دیکھ کر اپنی وہ بولے
پھر آیا کس قدر ہے بے حیا دل
سما جائے غم کونین جس میں
کہاں سے لاؤں میں اتنا بڑا دل
یہ ہے گفتار یا رفتار کیا ہے
تری باتوں پہ میرا پس گیا دل
مرا دل ہے نہ کر پامال اس کو
ارے ظالم کلیجے سے لگا دل
جسے دیتا ہوں وہ کہتا ہے آصف
مبارک آپ کو ہو آپ کا دل (۵۸)

☆ رباعیات وقطعات

آصف کی رباعیوں اور قطعات میں مختلف مضامین ملتے ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں کہ خورشید کی روشنی لازم ہے تو زراعت کو مفید بنانے کے لئے پانی ضروری ہے اور اسی طرح اپنے آقا سے ملازم کی امید برآنا ہمیشہ لازم وملزوم رہا ہے ایک جگہ آدمی کو سنبھل کر چلنے کی ہدایت دیتے ہیں تا کہ اسے ٹھوکر نہ لگے۔ایک جگہ خاص وعام کی بحث ملتی ہے۔جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ خاص لوگوں میں کبھی عامیانہ،پن نہیں آتا۔ان میں لالچ نہیں ہوتی اور جو دیانت دار اور خیر اندیش ہوتے ہیں۔وہ ہر حال میں اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ایک اور جگہ دلیری قوی دل اور چستی کو سراہا گیا ہے اور تواضع وانکساری کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اسے سرفرازی کا ضامن قرار دیا ہے۔

رباعیات

دن کے لئے واجب ہے ضیائے خورشید
لازم ہے کہ پانی ہو زراعت کو مفید
یہ لازم و ملزوم ہمیشہ سے ہے
آقا سے ملازم کی بر آئے امید (۵۹)

صورت نکہت ہو پریشاں کیوں
اپنی حد سے کوئی نکل کے ملے
کہیں ایسانہ ہو لگے ٹھوکر
چاہیے آدمی سنبھل کے چلے

قطعات

سپہ گری کے یہ معنی ہیں دل قوی رکھنا
جو ہیں دلیر و دلاور انہیں نے پایا اوج
درست و چست رہو ہے یہ خواہشِ آصف
کہ جانتے ہیں تمہیں سب کو فتح جنگ کی فوج

فوارے کا ہے پانی وہ گر پڑے گا اٹھ کر
گر سرکشی ہے اپنے سرکش کو ناز ہوگا
باغ جہاں میں آصف مانند شاخ ثمرہ
جو سرخرو کرے گا وہ سرفراز ہوگا (۶۰)

نواب میر محبوب علی خاں آصفِ سادس عزاداری میں حصہ لیا کرتے تھے اور عزاداری کے لیے ماہ محرم میں سلطنت آصفیہ سے ہزار ہا روپیہ سالانہ مقرر تھے۔ حضرت امام حسینؑ سے عقیدت ان کے ایک سلام میں ملتی ہے۔ حضرت حسینؑ کے چہرۂ مبارک کی جامع تعریف کی ہے اور ان کی شہادت کو ایک عظیم انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔ اسی میں ان کے والد حضرت علیؑ کی فضیلت بھی بیان کی ہے۔ سلام کے چند اشعار پیش ہیں۔

سلام

رخِ حسین کو حق کی کتاب سمجھے ہیں
اس انتخاب کو ہم انتخاب سمجھے ہیں
حسین کو جو علی کا جواب سمجھے ہیں
تو اس جواب کو ہم لاجواب سمجھے ہیں
دہن ہے فاطمہ کے لعل کا جو غنچۂ گل
لعابِ پاک کو روحِ گلاب سمجھے ہیں
نہیں رہا جو برس دن بھی ظالموں کا نشاں
سمجھنے والے اسے انقلاب سمجھے ہیں
جو سچ کہو تو خدائی میں بندۂ یکتا
علی کو بعد رسالت مآب سمجھے ہیں
غمِ حسینؑ میں آنسو جو ڈبڈبائے ہیں
حباب آنکھوں کو اشکوں کو تاب سمجھے ہیں
جہاں میں کہتے ہیں اکثر حسین کو آصف
ہم اس کو خاک در بوتراب سمجھے ہیں (۶۱)

ایک اور سلام میں آصف کربلا کے مظالم کو سن کر اس پر حیرت زدہ ہوتے ہیں۔ مٹی کے بنے ہوئے ظالموں کے دل پتھر کے بھی ہوتے ہیں اور آگے فرماتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کا چہرا دیکھ کر دشمن بھی حیران تھے۔ ایک شعر میں وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت حسین کی شہ رگ اپنے قاتل سے بہ زبان حال پھڑک کر یہ کہہ رہی ہے کہ پیاسوں کے مشتاق خنجر ایسے بھی ہوتے ہیں (۶۲)

سلام

سنا شبیر کا نام اور اک بجلی گری دل پر
جو دل میں درد رکھتے ہیں وہ مضطر ایسے ہوتے ہیں

مظالم کربلا کے سنکے حیراں اس پہ ہوتی ہے
کہ مٹی کے یہ پتلے دل کے پتھر ایسے ہوتے ہیں
عدو بھی ہوگئے حیراں جو دیکھا صبر حضرات کا
یہ کیا معلوم تھا سبط پیمبر ایسے ہوتے ہیں
پھڑک کر شہ رگ ان کی کہہ رہی تھی اپنے قاتل سے
کہ پیاسوں کے لئے مشتاق خنجر ایسے ہوتے ہیں (۶۳)

نواب میر محبوب علی خاں آصف کی رعایا پروری، ہمدردی عوام سے ان کا تعلق خاطر اور ان کے حسنِ انتظام کی وجہ سے عوام کا ہر طبقہ محبت اور عقیدت رکھتا تھا۔ ہر عہد کا شاعر اور ادیب اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے چنانچہ اس عہد کے کئی شعرا کے قطعات میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو انہوں نے بطور ہدیہ مختلف تقریبات کے موقعوں پر پیش کئے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور شعرا کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

ہونے کو ہوئے خسرو قیصر پیدا — آصف کا ہوا کوئی نہ ہمسر پیدا
جس خاک پہ سرکار کا سایہ پڑجائے — اس خاک سے ہوں لاکھ سکندر پیدا
(فصاحت جنگ جلیل)

مرا ممدوح آصف جاہ تو ہے — مری غزلوں کی بسم اللہ تو ہے
(محمد قاسم علی خاں ارشاد)

ہے تیرے نور سے عام یہ معمور — کہ رشک مہر، رشک ماہ تو ہے
(میر محبوب علی خاں اشعر)

نظام الملک آصفجاہ تو ہے — فلک حشمت دکن کا شاہ تو ہے
(شریف الحسن اصغر)

آصف جاہ سادس آصف کی شاعری میں موضوعات کا تنوع بہت ملتا ہے۔ بزرگانِ دین سے عقیدت بھی ہے اور ان کے ملکوتی صفات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ علم کی فضیلت اور اس کے حصول کی ترغیب، رعایا کی خوشحالی کی فکر، حکومت کے کارکنوں، خصوصاً فوج کی ستائش، ہمت اور ان کی فرض شناسی کا اعتراف، عشق حقیقی و عشق مجازی، اہلِ بیت اطہار سے عقیدت

وغیرہ موضوعات سے ان کی شاعری بھری پڑی ہے۔

آخر میں آصف کے چند اشعار جو زبان زد عام وخاص ہیں اور مشہور ہیں یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

آصف کو جاں و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

ایسے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نہ کریں
مرد جو کہتے ہیں وہ کرکے دکھاتے ہیں

ہم ان سے دب کے رہیں گے کبھی نہ اے آصف
وہ شاہِ حسن سہی، تاجدار ہم بھی ہیں

☆ حواشی

(۱) غلام امام خاں حزیں تاریخ خورشید جاہی حیدرآباد،۱۳۴۲ھ،صفحہ۔۲۴۱
(۲) محمد فاضل جشن عثمانی حیدرآباد،۱۹۳۷ء،صفحہ۔۳۹
(۳) شیخ یعقوب عرفانی،حیات عثمانی حیدرآباد،۱۹۳۶ء صفحہ۔۱۱۵
(۴) تزک محبوبیہ،جلداول۔حیدرآباد ۱۳۱۷ھ،صفحہ۔۲
(۵) محمد فاضل جشن عثمانی حیدرآباد،۱۹۳۷ء،صفحہ۔۳۶
(۶) مانک راؤ وٹھل راؤ،بستان آصفیہ،حیدرآباد،۱۳۳۷ھ،صفحہ۔۷۳
(۷) سوانح حیات خواجہ صاحب،صفحہ۔۳
(۸) سیدامجد علی،سوانح میر محبوب علی خاں،حیدرآباد،۱۹۱۱ء،صفحہ۔۲۴
(۹)(۱۰) عبدالحی مملکت آصفیہ،جلداول کراچی،۱۹۷۸ء صفحہ۔۱۵۸
(۱۱) غلام صمدانی خاں گوہر،دربار آصف،حیدرآباد،۱۳۰۱ھ،صفحہ۔۱۵۸
(۱۲) سیدامجد علی،سوانح میر محبوب علی خاں،حیدرآباد،۱۹۱۱ء،صفحہ۔۲۷
(۱۳) سیدامجد علی،سوانح میر محبوب علی خاں،حیدرآباد،۱۹۱۱ء صفحہ۔۶۹
(۱۴) غلام صمدانی گوہر،تزک محبوبیہ،جلداول،حیدرآباد،صفحہ۔۶۹
(۱۵) تاریخ قلمرو نظام،حیدرآباد،صفحہ۔۱۹

(۱۶) غلام صمدانی خاں گوہر، دربار آصف، حیدر آباد، ۱۳۰۱ھ، صفحہ۔ ۴۱۳
(۱۷) محمد مظہر، تذکرہ باب حکومت، حیدر آباد، صفحہ۔ ۵۰
(۱۸) طالب علی شمس الدین نجم، تاریخ قلمرو نظام، حیدر آباد، ۲۱
(۱۹) رسالہ سب رس، مرقع دکن، حیدر آباد، ۱۹۳۸ء صفحہ۔ ۱۰۲
(۲۰) ڈاکٹر انور الدین، مقالہ حیدر آباد میں علمی وادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، صفحہ۔ ۱۴۳
(۲۱) افسر الملک۔ سفر نامہ میر محبوب علی خاں، حیدر آباد، صفحہ۔ ۱۰۹
(۲۲) غلام صمدانی گوہر، تزک محبوبیہ، جلد اول، حیدر آباد، صفحہ۔ ۱۹۶
(۲۳) عبدالرؤف سبحان اللہ، دبدبہ نظام، حیدر آباد، صفحہ۔ ۱۳۹
(۲۴) مانک راؤ وٹھل راؤ، بستانِ آصفیہ، جلد اول، حیدر آباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ۔ ۱۱۴
(۲۵) ڈاکٹر انور الدین، مقالہ حیدر آباد میں علی وادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، صفحہ۔ ۱۴۰
(۲۶) وقار حیات، حیدر آباد، صفحہ۔ ۹۲
(۲۷) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی ۱۹۷۸ء، صفحہ۔ ۶۰۹
(۲۸) نجم الغنی، تاریخ ریاست حیدر آباد دکن، صفحہ۔ ۵۶۱
(۲۹) سید خواجہ صاحب، تاریخ دکن عہد عالیہ، صفحہ۔ ۲۰۹
(۳۰) سید خواجہ صاحب، تاریخ دکن عہد عالیہ، صفحہ۔ ۲۰۹
(۳۱) ڈاکٹر انور الدین، مقالہ حیدر آباد میں علمی وادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، صفحہ۔ ۱۴۶
(۳۲) غلام صمدانی گوہر، تزک محبوبیہ، جلد اول، حیدر آباد، صفحہ۔ ۱۵۷
(۳۳) غلام صمدانی گوہر، تزک محبوبیہ، جلد اول، حیدر آباد، صفحہ۔ ۱۵۷
(۳۴) مرزا مظفر بیگ، آزاد حیدر آباد، ۱۳۵۹ھ، صفحہ۔ ۱۴۶
(۳۵) علی اکبر پروفیسر، عہد عثمانی میں تعلیم کی ترقی (ماہنامہ سب رس) ۱۹۶۸ء، صفحہ۔ ۳
(۳۶)(۳۷) مانک راؤ وٹھل راؤ، بستانِ آصفیہ، جلد اول، حیدر آباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ ۶۸۰، صفحہ ۶۷۸
(۳۸) مانک راؤ وٹھل راؤ، بستانِ آصفیہ، جلد اول، حیدر آباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ۔ ۶۸۲
(۳۹) ڈاکٹر انور الدین، مقالہ حیدر آباد میں علمی وادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، صفحہ۔ ۱۵۱
(۴۰) ڈاکٹر انور الدین، مقالہ حیدر آباد میں علمی وادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، صفحہ۔ ۱۵

(۴۱) ڈاکٹر انورالدین، مقالہ حیدرآباد میں علمی وادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، صفحہ۔۱۵۴
(۴۲) عبدالقادر سروری پروفیسر، مضمون حیدرآباد کی علمی سرگرمیاں، سالنامہ رہبر دکن۔ ۱۳۴۳، صفحہ۔۵
(۴۳) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو دہلی ۱۹۷۸ء، صفحہ۔۶۱۲
(۴۴) ڈاکٹر انورالدین، مقالہ حیدرآباد میں علمی وادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، صفحہ۔۱۶۱
(۴۵) غلام صمدانی گوہر، تزک محبوبیہ، جلد اول، حیدرآباد، صفحہ۔۳۸۷
(۴۶) سخاوت مرزا، نگار داغ نمبر۳، ۱۹۵۳ء، صفحہ۔۳۵
(۴۷) تذکرۃ الاولیائے ابوالعلائیہ، صفحہ۔۶۰
(۴۸) غلام صمدانی گوہر، تزک محبوبیہ، جلد اول، حیدرآباد، صفحہ۔۲۱۵، صفحہ۔۱۹۴
(۴۹) غلام صمدانی خاں گوہر، دربار آصف، حیدرآباد، ۱۳۰۱ھ، صفحہ۔۱۱۶، ۱۱۷
(۵۰) غلام صمدانی خاں گوہر، دربار آصف، حیدرآباد، ۱۳۰۱ھ، صفحہ۔۱۹۱
(۵۱) مہاراجہ کشن پرشاد شاد، گلدستہ محبوب الکلام نمبر۵، جلد سوم، حیدرآباد ۱۳۱۸ھ، صفحہ۔۳
(۵۲) مہاراجہ کشن پرشاد شاد، گلدستہ محبوب الکلام نمبر ۹، حیدرآباد ۱۳۲۲ھ، صفحہ۔۷
(۵۳) مہاراجہ کشن پرشاد شاد، گلدستہ محبوب الکلام، جلد دہم، حیدرآباد ۱۳۲۳ھ، صفحہ۔۱۱۰
(۵۴) مہاراجہ کشن پرشاد شاد، گلدستہ محبوب الکلام، صفحہ۔۱۰۰
(۵۵) مہاراجہ کشن پرشاد شاد، گلدستہ محبوب الکلام نمبر۹، جلد دوم، حیدرآباد ۱۳۱۷ھ، صفحہ۔۲، ۳
(۵۶) غلام صمدانی خاں گوہر، دربار آصف، حیدرآباد، ۱۳۰۱ھ، صفحہ۔۱۱۶، ۱۹۷
(۵۷) غلام صمدانی خاں گوہر، دربار آصف، حیدرآباد، ۱۳۰۱ھ، صفحہ۔۱۱۶، ۲۰۹
(۵۸)(۵۹) تذکرہ ذاکرین، حیدرآباد، صفحہ۔۱۰۹
(۶۰) عبدالجبار خاں ملکاپوری محبوب الزمن، جلد اول ۱۳۲۹ھ، صفحہ۔۱۵۷
(۶۱) غلام صمدانی خاں گوہر دربار آصف حیدرآباد ۱۳۰۱ھ، صفحہ۔۲۰۹
(۶۲) تذکرہ ذاکرین، حیدرآباد، صفحہ۔۱۱۰
(۶۳) عبدالجبار ملکاپوری، محبوب الزمن، جلد اول۔ ۱۳۲۹ھ، صفحہ۔۱۵۷

☆☆

معاصرینِ داغ دہلوی

الطاف حسین احمد آزاد

نام الطاف حسین احمد اور تخلص آزاد تھا۔ آزاد کی ولادت ۲۷/ رجب ۱۲۸۸ ھ م ۱۸۷۰ء میں سہارنپور (یو۔ پی) میں ہوئی۔ آزاد کے والد محمد حسین نے ابتدائی تعلیم وہیں دلوائی بعدازاں انہوں نے عربی فارسی میں مہارت حاصل کرلی۔ نوجوانی میں طب کی سند حاصل کر کے دہرادون میں اپنا ذاتی مطب کھول لیا مگر زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ مطب بند کر کے عہد محبوبیہ میں حیدرآباد آ گئے۔ حیدرآباد میں حکمت شروع کی۔ اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ آزاد نے ہفتہ وار اخبار ''الاعظم'' جاری کیا جو کچھ دن کے بعد بند ہو گیا۔ آزاد کا انتقال ۱۹۴۰ء میں حیدرآباد میں ہوا۔ (۱)

شاعری کا شوق جناب آزاد کو کم عمری ہی سے تھا۔ حالی کی مقدمہ شعر و شاعری متاثر تھیں کہ حالی سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں اپنا کلام پڑھتے تھے۔ مہاراجہ شاد کے مشاعروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ ''معارف جمیل'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ان کے دوست تراب علی باز کے اصرار پر انہیں کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

جناب آزاد کے کلام میں تمام اصناف سخن پائے جاتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، نعت و حمد اور موضوعاتی رباعیات پر طبع آزمائی کی ہے۔ نمونہ کے طور پر غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھر دل میں یاس و حسرت و ارماں کا جوش ہے
پھر دل کی آرزو ہے کہ گم کردہ ہوش ہے

یہ جلوۂ جمال، یہ موسیقی، مقال
القصہ وقت فیصلۂ چشم و گوش ہے

حال تلاطم غم الفت نہ پوچھئے
اک بحر ہے کہ آٹھ پہر گرم جوش ہے

جاں اب بھی جسم میں ہے مگر مثل خار جسم
سر اب بھی دوش پر ہے مگر بار دوش ہے

آزاد اور فکر پس و پیش سب غلط   آزاد فارغ غم فرداو دوش ہے

موضوعاتی رباعی — رحلت ممتاز

اے فرقت ہمراز قیامت ڈھا دی   اے رخصت و مساز قیامت ڈھا دی
سو رنج و محن اور اکیلا آزاد   اے رحلتِ ممتاز، قیامت ڈھا دی

ماتم ہر دو استاد ان فن

پھر چارہ اغلاط غزل ہی نہ ملا   پھر رفع نقائص کا محل ہی نہ ملا
پھر حسرت اصلاح بر آہی نہ سکی   پھر حالی و بیدل کا بدل ہی نہ ملا (۲)

☆☆

(۱) صاحب حیدرآبادی۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔ حیدرآباد، ۱۹۸۴ء صفحہ (۷۰)
(۲) صاحب حیدرآبادی۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔ حیدرآباد، ۱۹۸۴ء صفحہ (۷۰)

محمد عبدالمجید آزاد

نام محمد عبدالحمید اور تخلص آزاد تھا۔ آزاد کی ولادت ۱۲۶۹ھ حیدرآباد میں ہوئی۔ سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے اور والدہ کی طرف سے حضرت ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے ۱۸۷۵ء کے غدر کے بعد آزاد کے والد شیخ شجاعت حسین حیدرآباد تشریف لائے۔ محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے۔ آزاد کی تعلیم وتربیت اپنے والد کی سرپرستی میں ہوئی، انہوں نے فارسی، عربی، اردو میں مہارت حاصل کی اور وکالت کا امتحان کامیاب کر کے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ اور اپنی ذہانت کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی۔

شاعری میں آزاد حضرت داغ کے شاگرد تھے۔ آزاد کا کلام نہایت صاف اور معاملہ بندی سے آزاد تھا۔ انہوں نے اپنے دور میں بہت شہرت حاصل کی۔ اس عہد کے چند تصانیف میں آزاد کا کلام دستیاب ہوتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر درج ہیں۔

کیا کہتے ہو کیا ہوگا گر روز جزا ہوتا ۔۔۔ ہم داد طلب کرتے اس وقت مزا ہوتا
آئے بھی تو کیا آئے ہیں آتے ہی گھبرائے ۔۔۔ کچھ تم نے کہا ہوتا کچھ مجھ سے سنا ہوتا
آزاد جفا سے بھی ہاتھ اس نے اٹھایا اب ۔۔۔ کم بخت مگر تو بھی دنیا سے اٹھا ہوتا

دیگر غزل کے چند شعر

کیا جذب محبت میں اثر ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جو چاہے وہ ہوتا ہے مگر ہو نہیں ہوسکتا
دشوار کسی طرح نہیں ان کی خوشامد ۔۔۔ یہ کام ہے آسان مگر ہو نہیں سکتا
لڑکپن میں رہتا تھا جو سادگی سے ۔۔۔ وہ کافر غضب کا طرح دار ہے
ہے عشق کا کامل کوئی تو یہ پوچھیں ۔۔۔ حسینوں میں کوئی وفادار ہے
کبھی مدعا دل کا آزاد اس سے ۔۔۔ جو اک بار نکلا وہ سو بار ہے

☆☆

جناب گورسرن بیلی آزادتوکلی

نام گورسرن بیلی تھا۔آزادتخلص فرماتے تھے۔آزاد کی پیدائش ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۳ء میں اودھ میں ہوئی۔آزاد کے والدرائے راج اوج بھی شاعر تھے۔آزاد کی ابتدائی تعلیم اودھ میں ہوئی۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیگر شعراء کی طرح ''عہدِ محبوبیہ'' میں حیدرآباد آئے۔ حیدرآباد کے کائیستھ گھرانے میں شادی کی۔جناب آزاد کے چچامہابلی انور بھی مشہور شاعر گزرے ہیں۔جناب آزاد نے ستر سال کی عمر میں ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی۔

شاعری میں جناب آزاد ضامن کنتوری کے شاگرد تھے۔شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔آزاد خاندانی شاعر تھے۔آزاد کے داداتوکلی بھی شاعر تھے۔آزاد نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کی شاعری کے بارے میں خودان کے استادِسخن ضامن کنتوری لکھتے ہیں۔

آزاد آزاد ہے۔آزاد کا کلام آزاد کے دل کی آواز ہے۔عارض نہیں،خال نہیں، گیسونہیں،کاکل نہیں،لفظی گورکھ دھندانہیں۔بیان میں ایچ پیچ نہیں۔حقائق کا گنجینہ ہے۔تعلیم وہدایت کا آئینہ ہے(۱)

جناب آزاد کے دوقلمی دیوان کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔

جناب آزاد کی شاعری میں حمد،نعت،قصیدہ،رباعی،غزل اورتمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ایک شعرحمد کا ملاحظہ ہو۔

ہر ذرہ کونین ہے گھر ذات خدا کا
بے جا ہے یہاں ذکر خلاء اور ملا کا

آزاد کی غزل میں بلا کی شوخی ہے۔نمونہ کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ممکن نہ تھا کہ چیر کے دکھلائیں دل تمھیں
قطرہ لہو کا اک سر مژگاں بنا دیا
یہ بھی پھرا ادھر کو جدھر کو نگہہ پھری
دل کو نگاہ یار نے چوگاں بنا دیا

جناب آزاد کی نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

راضی کسی طرح پہ کریں گے ہم اپنا دل
وعدہ ملے جو چین کا ہم کو قضا کے بعد

جناب آزاد نے خیام کی فارسی رباعیات کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

آنکھوں میں جو اپنے رہگذر رکھتا ہے
ہر شاہ و گدا اس پہ نظر رکھتا ہے
جویانِ دریا غواص اور گوہر خود ہے
اس بات کے تہہ کی وہ خبر رکھتا ہے (۲)

جناب آزاد فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ان کے اردو دیوان میں حمد، نعت اور سعدی شیرازی کی فارسی غزلوں کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔آزاد نے کئی قصیدے بھی لکھے ہیں۔جن میں قابل ذکر مہاراجہ کشن پرشاد کی مدح میں لکھا ہوا قصیدہ ہے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

پیش کرتے ہیں جواہر بارگاہ شاد ہیں
مثل معدن جوہر اگلے کیوں نہ کانِ آفتاب

اس کے علاوہ آزاد نے کئی موضوعاتی نظمیں بھی اپنی شاعری میں یادگار چھوڑی ہیں جیسے چوڑیاں، بسنت، کشمیر، پھاگن، گوداوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔آخر میں ان کے دو قطعات ملاحظہ ہوں جو دیوان کے طبع ہونے کی خوشی میں لکھا گیا ہے۔جناب وائسرائے وہمی نے تاریخی قطعہ لکھا ملاحظہ ہو۔

آزاد کا دیوان جب فضل خدا سے چھپ گیا
کہنے لگے نقاد فن گنجینہ عرفاں ہے یہہ
وہمی نے سال عیسوی طوطی کے لب سے یہ سنا
خمخانۂ اہل ادب گلدستۂ دیواں ہے یہہ
۱۹۳۸ء

آزاد کے ایک دوست محمد علیم الدین علیم نے تاریخی قطعہ لکھا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کہہ دے تو سال طباعت اے علیم   بے بدل خمخانۂ آزاد ہے(۳)
۱۳۵۷ھ

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکھنی ہندو اور اردو۔ حیدرآباد ۱۹۵۷ء، صفحہ۔ ۱۰۱
(۲) گورسرن لل آزاد دیوان "خمخانہ" مرتبہ محمد شمس الدین خان حیدرآباد، ۱۳۴۸ فصلی، صفحہ۔ (۲)
(۳) گورسرن لل آزاد توکلی خمخانہ مجموعہ کلام آزاد۔ حیدرآباد، ۱۳۴۸ فصلی، صفحہ۔ (۲۱۱)

نواب مرزا اسد علی خاں آصفی

نواب میر اسد علی خاں نام اور تخلص آصفی تھا۔ ۷ ربجمادی الاول ۱۲۷۱ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد غلام حسین خاں صفدر جنگ حسام الدولہ فخر الملک تھے۔ آصفی ۱۲۷۸ھ میں یتیم ہو گئے۔ ان کے سر سے والد کا سایہ اٹھ جانے کے بعد ان کے بڑے بہنوئی نواب سالار جنگ اول نے ان کی پرورش کی اور قابل اساتذہ سے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی تعلیم کا بندوبست گھر پر کر دیا۔ فن خوشنویسی میں بھی انہوں نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ ۱۲۹۱ھ میں آصفی محکمۂ جاگیرات سے وابستہ ہو گئے۔ آصفی کو عمر شباب میں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی اور بہت جلد اس فن میں مہارت حاصل کی۔ علم عروض میں بھی انہیں دخل تھا۔ آصفی کے قلمی دیوان میں ایک غزل ایسی ملتی ہے جس میں انہوں نے اپنا تخلص اسد باندھا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

جوانی گئی پیری آئی اسد   یہ درد جوانی ہے پیری نہیں (۱)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابتدا میں انہوں نے اسد تخلص استعمال کیا مگر بعد میں سلطنت آصفیہ کی وفاداری کے جذبہ کے تحت انہوں نے آصفی تخلص استعمال کیا۔ ان کا کلام پاکیزہ ہے ان کے اشعار نصیحتوں کا مجموعہ ہیں۔ انہوں نے اس دار فانی سے کبھی دل نہ لگایا ان کے اشعار میں دنیا کی بے ثباتی کا بیان ملتا ہے۔ بری صحبتوں کی خرابیوں کو انہوں نے اپنے کلام کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ آصفی اہل بیت سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ آصفی کے دیوان میں سلام، رباعی، مرثیہ، نوحہ اور قصائد ملتے ہیں۔ ذیل میں ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ایک دن خاک میں ملتا ہے ضرور
شوکت و شان نہ دکھلائے گا

محو تھا قصر بنانے میں بہت کچھ منعم
کیا خیال لحد اس کو دم تعمیر نہ تھا

آصفی چونکہ خاندان اثناعشری سے تعلق رکھتے تھے اس لئے بیت الاطہار سے انہیں محبت اور دلی عقیدت تھی۔اس کا اظہار آصفی کے ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے۔

یہ اشعار اس واقعہ کا اظہار کرتے ہیں جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے مدینے سے سفر کا عزم کیا تھا۔آصفی نے اپنے ایک مرثیہ میں اس کیفیت کی تصویریوں کھینچی ہے۔ملاحظہ ہو۔

گھر سے جب بہر سفر حضرت شبیر چلے
سر کٹانے کے لئے مالک تقدیر چلے
روتے اور پیٹتے سب صاحب تطہیر چلے
کہا صغرا نے کہ ہے ہے شہ دلگیر چلے

آصفی نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ان کا ایک قصیدہ جو حضرت فاطمہ زہرا کی ولادت پر لکھا گیا ہے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

جاچکا دورِ خزاں باغ میں آئی ہے بہار
پھول پیدا ہوئے ہر خار میں پھولا گلزار
ایک اک نخل پہ گلزار کے ہیں سینکڑوں پھول
ایک اک شاخ پہ بلبل نظر آتے ہیں ہزار
گدگداتی ہے انہیں باد بہاری آ کر
پھول اس وجہ سے ہنستے ہیں چمن میں ہر بار۲

☆☆

(۱) سید عباس حسین نقوی مشمولہ مرقع سخن جلد دوم ڈاکٹر زور حیدرآباد ۱۹۳۷ء صفحہ (۱۷۳)
(۲) ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ (۱۷۶)

جناب لطیف احمد اختر

نام لطیف احمد اور تخلص اختر تھا۔اختر کی ولادت ۱۲۸۷ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والد حضرت امیر مینائی کے آپ تیسرے فرزند تھے۔اختر کے تاریخی نام "بلند اختر" سے سن ولادت نکلتی ہے۔اختر کی تعلیم وتربیت اپنے والد کی سرپرستی میں لکھنؤ میں ہوئی۔ عربی فارسی اور علوم متداولہ سے فارغ ہوکر انہوں نے ملازمت محکمۂ داخلہ میں مددگار کی حیثیت سے حیدرآباد میں شروع کی اختر کے والد کی وجہ سے یہ عہد اختر کو حاصل ہوا۔اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ان کے ایک ہی فرزند محمد احمد گزرے ہیں۔

شاعری میں اختر اپنے والد سے ہی مشورہ سخن حاصل کرتے تھے۔ان دنوں حضرت امیر مینائی کی شہرت سارے ہندوستان میں تھی۔ان کی آغوش میں پلنے والا طفل بھلا کیسے دوسرے استاد سخن سے اصلاح حاصل کرتا۔اختر کا کلام فصاحت و بلاغت سے بھرا ہوا تھا۔ان کی زبان صاف مگر شیریں ہے۔اختر جناب جلیل مانک پوری کے ہم عصر شاعر تھے۔انہوں نے فارسی میں طبع آزمائی کی اور اردو میں ایک دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے۔انہوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ذیل میں قصیدہ کے دو بند پیش کیے جاتے ہیں(۱)

دکھا دے آج اے اختر کہ جودت ایسی ہوتی ہے
سخنور اس کو کہتے ہیں طبیعت ایسی ہوتی ہے
ثنا ہو شاہ آصف کی اور ایسی ہو کہ سب کہہ دیں
بلاغت نام اس کا ہے فصاحت ایسی ہوتی ہے

غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

ہائے کیا وصل میں برسات مزا دیتی ہے — جو گھٹا آتی ہے کچھ رات بڑھا دیتی ہے
میری تربیت پہ نسیم سحری آ آ کر — شمع گل کرتی ہے اور پھول چڑھا دیتی ہے
دردِ دل سن کے وہ اختر کا یہ فرماتے ہیں — ہاں کہو پھر یہ کہانی کہ مزا دیتی ہے

☆☆

(۱) عبدالجبار خان ملکاپوری محبوب الزمن جلد اول حیدر آباد ۱۳۲۹ھ، صفحہ (۲۵۲)

سید جلال الدین اشک لکھنوی

نام سید جلال الدین حیدر اور تخلص اشک تھا۔ سادات گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کے والد حضرات میر شمس الدین حیدر تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت سیدنا امام جعفر صادق سے جاملتا ہے۔ اشک کی ولادت ۱۲۵۹ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اشک کے والد میر شمس الدین حیدر، راجہ چندولال شاداں کی مدارالمہامی کے زمانہ میں حیدرآباد تشریف لائے اور دربار آصفیہ سے دوسو روپیہ ماہوار منصب سے سرفراز ہوئے اشک کی تعلیم و تربیت ان کے والد کی سرپرستی میں ہوئی۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ تعلیم کے بعد اشک کی گزر معاش دربار آصفیہ کی منصب سے ہوئی۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں تھی آپ کا وصال ۱۱ر محرم ۱۳۰۹ھ کو ہوا (۱)۔ وصال کے بعد آصفجاہ سادس نے ان کی بیوہ کو وہی منصب جاری رکھی۔

شاعری میں اشک کو شیخ محمد بخشی شہید لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ انہیں اپنے استاد سے بیحد عقیدت تھی۔ اشک کا دیوان "تاریخی دستور الشعرا" فارسی میں شائع ہوا۔ اردو دیوان کا پتہ نہیں۔ کلام کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کعبۂ و دیر کی رہے گردش　　یار مل جائے گا کہیں نہ کہیں
اشکِ خوں ہیں ہمارے طوفاں خیز　　ٹپکے تر ہو کے آستیں نہ کہیں

جناب اشک لکھنوی کی ایک غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

نظر آتے ہی نہیں وصل کے ساماں دل میں　　حسرتیں پھاڑتے ہیں آ کے گریباں دل میں
حال کھلتا نہیں کس بات پہ یہ جھگڑا ہے　　اور آپس میں لڑا کرتے ہیں ارماں دل میں
بت کافی کی طرف کھنچ رہی ہے الفت　　اپنا سر پیٹ رہا ہے یہاں ایماں دل میں

کچھ عجب طرح سے فرحت میں بسر ہوتی ہے
آرزو پٹتی ہے اور روتے ہیں ارماں دل میں

اشک دھیان آتا ہے اس گل کا جو مانندِ نسیم
حسرتوں کی مری کھل جاتی ہیں کلیاں دل میں (۱)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خان گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ہفتم حیدر آباد ۱۳۱۹ء، صفحہ (۱۰)

محمد اشرف۔ اشرف

نام محمد اشرف اور تخلص اشرف تھا۔ آپ کی ولادت الہ آباد میں ہوئی۔ زمانہ پیریٔ میں حیدرآباد آئے اور باقی زندگی یہیں گزاری۔ حیدرآباد آنے کے بعد حضرت جلیل سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ آپ کا ایک دیوان ''اخلاق الاشرف'' کے نام سے ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا۔ اشرف ''ماجرائے دل'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ ''میں باضابطہ شاعر نہیں ہوں اور نہ شاعری کا پیشہ کرتا ہوں۔'' اشرف حیدرآباد میں (۱۶) سال حیات رہے ۱۳۶۰ھ میں وفات پائی (۱)

نمونے کے طور پر چند رباعیات درج کی جاتی ہیں۔

اشرف کی رباعیوں کا کیا ہے کہنا ہے چار طرف انہیں کا ڈنکا بجتا
ہر ایک رباعی ہے سراپا مملکت اشرف کا کلام کیوں نہ اشرف ہوگا

منقبت

ہر خویش و اقارب سے قرابت توڑی سب ملک وطن دولت و ثروت چھوڑی
صدیق کے ایثار و کرم ہیں روشن ہر جہل نے آنکھ حاسدوں کی پھوڑی

واردات عشق

تلخابۂ غم نوش جو دن رات کرے دل کو ہدف ناوک حالات کرے
کیا حال کہے گریہ طوفانی میں جو غرق ہو سیلاب میں کیا بات کرے

☆☆

(۱) صاحب حیدرآبادی۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔ حیدرآباد ۱۹۸۴ء، صفحہ ۵۷، ۵۸

مرزا غلام سجاد اشہرؔ

نام مرزا غلام سجاد اور تخلص اشہر تھا۔ اشہر ۱۲۵۶ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اشہر کے جداعلیٰ مرزا اصلان جنگ خاں سیر وتفریح کی غرض سے بعہد قطب شاہی دکن تشریف لائے اور بادشاہ وقت کے حضور میں حاضر ہوئے۔ علی قابلیت کے سبب خان بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد مملکت آصفیہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے (۱)

اشہر پانچ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی انہوں نے عربی فارسی کے قابل اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ مولوی سید محمد علی نجفی سے علوم متداولہ کی تعلیم پائی۔ اشہر صوم وصلوۃ کے پابند تھے اور محرم الحرام میں ان کے والد کے گھر مجلس منعقد ہوتی تھی۔ ابتداء میں مدرسہ دارالعلوم کی مددگاری پر اشہر کا تقرر ہوا بعد میں محکمۂ مال سے وابستہ ہوگئے اور یہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔ اشہر کٹر شیعی المذہب تھے۔ اشہر کے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے اشہر کے صرف ایک فرزند نے آپ کا نام روشن کیا جو مرزا جواد وکیل ہائیکورٹ تھے۔ اشہر کی تمام لڑکیاں ریاست آصفیہ کے امرا اور جاگیرداروں کے خاندانوں میں بیاہی گئیں۔ وظیفہ پر علیحدگی کے بعد (۶۵) سال کی عمر میں ۱۳۲۱ھ میں انتقال ہوا۔

ناجی شاعر نے آپ کی وفات پر قطعہ تاریخ تحریر کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

دو پارہ ہے جگر تیغ الم سے　　گیا لطف حیات اشہر کے ہمراہ
یہ ہے ناجی کے لب پر سالِ رحلت　　چھٹا بادل برس کا دوست صد آہ (۲)

۱۳۲۱ھ

اشہر کو بچپن ہی سے شعر وشاعری سے بڑا اُنس تھا۔ وہ اپنا کلام منشی تفضل حسین

عطا کو دکھلاتے تھے۔ عطاء حضرت فیض کے ہمعصر اور بڑے پر گو شاعر تھے۔ اشہر نے فارسی اور اردو میں شاعری شروع کی۔ فن تاریخ گوئی میں اشہر کو کمال حاصل تھا۔ دوسرے اصناف سخن کے علاوہ قصیدہ نگاری میں مہارت حاصل کی اور مرثیہ نگاری میں آپ کا جواب نہ تھا۔ ان کے ہمعصر دکنی شعرا میں سوائے ناجی کے کوئی ان کا مدمقابل نہیں تھا۔ وہ اپنے گہرے دوست ناجی کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شعر میں اس کا ذکر یوں فرماتے ہیں۔

جہاں میں اشہر ہوا ہے ناجی ترا مقابل نہیں ہے کوئی
ہے شاہ اقلیم نظم وہ بھی اور آسماں شعر کی زمیں کا

اشہر اساتذہ کی زمینوں میں غزل کہتے۔ تضمین لکھنے کی مہارت اس قدر ہوگئی تھی کہ اس کا شہرہ سارے ہندوستان میں تھا۔

حضرت رند کی غزل پر جو تضمین کی تھی اس کا ایک بند ذیل میں درج ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

کل بام پر تھے بہر تماشاہ وہ جلوہ گر
جو راہ سے جنازہ کا میرے ہوا گزر
لاشہ پہ میرے دور سے پڑتے ہی اک نظر
کوٹھے پہ وہ جو چھپ گئے تابوت دیکھ کر
ہم بھی کفن میں منہ کو چھپائے چلے گئے (رند)

اشہر کے مرثیے کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

جس وقت ہوچکا علم پاک جلوہ گر گردن اٹھا کے فوج پہ حضرت نے کی نظر
دیکھا کہ دست بستہ جو انان پر جگر باندھے سلاح جنگ کھڑے ہیں ادھر ادھر
اپنے مقام خاص پہ حق کا ولی نہیں
موجود ساری فوج ہے لیکن علیؑ نہیں (۳)

☆☆

(۱) مرزا محمد علی مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم حیدرآباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ (۱۲۷، ۱۲۸)
(۲) مرزا محمد علی مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم حیدرآباد ۱۹۳۷ء، صفحہ (۱۳۳)
(۳) ہاشمی نصیر الدین دکن میں اردو، نئی دہلی ۱۹۸۵ء، صفحہ (۵۵۸)

راجہ راجیشور راؤ اصغر

نام راجیشور راؤ اور تخلص اصغر تھا۔ آپ کی ولادت (۱۷۹۳ سا کا) میں ہوئی۔ خاندانی راجہ تھے۔ اصغر والی سمستان دومنکنڈہ کے جاگیردار تھے۔ آپ کے والد راجہ اوما پت راؤ مہابلونت راؤ خاندانی رئیس گزرے ہیں۔ جناب اصغر کی تعلیم وتربیت شاہانہ انداز میں راجاؤں، مہاراجوں کے شہزادوں کی طرح ہوئی۔ زمانے کے دستور کے مطابق اصغر نے ہندی، اردو، فارسی، عربی، تلنگی اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ معاشی طور پر خود مکتفی تھے اس لئے علم وادب کا شوق بہت تھا۔ راجہ صاحب اصغر شاعر بھی تھے۔ کامیاب نثر نگار بھی اور مترجم بھی تھے نہ جانے ان میں اور کیا کیا صفات تھیں۔ عہد محبوبیہ میں آپ نے اپنی نظم و نثر کا بڑا کارنامہ چھوڑا ہے(۱) ذیل میں ان کی تصانیف کی فہرست دی جاتی ہے:

(۱) محبوب الاخلاق (۲)۔ حدیقۃ الاخلاق (۳) گلبن دانش (۴) گلزار دانش (۵)۔ ریاض کشف الاسرار (۶) ہدیۃ الملوک (۷)۔ مفتاح العارفین (۸) تاریخ ہند (۹)۔ تاریخ جہانگیری (۱۰) طبقات اکبری (۱۱)۔ معالجات الکلب (۱۲) تشریح الفردوس (۱۳) انتخاب بہاردانش (۱۴) انتخاب انوار سہیلی (۱۵) کارنامہ (ترجمہ جنگ عامہ) (۱۶) نجم اللغات (۱۷)۔ مفتاح اللغات (۱۸)۔ افسر اللغات (۱۹) گنجینۂ لغات (۲۰) مجمع الالفاظ (۲۱) فرہنگ فارسی (۲۲) فرہنگ عربی جدید (۲۳) فرہنگ الفاظ ہندی (۲۴) تصحیح الاغلاط (۲۵)۔ مصطلحات علمیہ انگریزی و اردو (۲۶) قران السعدین (۲۷) گنجینۂ امثال (۲۸) مجموعہ حزب الامثال (۲۹) گلدستہ مصوری (۳۰) رامائن اردو (۳۱) رامائن فارسی) (۳۲) آدھیاتمہ رامائن (۳۳) مہابھارت اردو (۳۴) فسانہ زہرہ فارسی (۳۵) فرحت کدہ آفاق (۳۶) الخط العثمانی (۳۷) کشکول اصغر (۳۸) قاموس الہند (۳۹) نغمۂ عنادل۔

وغیرہ قابل ذکر ہیں (۲)۔

جناب اصغر کی شاعری میں ہمیں حمد، نعت، منقبت، نوحہ، غزل، ریختہ، تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کے دیوان سے حمد کے اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

جدھر میں دیکھتا ہوں اس طرف اے جان جاں تو ہے
عیاں ان پر جو ہو جائے کہ ہر دل میں نہاں تو ہے
حریم دل میں ساکن ہے، مکین لامکاں تو ہے
حجر میں ہو، شجر میں ہو، ترا جلوہ نمایاں ہے
ہوا کیا سات پردوں میں جو آنکھوں میں نہاں تو ہے
تجھی پر لوگ مرتے ہیں، تجھی پر جان دیتے ہیں
برہمن دیر کو جائے، تو جائے شیخ کعبہ کو
شمیم گل تو ہی ہے اور رنگ بوستاں تو ہے
کہاں تک کر سکے اصغر بیان رنگینیاں تیری
فقط پردہ ترا ہے اور پردے میں نہاں تو ہے

جناب اصغر کے کلام میں موضوعات کا بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ شائد ہی کوئی موضوع ایسا ہوگا جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ زبان کی تحقیق سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ اسی شوق میں انہوں نے لغت نگاری کی طرف توجہ دی اور ہندی اردو، اردو ہندی لغات لکھے۔ ان کی غزل کے متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

گل سے بلبل کی خوش بیانی پوچھو
ذی فہم سے لطف نکتہ دانی پوچھو
خوشبو ہر ایک رنگ کی عطر سخن میں ہے
ہر پھول کی بہار ہمارے چمن میں ہے
وہ گلچیں ہیں کہ ہم باغِ سخن میں پھول چن چن کر
بنایا کرتے ہیں گلدستہ گل و بوں کی محفل کا
دل جس کا چاہے سیر کرے آکے دو گھڑی

دروازے سب کھلے ہوئے بیت سخن کے ہیں (۳)

پھرتا ہوں پھول کو گلشن میں سونگھتا
یارب گُل مراد مرا کس چمن میں ہے

جناب اصغر کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"راجہ راجیشور راؤ بہادر عہد محبوبیہ کے ایک پرگو مصنف ہیں آپ نہ صرف ایک نثار کی حیثیت سے پیش کئے جاتے ہیں بلکہ شاعری کا بھی خاصا ملکہ تھا۔" (۴)

نوٹ:۔ٹی زہری نے اصغر کی حیات اور ادبی خدمات کے موضوع پر ایم۔فل کی سند عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔

☆☆

---

(۱) زینت ساجدہ، حیدرآباد کے ادیب، جلد دوم، حیدرآباد ۱۹۶۲ء، صفحہ۔(۱۵۸)

(۲) راجہ راجیشور راؤ اصغر۔نغمۂ عنادل۔حیدرآباد۔۱۹۵۴ء، صفحہ۔(الف)

(۳) راجہ راجیشور راؤ اصغر۔نغمۂ عنادل۔حیدرآباد۔۱۹۵۴ء، صفحہ۔(ر،ز)

(۴) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی۔۱۹۸۴ء، صفحہ۔(۶۴۵)

مولانا سید اعظم اللہ حسینی اطہر

سید اعظم اللہ حسینی نام اور تخلص اطہر فرماتے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۸۹ھ کو ہوئی۔ آپ کے والد سید عبداللہ حسینی جاگیردار تھے۔ اطہر کے والد بھی قادر الکلام شاعر تھے اور حیدر علی خان سے تلمذ تھا۔ اطہر کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی آپ کے والد نے اطہر کے پہلے دینی تعلیم کا انتظام کیا اور تقریباً ۹ سال کی عمر میں آپ نے قرآن شریف کی تلاوت مکمل کر لی۔ اس کے بعد آپ کو جامعہ نظامیہ میں شریک کر دیا گیا۔ اطہر کی والدہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کر گئیں۔(۱) آپ کی عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی۔ آپ کے والد نے ۱۳۰۱ھ میں حج و زیارت اور مقامات مقدسہ کا ارادہ فرمایا اور اطہر کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ اس طرح اطہر بھی کم عمری میں حاجی ہو گئے۔ واپس آ کر آپ باضابطہ مدرسہ نظامیہ میں شریک ہو گئے اور انہیں اچھے اچھے اساتذہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا مثلاً استاد سید ابراہیم صاحب۔ مولوی عبداللہ خاں اور مولوی نظام الدین صاحب وغیرہ۔ یہ اساتذہ اپنے وقت کے ماہر تعلیم کہلاتے تھے۔ تین سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کے والد نے ۱۳۰۳ھ میں اطہر کو انگریزی تعلیم دلوائی کی اس کے بعد اطہر سخت بیمار ہو گئے۔ اور تقریباً چھ ماہ بیمار رہے۔ جب اطہر صحتیاب ہوئے آپ کے والد علیل ہو گئے علالت ایک عرصہ تک چلتی رہی آخر ۱۸ رذی قعدہ ۱۳۰۵ھ روز یکشنبہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اطہر کو والد کے انتقال کا سخت صدمہ ہوا اور تعلیم ترک کر کے فکرِ معاش میں لگ گئے اور بالآخر خزانہ عامرہ میں چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملازم ہو گئے۔

اطہر کو تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں تعلیم حاصل کرنے کے ارادہ سے مولوی عبیداللہ جاگیردار کی قانونی

کمیٹی میں شرکت کرلی اور قانونی سند حاصل کرلی۔اس کے بعد آپ کا نکاح شاہ سید عنایت اللہ حسینی صاحب کی دختر سے ہوگیا جن کے بطن سے دولڑکیاں اور ایک لڑکا تولد ہوئے۔اطہر ایک ایماندار اور سخت محنت کرنے والے انسان تھے۔انہوں نے ترقی کرتے کرتے صدر محاسبی پر ترقی پائی۔اطہر ۱۳۲۲ ف فصلی میں سخت علیل ہوگئے۔بیماری کی وجہ سے وظیفہ حاصل کرلیا۔ مگر پھر صحتیاب ہوگئے۔آپ کا دائرہ احباب کافی وسیع تھا۔اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے سید حیات الحسن ناظم عدالت پربھنی کے ساتھ مل کر وکالت شروع کی۔اچانک اطہر کا جوان لڑکا تھوڑی سی بیماری کے بعد انتقال کرگیا۔اطہر کو اس کا سخت رنج ہوا۔اس کی وجہ سے آپ کی شاعری پر گہرا اثر پڑا (۲) آپ نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جیسے غزل، حمد، نظم، نعت، منقبت، قصیدہ، رباعی، مخمس وغیرہ۔اطہر کا کلام ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔اس میں شاعرانہ محاسن وفصاحت، بلاغت، شکوہ الفاظ، سادہ سلیس زبان اور پاکیزہ خیالات ملتے ہیں۔آپ کے کلام کا ایک مجموعہ ''باغ فردوس'' کے نام سے شائع ہوا۔نمونے کے طور پر دو شعر درج کیے جاتے ہیں۔

کونین کا جلوہ مجھے ہر سو نظر آیا
سب رنگ نظر آگیا جب تو نظر آیا

حق اگر پوچھتے ہو تم اطہر
حق نعت کبھی ادا نہ ہوا

اطہر کی غزل کے چند اور اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

وہی اچھے رہے جو مرگئے پہلے طاہر
رنج دنیا نہ غم فرقت یاراں دیکھا

اس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
رنگ بدلا ہے کچھ زمانے کا

تڑپتے تڑپتے بسر ہوگئی
قیامت کی شب تھی سحر ہوگئے (۳)

دوسری غزل کے متفرق اشعار درج ذیل ہیں۔

مری صحرانوردی دیکھ کر وحشت بھی کہتی ہے
ابھی پیروں میں گردش ہے، ابھی قسمت میں چکر ہے

اطہر کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی ملتی ہیں جن کے موضوعات اصلاح معاشرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی رباعیات بھی کافی مشہور ہیں۔ بطور نمونہ ذیل میں ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

دیکھا اس دور کا تماشا دیکھا
اپنے بیگانے سب کو جانچا دیکھا
ہر جا پایا غرض غرض کا چرچا
جس کو دیکھا غرض کا دیکھا

دیگر

ہے عقل نہ علم اور ہنر پر موقوف
نیکی نہ شرافت نہ پدر پر موقوف
جتنے کہ مدبر ہیں وہ کہتے ہیں یہی
عزت ہے جو کچھ آج تو زر پر موقوف

☆☆

(۱) محمد فاروق حسین، مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور۔ حیدرآباد۔ ۱۹۳۷ء، صفحہ۔ ۲۴۵

(۲) محمد فاروق حسین، مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور۔ حیدرآباد۔ ۱۹۳۷ء، صفحہ۔ ۲۴۶

(۳) محمد فاروق حسین، مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر زور۔ حیدرآباد۔ ۱۹۳۷ء، صفحہ۔ ۲۴۷

ابوسعید سید احمد افسؔر

نام ابوسعید سید احمد اور تخلص افسر تھا۔ ۱۲۷۹ھ میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے اور والدہ کی طرف سے سلسلہ حضرت امام رضا تک جا پہنچتا ہے۔ آپ سادات نجیب الطرفین تھے۔ آپ کے اجداد مشائخ تھے۔ یہ سلسلہ پیری و مریدی افسر کے دادا حضرت سید شاہ محمد حسینی قادری سے وراثت میں ملا۔ افسر کے نانا حضرت سید تاج الدین نجفی اکابر اولیائے کوہیر میں سے ہیں۔ آپ کی کرامات علاقہ کوہیر میں آج بھی مشہور ہیں۔ سلطنت آصفیہ کی طرف سے عقیدہ کے طور پر وظائف اور جاگیرات نذر کی گئی تھیں۔ افسر نے عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی بچپن ہی سے تھی۔ کوہیر میں آپ کا ننہال ہونے کی وجہ سے مقامی زبان تلنگی سے واقف تھے۔ انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مجلس انعام میں صرف تیس روپے ماہوار سے ملازمت شروع کی۔ بعد ازاں ۱۳۰۴ھ میں افسر نے وکالت کا امتحان پاس کر کے ملازمت میں ترقی حاصل کی اور وظیفہ پر علیحدہ ہوگئے (۱) آپ کے صرف ایک فرزند سید سعید الدین حسینی تھے۔

شاعری کا شوق افسر کو شروع سے تھا۔ ''معاصرینِ داغ'' کے اکثر اصحاب شعر و شاعری کا شغف رکھتے تھے۔ نواب میر عباس حسینی سے تلمذ تھا۔ آپ کا مزاج مذہبی تھا۔ شاعری میں داغ دہلوی اسکول سے متاثر تھے۔ آپ کے کلام میں غزل، قصیدہ، رباعی، سلام، مرثیہ وغیرہ اصناف ملتی ہیں۔ ذیل میں بطور نمونہ غزل کے اشعار درج کئے جاتے ہیں:

ہے شوق کی افزائش الفت میں فنا ہونا
جاں سیکھتی ہے دل سے قربان ادا ہونا
وہ چاہتے ہیں غم ہو دشمن کی لگاوٹ کا
ہم سمجھیں گے فطری ہے بے وجہ خفا ہونا

☆☆

(۱) غلامی صمدانی خان گوہر ''تزکِ محبوبیہ'' جلد دوم دفتر شعرا حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ، صفحہ (۱۱)

33.2KB/s 3:10 85%

نواب معین الدین خاں اقبالؔ

نام نواب معین الدین خاں تھا۔ عظیم پاشاہ کے نام سے مشہور تھے۔ تخلص اقبال تھا۔ اقبال کے والد اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ اقبال کی ولادت ۱۲۵۸ھ میں ہوئی آپ کے والد سید قمر الدین حسین المعروف عزیز پاشاہ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ اور صاحب دل شخصیت تھے۔ آپ کے اجداد میں بہت سے حضرات زہد و تقویٰ کی وجہ سے مشہور تھے اقبال کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی سرپرستی میں ہوئی۔ مذہبی تعلیم گھر پر ہوتی رہی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اقبال صدر بلدہ بورڈ مقرر ہوئے۔ آپ کا خاندان مشائخ تھا اس لیے انہوں نے یہ ملازمت ترک کردی۔ نواب آصفجاہ سادس نے اقبال کو اپنے ولی عہد نواب میر عثمان علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ آپ کی اعلیٰ قابلیت سے متاثر ہوکر آصفجاہ سادس نے انہیں ۱۳۰۱ھ میں نواب معین الدین خاں بہادر اقبال بہادر جنگ (۱) کا خطاب دیا اور منصب سے سرفراز فرمایا۔ اقبال اعلیٰ درجہ کے ادیب اور شاعر تھے۔ آپ کے صرف ایک فرزند سید رحیم الدین خاں عرف شاہی بادشاہ تھے۔

جناب اقبال کو شاعری کا شوق پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوا۔ شاعری میں اپنے والد سے اصلاح سخن حاصل کرتے تھے۔ آپ کا کلام نہایت صاف و پاک ہے۔ کلام میں شوخی پائی جاتی ہے۔ نمونے کے طور پر غزل کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے۔

دیکھے جاں لعل لب یار کا بوسہ لیں گے — اتنی قیمت پہ بھی سودا یہ بمشکل ٹھہرا
باغ جنت میں بڑے لطف سے کٹ جائے گی — اپنا معشوق جو وہ حور شمائل ٹھہرا

گھر مرے آیا نہ وہ مہر درخشاں ابتک　　نہ ہوا اختر طالع مرا تاباں ابتک
ہے مرے قتل سے انگشت بدنداں ابتک　　بال کھولے ہوئے قاتل ہے پریشاں ابتک

نہ کیا حج نہ زیارت ہوئی اقبال نصیب
نہ مہیا ہوا بغداد کا ساماں ابتک (۲)

☆☆

(۱)　غلام صمدانی گوہر۔ تزک محبوبیہ جلد دوم۔ طبقہ امرا حیدرآباد۔ ۱۳۱۹ھ، صفحہ (۱۳)
(۲)　غلام صمدانی۔ تزک محبوبیہ جلد دوم۔ طبقہ امرا حیدرآباد۔ ۱۳۱۹ھ، صفحہ (۱۵)

جناب محمد اکبر علی اکبر

نام محمد اکبر علی اور تخلص اکبر تھا۔ اکبر کی ولادت ۳۰؍ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ میں بمقام اورنگ آباد ہوئی۔ آپ کے والد جناب محمد اسد علی اورنگ آباد میں انگریزی فوج میں میر منشی تھے۔ جناب اکبر کی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جناب اکبر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدرآباد منتقل ہوگئے۔ اور یہاں مدرسہ دارالمعلمین نامپلی میں شریک ہوئے۔ بعد میں انہوں نے دارالعلوم سے منشی عالم، منشی فاضل اور مولوی عالم، مولوی فاضل کامیاب کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کا ادبی مطالعہ دن بہ دن وسیع ہوتا گیا۔ علم کی جستجو میں ان کا دائرہ احباب بڑھنے لگا۔ تلاش معاش میں آپ صدر محاسبی میں ملازم ہوگئے۔ آپ کا عقد جناب ڈاکٹر مرزا اسحاق بیگ صاحب کی دختر شریفہ بیگم صاحبہ سے ۱۳۲۸ھ میں ہوا۔ جناب اکبر کثیر العیال تھے۔ چھ صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ راقم الحروف نے آپ کے صاحبزادے جناب مولوی مظفر علی صاحب مظفر سے انٹرویو حاصل کیا ہے (۱)

ان کا کہنا ہے کہ ''والد صاحب کے پہلے تین اولاد نرینہ بچپن میں فوت ہوگئے موجودہ اولاد میں محمد طاہر علی صاحب اور میں خود مظفر علی اور چھوٹے بھائی معظم علی باقی ہیں۔ دونوں بہنیں فرخندہ بیگم صاحبہ اور مبارک بیگم صاحبہ موجود ہیں۔ ابھی ایک سال قبل محمد معظم علی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ (۲)

جناب اکبر کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ حضرت عبدالقدیر صاحب سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ''عہد محبوبیہ'' کے زریں دور میں جناب اکبر کی خدمات کو اردو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آپ صرف شاعر ہی نہیں ایک اعلیٰ درجہ کے ادیب، نقاد اور

عظیم صحافی گزرے ہیں۔ان کی قابل قدر صحافتی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔آپ نے ایک رسالہ ''صحیفہ کے نام سے ۱۹۰۳ء سے جاری کیا۔اس رسالہ میں ''عہد محبوبیہ'' کے نامور شاعرادیب اور محققین کے مضامین اور نگارشات شائع ہوتے ہیں۔جناب تمکین کاظمی اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں۔

جناب اکبر قصر صحافت کے ایک ستون تھے۔تقریب ۴۰ سال تک صحیفہ چلاتے رہےاور بڑی عمدگی سے چلایا (۳)

جب حضور نظام نے کلکتہ اور دہلی کا سفر کیا تو جناب اکبر شاہی صحافی کی حیثیت سے ہم رکاب تھے۔سفر سے واپسی کے بعد سفر شاہانہ کا ایک روز نامچہ مرتب کیا۔جناب اکبر کے گھر پر ہر ماہ نعتیہ مشاعرہ پابندی سے منعقد ہوتا تھا۔مشاعرہ میں پڑھے جانے والے تمام کلام اپنے اخبار میں شائع کرتے تھے۔جناب تمکین کاظمی آپ کے اخبار کے رپورٹر تھے۔جب تمکین کاظمی اپنے والد کے ساتھ گلبرگہ میں تھے وہاں سے صحیفہ کے لئے دس سال تک رپورٹ پابندی سے بھیجا کرتے تھے۔

جناب اکبر عربی فارسی کے جید عالم تھے ان کی علمی قابلیت ان کی شاعری پر اثر انداز تھی طالب علمی کے زمانہ میں ایک عربی ناول ''السان الغاب'' کا ترجمہ اردو زبان میں ''جنگلی انسان کے نام سے شائع کیا تھا۔جو بہت مقبول ہوا۔اس کے علاوہ حیدرآباد میں سب سے پہلے ڈائرکٹری آپ ہی نے شائع کیا۔بعدازاں الہ آباد سے رحم علی ہاشمی نے اسے اسٹار ڈائرکٹری کے نام سے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا۔

شعرگوئی میں جناب اکبر کو کمال حاصل تھا۔آپ کا زیادہ تر کلام تلف ہوگیا۔چند کتابوں میں اور چند رسائل میں آپ کا چیدہ چیدہ کلام راقم کو بمشکل حاصل ہوا۔نعت گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ذکر میلاد کی بے شبہہ کرامت دیکھو
زینۂ عرش ہے اس بام کی رفعت دیکھو

کبھی اس بزم سے ہم سید ہے ارم میں پہنچے
کبھی آرام گھر شاہ اُمم میں پہنچے
تیرے حصہ میں تھی یہہ دولت سرمد اکبر
تیرے حالی تیرے یاور رہوں محمد اکبر(۴)

جناب اکبر نے نعت کے علاوہ غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کی غزل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے انہیں گھربار سے نفرت تھی گوشہ تنہائی پسند کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

جی میں آتا ہے کہ گھر چھوڑ دوں جنگل دیکھوں
میں گھروں میں نہ رہوں شیروں کے دنگل دیکھوں

جناب اکبر اس شعر میں دنیا سے اور زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اہل دنیا کو خبر کیا ہے میں کس حاصل میں ہوں
گرچہ جیتا ہوں مگر مدت سے کس مشکل میں ہوں
میں تو جل جاؤں مگر نور ہے ٹھنڈا اکبر
سایہ پیروں کا ترے ساتھ ہے حوض کوثر(۵)

☆☆

---

(۱) محمد مظفر علی صاحب مظفر مدیر صحیفہ ہفتہ وار اخبار، انٹرویو
(۲) محمد مظفر علی صاحب مظفر مدیر صحیفہ ہفتہ وار اخبار، انٹرویو، بتاریخ ۱۱ر مئی ۱۹۹۳ء
(۳) تمکین کاظمی مضمون مشمولہ رسالہ نقوش لاہور ۱۹۵۶ء، صفحہ (۱۳۸)
(۴) محمد مظفر علی صاحب مظفر مدیر صحیفہ ہفتہ وار اخبار انٹرویو، بتاریخ ۱۰ر مئی ۱۹۹۳ء
(۵) محمد مظفر علی صاحب مظفر مدیر صحیفہ، ہفتہ وار اخبار انٹرویو، بتاریخ ۱۰ر مئی ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر میر مہدی حسین الم

نام ڈاکٹر میر مہدی حسین تخلص الم کرتے تھے۔الم کی ولادت ۹ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کو حیدر آباد میں ہوئی۔ان کے والد میر ظفر علی خاں تھے۔الم کی تعلیم مدرسۂ دار العلوم میں ہوئی۔آپ نے میر کاظمی علی اور میر صادق علی سے فقہ اور مولوی حسو میاں سے منطق کی تعلیم حاصل کیا۔بعدازاں انہوں نے طب کی سند حاصل کیا۔فارسی میں عبدالعلی والا اور سید علی شوستری طوبی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے(۱)الم کے چار دیوان ہیں۔تین دیوان اردو کے۔اور ایک فارسی کا ہے۔دیوان میں ان کی اردو غزلیات،رباعیات،مخمسات، مسدسات،ترجیع بند،قطعات،غزلیات،سہرے،تواریخ تعریفات وغیرہ ہیں۔یہ دیوان بہت ضخیم ہے۔دوسرا دیوان جس کا نام''عقیدۃ الخلاصہ'' ہے اس میں اردو مرثیہ اور سلام ہے تیسرا دیوان ریختی کا ہے اس میں اردو غزلیات،رباعیات،قطعات،مناجات،مثنویات اور نوحے ہیں۔چوتھا دیوان فارسی میں ہے جس کا نام'ریاض فارسی'' ہے اس میں فارسی غزلیات رباعیات اور تواریخ ہیں۔الم کے دیگر تصانیف میں گلبن تاریخ(فن تاریخ گوئی) معاشرت رسالہ کی تالیف ہے الم بڑے مذہبی متقی خداترس صوم،صلوۃ اور قرآن مجید کی تلاوت کے پابند تھے ان کا دل نہایت صاف تھا۔ان کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جنہیں وہ اولاد کی طرح چاہتے تھے۔اور وہ اپنے استاد داغ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔

الم فطری شاعر تھے۔انہیں نوجوانی سے شعر کہنے کا شوق تھا۔وہ ایک پرگو قادر الکلام شاعر ہیں انہوں نے مرثیہ،سلام،قصائد اور رباعیات لکھی ہیں۔الم نے پانچ مرثیے بھی لکھے ہیں۔بشیر کی مدح میں چند شعر درج ہیں۔

کیا خبر تھی اے الم مداحِ شبیر سے   ہم صفیر بلبل شیراز تو ہوجائیں گے

نظم گر مدح شہنشاہ ولایت ہوجائے	شاعری کی مجھے لاریب امانت ہوجائے (۲)

الم کے ایک رزمیہ سے مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا میدان میں جنگ تشریف لانے اور حر کا امام حسین کی نصرت میں جہاد کے لئے جانے کا بیان ظاہر ہوتا ہے ملاحظہ ہوں چند شعر۔

مہمان کربلا کا جو وہ میہماں ہوا	دوزخ سے نکلا داخل باغِ جناں ہوا
ایسا بلند بخت کسی کا کہاں ہوا	یوسف سے بڑھ گیا کہ عزیزِ جہان ہوا
کیا تھا اور ایک آن میں کیا ہوگیا ہے حر	پڑھیے درود لایق صل علی ہے حر (۳)

الم نے ریختی کے بھی اشعار کہے ہیں۔ اس میں شوخی ظرافت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ چند اشعار درج ہیں۔

زندگی کا لطف ہے ہوتی رہے کچھ تاک جھانک
جی وہاں لگتا نہیں جس گھر میں نا محرم نہیں
لیکے سارا میرا زیور کردیا ننگی مجھے
جگمگاہٹ ہاتھوں میں پاؤں میں اب چھم چھم نہیں
میں خوشی سے کہتی ہوں کر لیجئے اور اک نکاح
آپ کی خدمت کا اب بندی میں صاحب دم نہیں
وہ گئے باہر کمر سے باندھ کر تلوار آج
ان کے آنے تک بوا میرے کو دم میں دم نہیں
کہہ رہا تھا آج شوہر کاٹے کھاتا ہے مکان
چار ہی دن سے تو گھر میں اے بوا بیگم نہیں

الم کے کلام میں الفاظ کی تکرار بھی نمایاں ملتی ہے۔

باہمہ شہرت باہمہ فطرت باہمہ حکمت اور صفر
ہے عالم گردابِ الم میں مضطر وحیران زار و پریشان

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا الم ایک پرگو تاریخ کے ماہر اور صاحب علی شاعر ہیں انہوں نے آصف جاہ سادس کی سالگرہ کے کئی قطعات تاریخ کہے ہے۔ الم کی خوبی یہ ہے کہ

مادے کے مصرع میں تقریب کا ذکر ہوا کرتا تھا ملاحظہ ہو۔

اس سالگرہ میں ہوئے جیسے جلسے ۔۔۔ تاحشر اسی طرح رہیں گے ہوتے
بالفعل یہ تاریخ الم نے کی عرض ۔۔۔ سلطان زمان کے سال پینتیس ہوتے

الم اپنے استاد داغ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ جب داغ کا وصال ہوا الم نے دل برداشتہ ہو کر نذرانہ عقیدت اس طرح ادا کیا۔

اے ستمگر اے جفا جو اے بد اختر اے فلک
ہیں تیرے تیور نرالے جور ہیں تیرے عجیب
ہائے استاد جہاں سہہ سہہ کے تیرے ظلم و جور
ہوگئے دار محل سے دور جنت سے قریب
روتے روتے مصرع تاریخ الم نے یہ کہا
بلبل ہندوستان جادو بیان جنت نصیب (۴)

۱۳۲۲ھ

الم کے گھر تین مرتبہ چوری ہوگئی۔ ان چوریوں سے الم پر بڑی مصیبت نازل ہوئی۔ اس کی دکھ بھری داستان کو انہوں نے پچاس بیت کی ایک مثنوی میں قلم بند کیا ہے۔ ذیل میں اس مثنوی کا ایک تاریخی شعر درج ہے۔

شکر ہے لٹ گیا دوبارہ مکان

۱۳۳۰ھ

الم محرم کے مہینے میں رخصت لے کر ۱۳۳۹ھ میں حیدرآباد تشریف لائے اور اربعین کے بعد جب دوبارہ گھر واپس ہوئے تو گھر میں کچھ باقی نہیں تھا۔ ان اشعار سے ان کا دلی صدمہ ظاہر ہوتا ہے۔

سال اس خانہ خرابی کا الم نے یہ لکھا
آہ ننگا کردیا ہے تیری چوری نے مجھے

۱۳۳۹ف

☆☆

.ıll .ıll 57.5KB/s 3:11 85%

حضرت سید نجم الدین صاحب المعی

حیدر آبادی

نام سید نجم الدین اور تخلص المعیؔ تھا۔ آپ کی ولادت ۱۱ر رجب الرجب ۱۳۰۰ھ کو حیدر آباد میں ہوئی۔ المعیؔ کے والد فرقۂ مہدویہ کے پیرو مرشد تھے۔ گھریلو ماحول سخت مذہبی تھا۔ اس لیے جناب المعیؔ نے بھی پیری مریدی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بعد میں حضرت سید اشرف صاحب شمسی سے عربی، فارسی کا درس لیا اور انگریزی میں بھی دست رس رکھتے تھے جناب المعیؔ کو نواب سرامین جنگ بہادر نے انگریزی کے مترجم پیشی حضرت آصف جاہ سابع کی خدمت پر رکھا تھا۔ مولانا المعیؔ بے حد متقی پرہیز گار بزرگ تھے۔ آپ کا وصال پچاس برس کی عمر میں ۱۳۵۰ھ میں ہوا۔

جناب المعیؔ کو شاعری کا شوق ابتدا جوانی سے تھا۔ آپ ''معاصرین داغ'' کے پر گو شاعر تھے جناب المعیؔ نے شاعری میں کسی سے اصلاح حاصل نہیں کی کبھی کبھی حضرت شمسی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ آپ کے کلام میں تصوف عرفان کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کا ایک دیوان ''تنویر خیال'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں ۹۶ رباعیات ملتی ہیں۔ جناب المعیؔ کی دو رباعیات ملاحظہ ہوں۔

عالم یہ مسافرت کا بازار ہوا ۔۔۔ کوئی جانے کوئی آنے تیار ہوا
اے المعیؔ سر میں بال آیا ہے سفید ۔۔۔ ہوشیار خطِ سحر نمودار ہوا(۱)

جناب المعیٔ کی دیگر رباعیات میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اصرار مناہی پہ نہ کر، توبہ کر رکھ اپنی حقیقت پہ نظر توبہ کر
اللہ کو بندے کی ندامت ہے پسند سو بار گناہ کر مگر توبہ کر

دیگر قطعہ

ایمان کی رسم و راہ سچ کیا ہے ہر حال میں ہم کو آہ سچ کیا ہے
بچوں کو بہت رنج دیا ہے سچ نے دنیا میں بڑا گناہ سچ کیا ہے

دیگر قطعہ

باطن کی لپیٹ کھول کر دیکھ لیا ہر شخص سے راست بول کر دیکھ لیا
ظاہر سے مطابقت نہ پائی ہم نے دل کو بہت ٹٹول کر دیکھ لیا

دیگر قطعہ

غافل کو سزا عار سمجھ کر بخشے غفلت میں گرفتار سمجھ کر بخشے
اے المعیٔ یہہ حوصلۂ بخشش دیکھ بندوں کو گنہ گار سمجھ کر بخشے

جناب المعیٔ اپنے عہد میں فرقۂ مہدویہ سے شایع ہونے والا رسالہ المصدق میں اپنی تخلیقات شایع کرتے تھے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کا بخار سامنے ان کے نکال کر
دیکھوں تو آج چاند پہ میں خاک ڈال کر
تیرے بغیر باغ میں کیا پھولتے ہیں گل
غنچے مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کر
اے المعیٔ عرض ہے میرے دشمنوں سے کیا
بیٹھے ہیں وہ تو گھر میرے قسمت کو گھال کر (۲)

☆☆

(۱) سید مظفر الدین خان صاحب، جنوبی ہند میں رباعی گوئی حیدرآباد ۱۹۸۳ء، صفحہ (۵٦)
(۲) رسالہ المصدق جلد اول شمارہ ۸ حیدرآباد شعبان ۱۳۴۲ھ (۳۱)

حضرت سید احمد حسین امجد حیدرآبادی

نام سید احمد حسین تھا اور امجد تخلص فرماتے تھے۔ امجد کی ولادت ۱۳۰۳ھ م ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد کے صوفی گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد حضرت سید عبدالرحیم صوفی اپنے وقت کے بزرگ برگزیدہ شخصیت تھے۔ امجد صغیر سنی میں اپنے والد کی شفقت سے محروم ہوگئے۔ امجد کی تعلیم تربیت اپنی حقیقی والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مذہبی نوعیت کی تھی۔ انہوں نے حافظہ بلا کا پایا تھا۔ پھر جامعہ نظامیہ میں استاد الملک آغا شوستری سے شافیہ و اسلامیہ پڑھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی فاضل اور مولوی فاضل میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ نوجوانی میں ابھی آپ اٹھارہ سال کے تھے کہ والد نے علامہ سید قادرالدین صاحب کی بیٹی جمال سلمٰی سے آپ کا عقد کر دیا۔ جب ذمہ داری کا بوجھ آپ پر پڑا ملازمت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ تلاش معاش میں حیدرآباد سے بنگلور گئے۔ وہاں ایک مدرسہ میں ملازم ہوئے۔ چند ماہ کے بعد ملازمت ترک کر کے حیدرآباد واپس تشریف لائے۔(۱) حیدرآباد کے مدرسہ دارالعلوم میں ایک عرصہ تک مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد میں صدر محاسبی میں ملازم ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے مددگار محاسب کے عہدہ پر پہنچ گئے اور وہیں سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔

حضرت امجد کو شاعری کا شوق کم عمری سے ہوا۔ ان کی زندگی کا سب سے درد انگریز واقعہ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی ہے۔ موسیٰ ندی میں آپ کا گھربار ساز و سامان آپ کی بیوی، بیٹی اور والدہ سب کے سب موسیٰ ندی کی نذر ہوگئے۔ حضرت امجد کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

حضرت امجد رباعی کے بہت مشہور و معروف شاعر تھے۔ ان کے عہد میں ہر خاص و

عام کی زبان پر آپ کی رباعیات تھیں۔ یہ سچ ہے کہ حضرت امجد خاندان صوفی سے تعلق رکھتے تھے مگر بحیثیت صوفی آپ کو صوفیوں سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ پیری مریدی کا شغل آپ نے اختیار نہیں کیا۔ پاکیزہ زندگی گزاری۔ امجد بااخلاق متین اور خاموش انسان تھے۔ آپ کی زندگی نہایت سادگی میں گزری۔ زندگی بھر کبھی کسی کا احسان نہیں لیا۔ کبھی کسی امیر کی ڈیوڑھی سے وابستہ نہیں ہوئے۔ حیدرآباد کے امراء جب آپ سے ملنے کے لئے ان کے گھر آتے تو امجد ان کی کوئی آؤ بھگت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ امیر وغریب ادنی واعلیٰ سے ایک طرح سے ملتے تھے اور ایک طرح کا برتاؤ کرتے تھے۔ نام ونمود کی خواہش نہیں تھی۔ صاحب تلاوت تھے اور صلوۃ وصوم کے پابند تھے۔ اکثر باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

حضرت امجد نے چند ابتدائی غزلیں جیب کنتوری کو دکھائیں۔ اس کے بعد انہوں نے کسی شاعر سے اصلاح کلام کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

حضرت امجد نے پہلی مرتبہ جو شعر موزوں کیا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

نہیں غم گرچہ دشمن ہوگیا ہے آسمان اپنا   مگر یارب نہ ہونا تو کبھی نامہربان اپنا (۲)

حضرت امجد کو اپنے گھر یار کے طغیانی کے نذر ہونے کا بہت غم تھا۔ چنانچہ اسی غم میں ۱۲/شوال ۱۳۸۰ھ م ۲۹/مارچ ۱۹۶۱ء کو انتقال فرما گئے اور حضرت شاہ خاموش کی درگاہ میں مدفون ہیں۔

حضرت امجد کی شاعری ''معاصرینِ داغ'' اور اس کے بعد ''عہد عثمانی'' کا یادگار نمونہ ہے آپ کی شاعری حسن وعشق گل وبلبل کے جھوٹے تذکروں اور بے سروپا خیالی کرشموں سے خالی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

نہ ذکر بلبل و گل ہے نہ داستانِ بہار
نہ وصف سنبل و ریحاں نہ مدح باد شمال
نہ کوئی لطف زباں ہے نہ خوبی مضمون
نہ حسن و عشق کا قصہ نہ شاعرانہ خیال

حضرت امجد کی زندگی میں ان کی شاعری نے وہ مقبولیت حاصل کی تھی کہ ان کے حیات ہی ان کے خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی نگرانی میں ادارہ

ادبیاتِ اردو کی جانب سے ان کی چالیس سالہ خدمات کے اعتراف ہیں "جشن الماس" نہایت اہتمام سے منایا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد برانچ کی جانب سے آپ کی شاندار خدمات کے اعتراف میں پانچ سو روپیہ پیش کئے گئے اور ایک توصیف نامہ عطا کیا گیا (۳)

حضرت امجد کی شاعری تین امور کے لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ ایک سادگی دوسری نازک خیالی اور تیسری شیریں کلامی۔ انہی تینوں خوبیوں کی بدولت حضرت امجد کی شاعری زندہ ہے۔ ایک نظم انہوں نے طغیانی رودِ موسیٰ کے واقعہ پر لکھی تھی جس میں ان کے تمام خاندان اور گھر کا سارا ساز و سامان رودِ موسیٰ کی نذر ہو گیا تھا۔ اشعار ملاحظہ ہو۔

پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی   پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی
مادر کہیں اور میں کہیں بادیدہ پر نم   بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی ہے دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم   کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرِ اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے   حیرت تھی کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

امجد کی غزلوں میں صوفیانہ خیالات اور فلسفیانہ افکار پائے جاتے ہیں۔ آپ کے ہر شعر میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر تھے۔ چند شعر درج ہیں ملاحظہ ہوں۔

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا   کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ہو چلی انتظار میں یہ عمر   کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں   دینے والا نظر نہیں آتا
زیرِ سایہ ہوں اس کے اے امجد   جس کا سایہ نظر نہیں آتا

حضرت امجد قرآن کریم کے آیات و احادیث کی تشریح بھی اپنے اشعار میں بہت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔

آیۃ الکریم: "وتعذمن تشاء وتزل من تشاء"

ہر ذرہ پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے   اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں   وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

امجد کی شاعری اور نثری تصانیف و تالیف کا ایک مختصر سا جائزہ پیش ہے۔

امجد کے یہاں جہاں شاعری کا وافر ذخیرہ ہے۔ وہیں نثری تصانیف بھی بڑی
تعداد میں ملتی ہیں شعری تصانیف کچھ اس طرح ہے (۱) ریاض امجد اس کے دو حصوں پر
مشتمل ہے حصہ اول ۱۳۳۷ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا اور حصہ دوم ۱۳۴۱ھ میں۔ یہہ
امجد کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں امجد نے دلچسپ واقعات کے ساتھ ساتھ
فطری احساسات اور کہیں ہندی دوہوں اور عربی اشعار اور حافظ شیرازی کے صوفیانہ کلام کی
دلکش نظمیں پیش کی ہیں۔ یہ اخلاق عالیہ کا ایک مخزن ہے (۲) ''نذر امجد'' نام سے ایک
کتاب تحریر کی یہ میلا امہ ہے۔ جس میں آنحضرت صلعم کی ولادت باسعادت اور ہجرت
کے واقعات کو مسدس کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔ مسدس کے (۴۱) بند ہیں۔ اس کے
اشاعت ۱۳۵۵ھ عمل میں آئی (۴)

(۳) ''خرقہ امجد'' امجد کی نظم نگاری کا ایک اور کمال خرقہ امجد میں نظر آتا ہے۔
اس کتاب کی ابتدا میں حضرت امجد نے اپنی نگارشات پیش کرنے کی وجہ تسمیہ بتلاتے ہوئے
اس بات کا اظہار کیا ہے (۴) ''رباعیات امجد'' رباعیات امجد حصہ اول ۱۳۴۴ھ میں شائع
کی اور حصہ دوم ۱۳۵۴ھ میں اور حصہ سوم ۱۳۷۵ھ میں۔ یہ تینوں حصے امجد کی رباعیات کی
جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ یہ رباعیاں اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان
ہی رباعیات کی وجہ امجد سارے ہندوستان میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے۔

ان کے نثری کارنامے کچھ اس طرح ہیں (۱) ''جمال امجد'' میں انہوں نے اپنی
دوسری بیوی جمال النساء کے بارے میں اپنے قلبی تاثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔
یہ نثری تصنیف گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ساری کتب حیرت انگیز تعلیم روحانی تزکیہ نفس اور
معرفت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کتاب کے چوتھے باب میں امجد نے رود موسیٰ کی طغیانی
اور اپنی زندگی میں اہل وعیال کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ جو ۲۸ر ستمبر ۱۹۰۸ء میں واقع ہوئی تھی۔
(۲) ''گلستان امجد'' نام سے ایک کتاب ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء میں شائع کی۔ یہ
فارسی ادب کی مشہور تصنیف ''گلستان سعدی'' کا ترجمہ ہے۔ اپنی سلامت اور روانی اور اثر
آفرینی کے اعتبار سے اس کا وہی مرتبہ ہے جو فارسی ادب میں ''گلستان سعدی'' کو حاصل
ہے۔ نظموں کو نثر میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ زبان فارسی کا سوز واثر اس میں آ گیا

ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

(۳) حج امجد کے نام سے ایک کتاب انہوں نے ۱۳۴۷ھ میں شائع کی۔ اس سفر نامہ میں امجد نے حج کی وجہ تحریک سے لے کر سفر کی ساری تفصیلات واپسی کے وقت تک تحریر کی ہے۔

(۴) ''پیامِ امجد'' نام سے ایک کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۳۶۷ھ میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۶۸ھ میں چھپا۔ پروفیسر رضی الدین صدیقی کا کہنا ہے کہ جس طرح سرسید احمد خان نے حالی کی مسدس کو اپنی طرف سے بارگاہ اقدس میں پیش کرنے کے قابل سمجھا تھا۔ اسی طرح میں بھی پیام امجد کی تحریک اور اس کی تعمیل کو اپنی تمام عمر کا کارنامہ سمجھتا ہوں (۵)

(۵) ''حکایاتِ امجد'' نام سے ۱۳۵۲ھ اور ۱۹۳۳ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کروایا اس میں انہوں نے اکیاسی (۸۱) عنوانات پر حکایات کے نام سے قرآن و حدیث کی روشنی میں نصیحتیں کی ہیں۔

(۶) ''میاں بیوی کی کہانی'' کے نام سے ۱۳۶۵ھ م ۱۹۳۶ء میں ایک مختصر سا رسالہ جاری کیا جس میں امجد نے ایک فرضی قصہ پیش کیا ہے جو ایک بد مزاج بے دین شوہر منکسر المزاج دیندار بیوی کی ازدواجی زندگی کی روداد ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے اس قصہ کے دوران اپنی متعدد رباعیات اور دو ایک نظموں کو شامل کیا ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ آخری حصہ میں چند قطعات بھی درج کئے ہیں۔

(۷) ''ایوب کی کہانی'' کے نام سے امجد نے دوسرا رسالہ جو ۱۳۶۷ھ م ۱۹۴۸ء میں شائع کیا اس رسالہ میں حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رباعیات درج کی ہیں۔

(۸) ''مکتوباتِ امجد'' کے نام سے ۱۳۴۵ھ م ۱۹۲۷ء میں نصیر الدین ہاشمی نے ایک کتاب شائع مکتوبات سادہ اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔

حضرت امجد نے شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے تصانیف میں تمام موضوعات شاعری ملتے ہیں۔ مگر انہیں ''رباعی کا شہنشاہ'' کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں صوفی ازم اور انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ آخر میں ان کی ایک

مشہور رباعی جو صوفی ازم کا انمول نمونہ ہے اور جس میں انہوں نے خدائی کا دعویٰ کر بیٹھنے والوں پر چوٹ کی ہے درج کی جاتی ہے۔

کثرت میں نظر آتی ہے وحدت دیکھو
اک بار یہہ فائدہ اقامت دیکھو
توحید فی الاعمال ہے گر مدنظر
مسجد میں صلوۃ بالجماعت دیکھو(۶)

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، امجد کی شاعری حیدر آباد، ۱۹۷۷ء
(۲) خواجہ حمید الدین شاہد، مضمون مرقع سخن جلد اول حیدر آباد ۱۹۳۵ء، صفحہ۔ (۳۳۹)
(۳) محمد جمال شریف، حیات امجد، صفحہ۔ (۲۲)
(۴) امتہ السلام عالمہ مقالہ آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء حیدر آباد، صفحہ۔ ۴۵۵
(۵) امتہ السلام عالمہ مقالہ آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء حیدر آباد، صفحہ (۳۹۴،۳۹۵)
(۶) محمد عثمان علی لکچرار مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی، حیدر آبادی حیات اور کارنامے، صفحہ (۳۱۰)

حضرت امیرؔ احمد مینائی

امیر احمد نام تخلص امیر تھا۔ آپ ۱۶؍شعبان المعظم ۱۲۴۴ھ میں دوشنبہ کے دن لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ امیر احمد مولوی شاہ عبدالرحمٰن لکھنوی کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملتا ہے۔ ابتداء میں قرآن شریف اور چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں مولوی مظہر علی سرور سے پڑھیں۔ بچپن میں ہی امیر کے والد کا انتقال ہوگیا آپ کے بڑے بھائی مفتی حسن نے جو اس وقت میر منشی تھے آپ کی پرورش کی اور اپنے اولاد کی طرح آپ کی دیکھ بھال کی۔ جب آپ سولہ برس کے ہوئے مفتی سعید اللہ صاحب مراد آبادی سے منطق وفلسفہ اور مولوی تراب علی لکھنوی سے علم وادب حاصل کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے فقہ اور اصول کا درس بھی حاصل کیا۔

طالب علمی کے زمانہ سے علم وادب وشاعری کا شوق تھا۔ امیر کو نوجوانی میں ہی شہرت ملنے لگی۔ امیر نے نواب محمد حسن بریلوی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ اپنی ذاتی محنت سے علم جفر بھی سیکھ لیا۔ امیر ۱۲۶۹ھ میں اودھ کے شاہی دربار سے وابستہ ہوگئے۔ آپ نے محکمۂ پیشی میں دوسو روپیہ ماہوار پر ملازمت اختیار کی۔ آپ کے اعلیٰ افسر اسیر لکھنوی مرحوم تھے۔ چند برس بعد ۱۸۵۷ء کے غدر میں امیر کی ملازمت جاتی رہی اور امیر بھی اوروں کی طرح لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ۱۲۷۵ھ میں نواب یوسف علی خان والی رام پور نے آپ کو طلب کیا اور اپنے پاس ملازمت دی اور بہت عزت سے آپ کی قدردانی فرمائی۔ سو روپیہ ماہوار پر عدالت دیوانی کا مفتی مقرر کردیا۔ امیر نے حضرت مخدوم مینائی سے بیعت حاصل کی تھی۔ اسی نسبت سے مینائی کہلاتے تھے۔ نواب یوسف علی خان اسیر لکھنوی کے بعد آپ ہی سے شعر وسخن کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس لئے بہت خاص نظر عنایت آپ پر

کی جانے لگی۔

نواب آصف جاہ سادس جب کلکتہ تشریف لے گئے تو واپس براہ بنارس ہوئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امیر نے بنارس میں باریاب ہو کر اک قصیدہ شاہ کی مدح میں پیش کیا۔ رام پور لوٹ کر تھوڑی ہی دنوں بعد حیدرآباد کا رخ کیا۔ بدقسمتی سے ایک ماہ کے اندر ۱۹/ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ حیدرآباد کو انتقال کر گئے۔ درگاہ یوسفین میں مدفن ہے۔

آپ نہ صرف شاعر تھے ایک کامیاب نثر نگار محقق اور ادیب کامل تھے۔ آپ کی مشہور تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے۔ چند اہم تصانیف ذیل میں درج کی جاتی ہیں (۱) مراۃ الغیب (۲) صنم خانۂ عشق (۳) محامد خاتم النبیین (۴) امیر اللغات یادگار کارنامہ ہے آپ کو پانچ لڑکے تھے جن کے نام یہ ہیں (۱) محمد احمد (۲) خورشید احمد (۳) لطیف احمد (۴) ممتاز احمد (۵) مسعود احمد۔

امیر کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ ان کے والد بھی شاعر تھے شاعری ورثہ میں ملی تھی پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے حضرت اسیر لکھنوی کو اپنا کلام دکھایا۔ اسیر مصحفی کے شاگرد تھے۔

امیر نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ بنارس میں شاہ آصف کی مدح میں جو قصیدہ پیش کیا تھا اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

سامنے کون ہے سلطان سلاطین جہاں　　سامنے کون ہے تاج سر تمکین جہاں
دانش آموز جہاں موجد آئین جہان　　رونق بزم جہاں مایہ تزئین جہاں
حامی دین نبی ظل خدا خلق پناہ
میر محبوب علی خان بہادر جم جاہ (۴)

غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

ہم لوٹتے ہیں وہ سو رہے ہیں　　کیا ناز و نیاز ہو رہے ہیں
کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں　　دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
میں جاگ رہا ہوں اے شب غم　　پر میرے نصیب سو رہے ہیں
روئینگے ہمیں رلانے والے　　ڈوبینگے وہ جو ڈبو رہے ہیں

زانو پہ امیر سر کو رکھے
پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں

☆☆

(۱) غلام صمدانی خان گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم حیدرآباد۔۱۳۱۹ھ، صفحہ۔(۲)
(۲) غلام صمدانی خان گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم حیدرآباد۔۱۳۱۹ھ، صفحہ۔(۲)
(۳) شاہ محمد ممتاز علی آہ امیر مینائی لکھنؤ ۱۹۳۱ء، صفحہ۔(۴۸)
(۴) شاہ محمد ممتاز علی آہ امیر مینائی لکھنؤ ۱۹۳۱ء، صفحہ۔(۱۳۴)
(۵) شاہ محمد ممتاز علی آہ امیر مینائی لکھنؤ ۱۹۳۱ء، صفحہ۔(۱۸۱)

میر حسن علی خان امیرؔ

نام میر حسن علی خان اور تخلص امیر تھا۔ امیر کی ولادت ۱۲۷۰ھ (۱) میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کو فارسی اور عربی زبان پر مکمل عبور تھا۔ آپ کے جد اعلیٰ سید محمد صاحب بعہد نواب سکندر جاہ مدینہ منورہ سے حیدر آباد تشریف لائے۔ آپ کے والد میر حسین علی خان صاحب کو حکومت آصفیہ سے سو روپیہ ماہوار مقرر تھی۔ اس کے علاوہ آصف جاہ سادس نے آپ کو جاگیر سے بھی سرفراز فرمایا۔ امیر کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ زندگی میں کبھی ملازمت نہیں کی۔ اپنے والد کی طرح امیر بھی منصب پر اکتفا کرتے تھے۔ پیری مریدی کا سلسلہ خاندانی تھا۔ اس لئے ملازمت سے دور تھے اگر امیر چاہتے تھے تو کہیں ملازم ہو جا سکتے تھے۔ مگر اس کو انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کے صرف ایک فرزند سید آصف الدین خان تھے۔

شاعری میں امیر نے پہلے محمد سرفراز علی صاحب وصفی سے اصلاح لی۔ پھر جب داغ حیدر آباد تشریف لائے تو امیر نے بھی دوسروں کی طرح داغ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔

نمونہ کے طور پر آپ کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

تو نے کس عاشق کی محنت اے فلک برباد کی — پھوٹی قسمت قابل افسوس ہے فریاد کی
اس بہانے سے نہیں کرتے وہ غیروں پر ستم — کہتے ہیں توقیر جاتی ہے میری بیداد کی
ہے وہی رزاق مطلق کام اس کا ہے امیر — پرورش ماں باپ یوں کرتے نہیں اولاد کی

دیگر متفرق اشعار ملاحظہ ہوں۔

دن گزرتا ہے بیقراری میں رات کو کب قرار آتا ہے
اٹھو امیر، بت نے دیا ہے کہیں جواب کیا بیٹھے باتیں کرتے ہو پتھر کے سامنے (۲)

دیگر

رندوں کی پھر کشاکش رندانہ دیکھئے بند ایک دن اگر در میخانہ رہ گیا
لیلیٰ رہی نہ قیس نہ شیریں نہ کوہکن دنیا میں حسن و عشق کا افسانہ رہ گیا
ساقی نے خالی جام عطا جب کیا مجھے لبریز ہوکے عمر کا پیمانہ رہ گیا
صبح شب وصال گیا کوئی اے امیر شیشہ بغل میں ہاتھ میں پیمانہ رہ گیا (۳)

☆☆

---

(۱) غلام صمدانی خان گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر شعراء نازک خیال حیدرآباد، ۱۳۱۹، صفحہ (۲۱)
(۲) تسکین عابدی سخن وران دکن۔ حیدرآباد ۱۹۳۸ء، صفحہ۔ (۱۰۹)
(۳) تسکین عابد سخن وران دکن۔ حیدرآباد ۱۹۳۸ء، صفحہ۔ (۱۰۹)

مولانا انوآر اللہ فاروقی صاحب

آپ کا نام انوار اللہ فاروقی تھا۔۴ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ بمقام ناندیڑ میں پیدا ہوئے۔آپ کے خاندان کا تعلق قندھار کے قاضی گھرانے سے تھا کہتے ہیں کہ آپ کے اجداد کو شاہان تیمور کے دربار میں عہدہ قضات حاصل تھا۔آپ کا سلسلہ اٹھائیسویں پشت میں خلیفہ حضرت سیدنا عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔آپ کے نانا حضرت شاہ رفیع الدین اپنے وقت کے بڑے مشائخ گزرے ہیں۔مولانا انوار اللہ صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں مولانا شاہ بدرالدین رفائی کے یہاں قرآن شریف شروع کیا۔سات سال کی عمر میں آپ نے حافظ محمد صاحب نابینا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرکے قرآن شریف گیارہ برس کی عمر میں حفظ کرلیا۔مولانا عبدالحکیم فرنگی محل کے پاس فقہ کی تعلیم حاصل کی۔شیخ عبداللہ یمنی سے تفسیر وحدیث کا علم حاصل کیا۔اس کے علاوہ آپ نے سلوک کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔کچھ عرصہ بعد شیخ وحاجی امداد اللہ مہاجر کے ہاتھ پر بیعت کی۔عالم جوانی میں ۱۲۸۲ھ میں حاجی محمد ابراہیم صاحب کی صاحبزادی سے آپ کا عقد مذہبی طریقہ سے انجام پایا (۱) مولانا انوار اللہ صاحب ۱۲۸۵ھ میں محکمہ مالگزاری میں خلاصہ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے لیکن جلد ہی سبکدوش ہوگئے۔آپ کے خسر محمد ابراہیم صاحب نے ایک مسجد اور دینی مدرسہ بنایا تھا جس کا مقصد مسلمانوں اور خاص کر اہل خدمات شرعیہ کی اولاد کو تعلیم و تربیت سے فیض یاب کرنا تھا۔مولانا انوار اللہ صاحب اس مدرسہ کی تدریسی تالیفات میں سرگرم ہوگئے اور ۱۲۹۲ھ میں آپ اس دینی مدرسہ کے صدر مقرر ہوگئے۔آپ ایک ماہر تعلیم عالم حدیث وفقہ کے ماہر اور جید حافظ تھے۔آپ کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بلاد اسلامیہ میں بھی تھی۔مشائخین علم کی تشنگی بجھانے آپ کے ہاں جوق در جوق آتے تھے اور فیضیاب

ہو کر لوٹتے تھے۔ مولانا نے ۱۲۹۴ھ میں حج کا ارادہ فرمایا اور مکہ معظمہ پہنچ کر شیخ الوقت حاجی امداداللہ احمد سے تمام سلسلوں میں بیعت حاصل کی اور سلوک کے منازل طے کرتے رہے اور پھر حیدرآباد تشریف لائے۔ جب ۱۲۹۵ھ میں محمد زماں خاں شہید ہو گئے جو اعلیٰ حضرت آصفجاہ سادس کے استاد تھے تو ان کی جگہ اسی خدمت پر مولانا انواراللہ صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ مولانا نے اس انتخاب کو بہت مشکل حالات کے تحت قبول کیا۔ مولانا کو دربار تخت نشینی آصفجاہ سادس کے دن خان بہادر کا خطاب اور ایک ہزاری منصب عطا کیا گیا۔ مولانا انوار نے ''انوار احمدی'' نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ آپ نے کتب خانہ شیخ الاسلام اور کتب خانہ محمودیہ سے بہت سارے عربی و فارسی مخطوطات کی نقل کروائی (۲) انکی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) کنزالاعمال (حدیث کی کتاب) سات جلدوں میں

(۲) جامع معاہدہ امام اعظم

(۳) جوہر نقی علی بیہقی

(۴) احادیث قدسیہ

۱۳۲۴ھ میں نواب مظفر جنگ معین المہام امور مذہبی کے انتقال کے بعد انواراللہ صاحب اسی جلیل القدر عہدہ پر مامور کئے گئے۔ ۱۳۳۵ھ میں آپ کو میر عثمان علی خان آصفجاہ سابع نے نواب فضیلت جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا۔ ۱۳۳۶ھ میں مولانا مرض سرطان سے علیل ہو گئے اور ۱۳۳۶ھ بروز پنجشنبہ آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ چونکہ جامعہ نظامیہ کے بانی تھے اس لئے آپ کو جامعہ نظامیہ کے صحن میں دفن کیا گیا۔ مولانا اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ مولانا نے ایک رسالہ مقاصد الاسلام جاری کیا۔ اس رسالہ میں زیادہ تر مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ آپ نے بیسوں کتابیں شائع فرمائیں جو صرف مذہبی نوعیت کی تھیں۔ جیسے (۳) (۱) ایک افادۃ الافہام:- یہ کتاب مرزا غالب احمد قادیانی کے جواب میں لکھی گئی جس میں مولانا نے برادران اسلام اور حنفی فقہ پر جو اعتراضات کیے تھے ان کے جوابات دیے ہیں۔ مولانا کی دوسری کتاب حقیقت الفقہ ہے۔ یہ تصنیف فرقہ اہل حدیث کے عقائد کے جواب میں لکھی گئی تیسری تصنیف ''خدا کی قدرت'' ہے یہ ایک

مختصر منظوم رسالہ ہے جس میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام سے استمداد کی جاسکتی ہے۔ آپ نے اس کتاب میں یہی ثابت کیا۔ چوتھی تصنیف ''رسالہ خلق افعال'' ہے اس میں حق تعالیٰ کا خالق الافعال ہونا ثابت فرمایا۔ پانچویں تصنیف ''رسالۂ انوار اللہ'' ہے جو وحدت الوجود کے مسائل پر مبنی ہے۔ چھٹی تصنیف ''رسالۂ انوار اللہ'' (حج) کے طریقہ پر لکھی گئی ہے اور کئی چھوٹی چھوٹی مذہبی تصانیف آپ نے شائع کیں جیسے رسالہ چہل حدیث رسالہ بشری الکلام، کتاب التوحید، کتاب العقل وغیرہ۔

مولانا انوار اللہ خان صاحب کوئی کہنہ مشق شاعر نہ تھے لیکن جذبات کے اظہار کا سلیقہ رکھتے تھے عموماً کلام صوفیانہ خیالات سے بھرا ہوتا ہے۔ کلام کا انتخاب شمیم الانوار کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی غزلیں کہی تھیں۔ نمونہ کلام درج ہے۔

شرک ہر چند برملا تو نہیں	دیکھو دل میں وہ چھپ گیا تو نہیں
دل ٹھکانے نہیں ہے کیا باعث	وہ کسی زلف میں پھنسا تو نہیں
دل کو وہ توڑتے ہیں یہ کہہ کر	بتکدہ خانۂ خدا تو نہیں
پھر سوئے کعبہ لے چلا ہے دل	دیکھیے اس میں کچھ دغا تو نہیں (۴)

☆☆

(۱) امتہ السلام عالمہ آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء مقالہ ایم فل حیدر آباد، صفحہ (۳۰۳)

(۲) ہاشمی نصیر الدین دکن میں اردو، نئی دہلی ۱۹۸۵ء، صفحہ (۶۴۶، ۶۴۷)

(۳) امتہ السلام عالمہ آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء مقالہ ایم فل حیدر آباد، صفحہ (۳۰۵)

(۴) امتہ السلام عالمہ آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء مقالہ ایم فل حیدر آباد، صفحہ (۳۰۸)

کمال النساء بیگم ایجاد

نام کمال النساء بیگم اور تخلص ایجاد تھا۔ ایجاد کی تاریخ ولادت نہیں معلوم، ایجاد کا عقد صدارت جنگ سے ہوا۔ ان سے ایک لڑکی تھی جس کا نام سکندر جہاں بیگم تھا۔ دختر سکندر جہاں نوجوانی میں فوت ہوگئی۔ دختر کی موت سے متاثر ہوکر شاعری شروع کی اور سب سے پہلے نوحہ لکھا۔ نمونہ کے طور پر اشعار ملاحظہ ہو(۱)

آئے اگر وہ شوخ خود آرا کبھی کبھی — جاگے نصیب خفتہ ہمارا کبھی کبھی
وحشت میں گرد گور سکندر پھرا کیے — سنگ لحد پہ سر بھی تو مارا کبھی کبھی
حق سے یہ ہے دعا بہ کمال ادب کمال — آجائے میرا راج دلارا کبھی کبھی

دوسرا نوحہ ملاحظہ ہو۔

لاش پر کہنا میرا رو رو کے شیوں کرنا — تنہا آج آپ چلے ہم ہیں کل آنیوالے
کس کو پوچھوں کہ سکندر ہیں کہاں کیسی ہیں — واپس آتے ہی نہیں جو کہ ہیں جانے والے
(۲)

اپنی دختر کی موت پر مرثیہ لکھا ملاحظہ ہو چند اشعار۔

اے سکندر جہاں کہاں ہو تم — دختر مہربان کہاں ہو تم
کس نے تم کو جدا کیا ہم سے — نہ رہا لطفِ زندگی غم سے
میری نور نظر کہاں ہو تم — رنج و رقت سے میرے ہوش ہیں گم
عدم آباد کو کیا آباد — مجھ ضعیفہ کو کردیا برباد
(۳)

---

(۱) نصیر الدین ہاشمی، خواتین دکن کی اردو خدمات ۱۹۴۰ء، صفحہ (۴۱)
(۲) نصیر الدین ہاشمی، خواتین دکن کی اردو خدمات ۱۹۴۰ء، صفحہ (۴۱)
(۳) تسکین عابدی سخنوران دکن حیدرآباد ۱۹۵۷ء، صفحہ (۳۸)

جناب مولوی محمد احمد ایمن

نام محمد احمد اور تخلص ایمن تھا۔ ایمن کی ولادت ۱۲۹۶ھ م ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم بندگی شیخ مبارک قدسی سرہ سے ملتا ہے۔ جناب ایمن کے والد مولوی حکیم وکیل احمد صاحب ضلع پربھنی میں ناظم عدالت تھے۔ ایمن کی تعلیم وتربیت اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ آپ عربی، فارسی، اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ جناب ایمن کو ان کے والد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جونپور روانہ کیا۔ وہاں سے ایمن عربی میں علم فقہ، حدیث، تصوف، علم معرفت میں قابلیت حاصل کرکے حیدرآباد تشریف لائے اور حیدرآباد میں وکالت کا امتحان کامیاب کرکے وکالت شروع کردی۔ جناب ایمن کے مزید حالات بہت تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوسکے۔ جس کی وجہ سے ان کی تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی (۱)

جناب ایمن کو شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ آپ جناب حبیب کنتوری سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ ایمن کے کلام میں غزل، قصیدہ، رباعی، قطعات اور دیگر تمام اصناف ملتے ہیں جن میں سے ایک غزل ملاحظہ ہو اس غزل میں الفاظ کی جابجا تکرار قابل دید ہے ملاحظہ ہو۔

سر وہ کیا سر ہے نہ جس سر میں ہو سودا تیرا
دل وہ کیسا دل ہے کوئی جو نہ ہو شیدا تیرا

جناب ایمن کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سب وہی وہ ہیں نہ سب میں نظر آئیں کیوں کر
عاشقوں سے وہ بھلا منہ نہ چھپائیں کیوں کر

طالب وصل ہوں میں شایق دیدار نہیں
لن ترانی کی صدائیں وہ سنائیں کیوں کر

دل ملا روز ازل جب تو یہ سوجھی نہ ہمیں
جو ہے دشمن اسے پہلو میں بٹھائیں کیوں کر

نقش پابن کے جو تھے کوئے بتاں میں ایمن
باغ جنت میں بھلا لطف وہ پائیں کیونکر

☆☆

(۱) غلام احمد صمدانی گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر شعراء تازک خیال حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، صفحہ (۳۳)

حافظ محمد ایوب علی علوی ایوبؔ

نام محمد ایوب علی اور تخلص ایوب تھا۔ان کی ولادت ۱۶؍ جمادی الاول ۱۲۹۱ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ابتدائی تعلیم اپنے والد منشی ذوالفقار علی پیر جی کے نگرانی میں حاصل کی۔ بارہ برس کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا۔نو جوانی میں حضرت امداد علی علوی کے ہاتھ پر بیعت حاصل کی بعد میں پائیگاہ خورشید جاہی میں سررشتہ دار ہوگئے۔وہاں سے وظیفہ پر علیحدہ ہونے کے بعد جامعہ نظامیہ میں فارسی کے استاد مقرر ہوگئے۔یہ سلسلۂ تدریس آخری عمر تک جاری رہا۔۶؍ رجب المرجب ۱۳۵۶ھ کو وفات پائی۔احاطہ حضرت سردار بیگ صاحب حیدرآباد میں مدفون ہیں(۱)

شاعری میں جناب ایوب کو اپنے پیرومرشد حضرت امداد علی علوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ان کے کلام کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ انہوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جناب ایوب اردو فارسی دونوں زبانوں کے قادرالکلام شاعر تھے۔انہوں نے دیگر اصناف کے علاوہ ایک مثنوی ''موج دریا'' اور دوسری مثنوی ''ریش وراز'' کے نام سے قلمی یادگار چھوڑی ہیں۔جناب ایوب کی شاعری میں موضوعاتی کلام ملتا ہے۔نمونہ کے طور پر چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

رباعی

جائز ہو جو کام اس کا کرنا مشکل سیدھی ہو جو راہ اس سے گزرنا مشکل
آساں تھا جو زندہ رہنا ہوتا آسان مشکل یہ پڑی کہ اب ہے جینا مشکل

جناب ایوب کی رباعیوں میں نوجوانوں کو نصیحت بھی ملتی ہے۔جیسا کہ ذیل کی رباعی سے ظاہر ہوتا ہے۔

اشغال ہیں اب کے نوجوانوں کے عجیب — دانش سے ہیں دور اور جہالت کے قریب
قرآن، حدیث اور فقہ پڑھتے کیا خاک — ان کو تو نہیں نماز اور روزہ بھی نصیب

ایک مذاحیہ رباعی بھی ملاحظہ ہو:

بوڑھا بچوں کے واسطے ہے ہوا — اور اس کو جواں بھی چاہتے ہیں بوا
ان صحبتوں میں مثال یہ ہے اس کی — گویا کہ ہے بلبلوں میں کالا کوا

☆☆

(۱) صاحب حیدرآبادی۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔ حیدرآباد۔ ۱۹۸۴ء، صفحہ۔ (۶۹)

سید کاظمی علی باغؔ حیدر آباد

نام سید کاظمی علی اور تخلص باغ تھا۔ باغ کی ولادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہوئی۔

سلیمان اریب اپنی تصنیف ''حیدر آباد کے شاعر'' میں رقم طراز ہیں۔

باغ کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ اور لگ بھگ ۸۰ برس عمر پائی۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ باغ کی سنہ ولادت تقریباً ۱۸۶۲ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ آپ کے والد علی گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اور جد اعلیٰ سبزہ زار سندھ سے ہندوستان آ کر آباد ہو گئے۔

باغ کی ابتدائی زندگی آگرہ، جونپور اور رام پور میں گزری۔ شمالی ہند کی غدر کی بربادی کے بعد ریاست حیدر آباد ایک ایسی خوش حال مملکت تھی جہاں دولت کی فراوانی تھی اور خود بادشاہ وقت شاعر اور شاعری کا قدر دان تھا۔ اس لئے ہر طرف سے شاعر، ادیب، انشا پرداز جوق در جوق ''عہد محبوبیہ'' میں آبسے۔ باغ نے بھی تلاش معاش میں حیدر آباد کی راہ لی اور یہاں گتہ داری کا کام شروع کر دیا۔ زندگی کے آخری ایام بہت خوش حالی سے گزرے ان کا مکان جام باغ اندرون چادر گھاٹ تھا۔ آپ کے خاندان کی دیگر تفصیلات آپ کے پوتے جناب نظر حیدر آبادی سے دستیاب ہوئی (۱)

جناب باغ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ داغ کے ممتاز شاگردوں میں شمار تھا۔

ان کے کلام میں ہر صنف سخن ملتی ہے۔ جناب باغ حیدر آبادی کے گھر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء تک ہر ماہ پابندی سے مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور اس مشاعرے میں پڑھے جانے والے کلام کو وہ رسالۂ ماہوار ''تاج'' میں شائع کرواتے تھے۔ جناب باغ اپنے استاد محترم داغ دہلوی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ ان کی غزلیات کا دیوان زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ چند غزلیں ملاحظہ ہوں۔

دنیا کی خواہشوں نے مجھے خوار کردیا — اس زندگی نے زیست سے بیزار کردیا
تیری نگاہ ناز عجب کام کرگئی — احساس بن کے روح کو بیدار کردیا
کیوں کرکٹیں گی کوچۂ گیسو کی منزلیں — اللہ کس بلا میں گرفتار کردیا
ناصح تیرے سبب سے ہوئی ترک مئے کشی — توبہ کراکے اور گنہ گار کردیا

اے باغ وصفِ ابروئے خم دار یار نے
مقطع کو میرے مطلع انوار کردیا (۲)

دیگر غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ عذاب ہے وہ عذاب ہے اسی انحطاط کا نام ہے
وہ شباب تھا وہ شباب تھا کہ جو پیار بن کے گزر گیا
کہیں طور کی تھی تجلیاں کہیں حسن نور کی بجلیاں
شب غم تصور یار میں، میں کہاں کہاں سے گزر گیا
تیرے ناز میں جو نیاز ہے وہ نیاز حسن کا راز ہے
یہ نگاہ شرم سے جب جھکی تیرا رنگ اور نکھر گیا
نہیں تجھ سے مجھ سے مناسبت میں زوال ہوں تو عروج ہے
میں وہ حال ہوں جو بگڑ چکا تو وہ حسن ہے جو سنور گیا
کبھی یاس آکے مٹاگئی تو امید آکے جلاگئی
تیری عمر باغ یوں ہی کٹی کبھی جی اٹھا کبھی مرگیا (۳)

☆☆

(۱) سلیمان اریب، حیدرآباد کے شاعر، حیدرآباد ۱۹۶۲ء، صفحہ۔ (۳۲)
(۲) سلیمان اریب، حیدرآباد کے شاعر، حیدرآباد ۱۹۶۲ء، صفحہ۔ (۳۲)
(۳) تسکین عابدی سخنوران دکن، حیدرآباد ۱۳۵۷ھ، صفحہ۔ (۱۱۷)

محمد عبدالحئی بازغ

نام محمد عبدالحئی تخلص بازغ تھا۔ بازغ کی ولادت ۱۸۶۰ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ محمد حسین فروغ کی نگرانی میں پائی۔ تعلیم تکمیل کرنے کے بعد جناب بازغ نے محکمہ مالگزاری میں ملازمت شروع کی اور اسی محکمہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ بازغ کی وفات ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔

جناب بازغ کو شاعری ورثہ میں ملی آپ کے والد جناب حافظ محمد حسین فروغ قادرالکلام شاعر گزرے ہیں۔ جناب بازغ، ضیاء گورگانی دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے جناب بازغ کے ہم عصر شعراء میں سید منتجب الدین تجلی حضرت رضی الدین کیفی، جناب ڈاکٹر محی الدین قاری زور کے والد اور غلام حسین داد تھے۔ جناب تمکین کاظمی رسالہ نقوش لاہور کے شخصیت نمبر جلد اول میں رقمطراز ہیں۔

> ''عبدالحئی بازغ میرے والد تجلی، کیفی، زعم، ڈاکٹر زور کے والد بھی شریک ہوتے تھے۔ کبھی یہ تینوں چاروں مل کر ایک نظم پوری کرتے تھے۔(۱)

جناب بازغ کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ مختلف رسائل اور تصانیف میں چیدہ چیدہ کلام ملتا ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

داد و دہش و بذل عطادار نظام
کس منہ سے بیان ہوسکے ایثار نظام
پھیلاؤں نہ کس واسطے دامن بازغ
دربار ہے دربار ہے دربار نظام(۲)

جناب بازغ کی ایک مسلسل غزل "تصویر شاعری" کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ ماحصلِ الفت و عشق شعرا ہے
خاصے ہیں تنومند مگر حال برا ہے
تحفائے تفاخر ہوئی رسوائی عالم
اس عشق کا سرکار سے کیا رتبہ ملا ہے
مفروضہ ہیں اشکال تو الفت ہے کہاں کی
تصویر جو خالی ہے تو پھر عشق ہی کیا ہے
ابرو ہیں کمان، تیر مژہ اور نگہہ تیغ
وصفِ رخ جاناں ہے کہ سامانِ دغا ہے
غنچہ دہن و گل بدن و سرو سہی قد
دلبر کا سراپا ہے کہ اک باغ لگا ہے(۳)

☆☆

(۱) تمکین کاظمی مضمون رسالہ "نقوش لاہور ۱۹۵۶ء شخصیات نمبر خصوصی، صفحہ۔(۱۲۷۸)

(۲) صاحب حیدرآبادی جنوبی ہند میں رباعی گوئی تذکرہ شعراء حیدرآباد ۱۹۸۷ء، صفحہ۔(۲۷۴)

(۳) رسالہ صحیفہ، حیدرآباد، صفحہ۔(۲۷)

میر محمد علی بخشیؔ

نام میر محمد علی اور تخلص بخشی تھا۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔
بخشی کے والد میر سردار علی صاحب بخشی سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے جداعلیٰ سید عمر صاحب بعہد عالمگیر ایک لاکھ سوار کے سپہ سالار تھے۔ سید عمر صاحب کے چھوٹے بھائی میر کاظم علی آصف جاہ اول کے ہمراہ دکن تشریف لائے۔ میر محمد علی بخشی انہی کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے فن سپہ گری اور بنوٹ میں مہارت حاصل کی۔ میر سردار علی آصف جاہ سادس کی فوج علی غول کے سپہ سالار تھے۔ دوسو روپیہ ماہوار اور منصب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۴۰ھ میں بخشی کی وفات ہوئی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے (۱)

بخشی کو ابتداء ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ عربی اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اردو میں بھی اپنا کلام یادگار چھوڑا ہے۔
پہلے حضرت سالک دہلوی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میر عباس حسین ششدر سے اصلاح لینے لگے۔ جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو پھر میر نادر علی برتر سے رجوع ہوئے۔ نمونے کے طور پر چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

میں نے شب وصال میں اتنی خطا تو کی — مجبوریوں سے منت پیک قضا تو کی
تدبیر پائے بوسی جاناں اب اور کیا — مٹ مٹ کے میں نے پیروی نقش پا تو کی
اٹھتے اگر تو حشر کو اٹھتے لحد سے ہم — ٹھوکر لگا کے تم نے قیامت بپا تو کی

قسمت میں تھی نہ بخششِ بیمار کی شفا
کرنے کو یوں مسیح نے اس کی دوا تو کی

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ہفتم حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ۔(۲۷)

محمد نادر علی برترؔ

نام محمد نادر علی اور تخلص برتر تھا۔ برتر کی ولادت ۱۲۸۵ھ میں ضلع غازی آباد (یو۔پی) میں ہوئی۔ برتر کے والد عہد محبوبیہ میں ملازمت کے لئے تشریف لائے اور محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہوگئے۔ سلطنت آصفیہ کے صوبہ برار میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ برتر کی تعلیم ان کے والد کی سرپرستی میں ہوئی۔ انہوں نے عربی، فارسی علم جفر اور ریاضی میں مہارت حاصل کی۔

برتر کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا انہوں نے مرزا احسن رضا خاں صاحب رابطہ دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ جو ہر مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ شاعری میں برتر کے دو دیوان ہیں۔ ایک مثنوی فغان برتر اور دوسری "شام عشرت" شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ برتر نے ایک ناول "اسرار عظمت" بھی لکھا جو آپ کی جدت طبع کا انوکھا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ برتر ایک رسالہ "نسیم دکن" کے مدیر بھی تھے۔ امانت پریس کے مہتمم بھی رہے۔ آپ کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی (۱) نمونہ کے طور پر ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

رباعی

ہوں سب کو عزیز زندگانی کی طرح خوش وقت ہوں عہد نوجوانی کی طرح
میں بھی ہوں وہ جو ہر لطیف اے برتر ہر رنگ میں ملجائی ہوں پانی کی طرح

آپ کا کلام صاف اور رنگین ہے۔ ذیل میں متفرق غزلوں سے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

توڑ دیں عہد وفا یہ انہیں منظور نہیں
ورنہ انداز نزاکت سے تو کچھ دور نہیں
ان کے کوچے میں پہنچ کر بھی نہ پہنچا یعنی
ضعیف کے پاؤں سلامت ہیں تو کچھ دور نہیں

یہ ضد بھی کوئی ضد ہے رنگ میری ضعف کا پاکر
قیامت ہے کہ انداز نزاکت سے خفا تم ہو
نہیں معلوم تم کو قدر اپنے حسن کی لیکن
کہ تم سمجھے ہوئے ہو جس قدر اس سے سوا تم ہو

قیامت میں بھی ہو اک دھوم بزم عیش برتر کی — مزا ہو گر سزائے جرم الفت کی جزا تم ہو
ہوئی مشق تصور سے جلا کچھ اور حیرت پر — نظر پڑتی ہے آئینے میں بھی اس بت کی صورت پر
براہو بدگمانی کا غضب میں جان سے یوں بھی — کہ وہ محجوب کیوں ہوتے ہیں دشمن کی شکایت پر (۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ، جلد دوم حیدر آباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ۔ (۳۳)
(۲) تسکین عابدی۔ سخنوران دکن، حیدر آباد، ۱۹۵۷ھ، صفحہ۔ (۱۲۰)

راجہ گردھاری پرشاد باقی

نام گردھاری پرشاد اور تخلص باقی تھا۔ باقی کا جنم یکم رجب ۱۲۴۴ھ حیدر آباد میں ہوا۔ آپ کے والد نرہری پرشاد نواب آصفجاہ نظام الملک خامس کے مصاجب تھے۔ جب پایہ تخت حیدر آباد منتقل ہوا تو نظام الملک کے ساتھ باقی کے والد بھی حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ شاہی سرپرستی شامل حال تھی۔ شاہی صحبت سے مالا مال تھے۔ نرہری پرشاد فارسی کے اچھے شاعر تھے اسی لئے باقی نے بھی فارسی میں مہارت حاصل کر لی۔ بچپن میں فارسی کے علاوہ اردو اور انگریزی کی تعلیم بھی پائی اور نوجوانی میں (۲۳) سال کی عمر میں سرکاری محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کر لی (۱)

باقی کی خوش اخلاقی اور ایمانداری سے متاثر ہو کر نواب آصف جاہ خامس نے فوج باقاعدہ کی تربیت کا کام ان کے ذمہ کر دیا۔ ۱۳۱۲ھ میں باقی کو حکومت آصفیہ نے ''راجہ محبوب نواز ونت'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (۲) بہت کم عمری میں شادی ہوئی مگر ان کی بیوی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکی بہت جلد فوت ہو گئی جس سے انہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تولد ہوئی تھی۔ اس کے بعد باقی نے دوسری شادی کی جس سے انہیں پانچ فرزند اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جن میں راجہ نرسنگ راج عالی مشہور ہوئے۔ باقی نے طویل عمر پائی۔ ستر برس اس دار فانی میں رہنے کے بعد ۲۲ رصفر ۱۳۱۴ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ ہندو دھرم کے سخت پابند تھے۔ مذہبی رواداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انہوں نے بہت سے مندر تعمیر کروائے باقی بہت نیک سیرت انسان تھے۔ تعصب و تنگ نظری ان میں نام کو نہ تھی۔ ان سے ملنے والوں میں اکثر مسلمان تھے (۳) شاعری میں حضرت استاد فیض سے اصلاح لیتے تھے۔

باقی موسیقی، خطاطی کے فن میں ماہر تھے۔ اس کے علاوہ ان کو پکوان میں بہت

دخل تھا۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے پکوان خود اپنے ہاتھ سے تیار کر کے نواب آصفجاہ سادس کے حضور میں پیش کرتے اور داد حاصل کرتے۔

باقی کی تصانیف کثرت سے ہیں جن میں فارسی نظم کے بیس دیوان ہیں اور فارسی نثر کی تین تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ اردو نظم و نثر کی چار تصانیف ہیں۔ آپ ہندی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندی بھاشا کی چار تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

☆ فارسی نظم

(۱) پیرایۂ عروض (۲) یادگار باقی (۳) قصائد باقی (۴) مثنوی صنائع بدائع (۵) بہار عام (۶) پرنس نامہ (۷) تہنیات باقی (۸) ضرب الامثال (۹) مکتوبات منظومہ (۱۰) زمزمہ باقی (۱۱) بھاگوت شریف (۱۲) رامائن مسیحا (۱۳) رباعیات بابرکات (۱۴) رباعیات مناجات باران رحمت (۱۵) باقی نامہ (۱۶) باغ رزاق (۱۷) مثنوی شمع نو (۱۸) منشیات باقی (۱۹) کنوز التاریخ (۲۰) کلام متفرقات (۴)

☆ فارسی نثر

(۱) افضل الفصیح (۲) توشۂ عافیت (۳) مہابھارت کا فارسی ترجمہ

☆ اردو نثر و نظم

(۱) پتی چرتر (سوانح عمری سوامی بھاسکر (نندسرسوتی) (۲) تحقیقات سیاق باقی (۳) بقائے باقی (۴) درد باقی و درد ساقی۔ اس دیوان میں جناب خواجہ میر درد کی تقریباً دو سو فارسی رباعیوں کا اردو ترجمہ ہے۔

☆ ہندی بھاشا

(۱) تیرتھ مال۔ بھجنوں کا مجموعہ (۲) شنبھو پرپان (۳) کیشو پران (۴) بھاگوت سار

باقی کی شاعری میں سلاست، شستگی اور برجستگی نمایاں ہے۔ اس کا سرمایہ زیادہ

تر چھوٹی بحر کی غزلوں پر مشتمل ہے۔

بام پر یار کا چہرا دیکھا — طور پر نور کا شعلہ دیکھا
دل میں دنیا کا تماشا دیکھا — موجزا کوزہ میں دریا دیکھا
قاصد اتنا ہی تو کہہ دے مجھ سے — خط کو پڑھوا کے سنایا دیکھا
عرض کی میں نے ادھر تو دیکھو — کیسا منہ پھیر کے دیکھا دیکھا

میں نے دیکھا ہے رخِ جاناں کو
باقیؔ عنقا کو ہے گویا دیکھا

باقی کو اہل بیت سے بے حد عقیدت تھی۔ مرثیہ کے چند شعر درج ہیں:

پاؤں میں زنجیر جب سجاد کے ڈالی گئی
غل ہوا ایسا کہ دن میں حشر برپا ہوگیا
گھر لٹا، خیمے جلے، شوہر گیا بیٹے گئے
قید خانے میں پڑی بانو یہ کیا کیا ہوگیا(۵)

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی دکھنی ہند اور اردو حیدرآباد ۱۹۵۷ء، صفحہ۔(۱۷۱)
(۲) محمد احمد مجددی مضمون مشمولہ مرقع سخن، مرتب ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ (۱۶۷)
(۳) ڈاکٹر عقیل ہاشمی افتخار علی شاہ وطن حیات اور کارنامے، حیدرآباد، ۱۹۸۰ء، صفحہ (۸۷)
(۴) غلام صمدانی خان گوہر ''تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ہفتم حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ (۲۹)
(۵) باقی۔ دیوان بقائے باقی۔ حیدرآباد، صفحہ۔(۷۹)

میر غضنفر علی شاہ بیتابؔ

نام میر غضنفر اور تخلص بیتاب تھا۔ بیتاب کی ولادت ۱۳۰۴ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ بیتاب ابھی دو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی۔ پھر مدرسہ نظامیہ میں شریک کر دیئے گئے وہاں سے مولوی عالم و مولوی فاضل کامیاب کیا نوجوانی میں سید اعظم علی شائق کے ہاتھ پر بیعت کی اسی سلسلے سے نام کے ساتھ قادری چشتی صابری لکھا کرتے تھے۔ بیتاب کی وفات ۱۳۶۷ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔

بیتاب کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ پہلے نعتیہ کلام اور پھر منقبت کہنے لگے۔ بعد میں تمام اصناف سخن کو اپنایا اور شائق سے اصلاح لی۔ آپ کا دیوان ''نشان تجلیات'' کے نام سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا جس میں تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ بطور نمونہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یاس آلودہ ہے دیدار کی حسرت دل میں　　پردۂ غم کا کئے بیٹھی ہے مسرت دل میں
اب تصور ہے مقید نہ تخیل مطلق　　بن گئی خانہ نشیں خود تری الفت دل میں(۱)

رباعی

جب نام کے پردے میں وہ مستور ہوا　　خود کو پہچاننے کا دستور ہوا
ناظر کی فنائیت نظر میں جو ہوئی　　پُر نور ہوا، نور علیٰ نور ہوا

☆☆

(۱) تسکین عابدی۔ سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ۔(۱۳۰)

جناب عابد مرزا بیگم صاحب

نام عابد مرزا اور تخلص بیگم تھا۔ جناب بیگم کی ولادت ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں مٹیابرج کلکتہ میں ہوئی۔ بیگم کے والد حسین مرزا نواب واجد علی شاہ کی بیگم فخر محل بیگم صاحبہ کے صرف خاص میں ملازم تھے۔ جناب عابد مرزا بیگم تھے تو مرد مگر انکا حلیہ چال ڈھال، لباس وغیرہ زنانی ہوتا تھا اور انہوں نے ریختی میں زیادہ کلام لکھا ہے اور شہرت حاصل کر لی تھی اور سارے ہندوستان میں آپ کی شہرت ریختی شاعری کی وجہ سے ہونے لگی۔ جناب بیگم اپنا کلام آغا حجو شرف کو دکھلاتے تھے۔

۱۳۱۵ھ میں نواب لطف علی خان کے بیٹے نواب ابراہیم علی خان نے پٹنہ میں مشاعرہ کیا تو جناب بیگم کی ریختی کلام کا شہرہ سنکر انہیں خاص طور پر مدعو کیا۔ جناب واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد بیگم نے بھوپال کا قصد کیا اور پھر وہاں سے سیدھے حیدرآباد تشریف لائے (۱)

حیدرآباد میں اس وقت جناب آصف جاہ سادس تخت آصفیہ پر جلوہ گر تھے۔ بیگم حیدرآباد آتے ہی جناب مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ کشن پرشاد کا دربار بادشاہ کے دربار سے کم نہیں تھا۔

بیگم کا کلام ریختی کے باوجود گندگی سے پاک تھا اور ادبی معیارات کی ترجمانی کرتا تھا۔ انہوں نے کسی بھی اپنی ادبی اہمیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ملاحظہ ہو دو شعر

دیکھتی ہوں خواب دہشت ناک جب سوتی ہوں میں
فال کھلوانے کہاں جاؤں کوئی عامل نہیں
ظلم کرتا ہے میرے اوپر جو ناحق بے دھڑک

او موئے سمجھا ہے تو شاید خدا عادل نہیں

جناب بیگم کی ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں جو ریختی میں اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

بہن بھی پوچھے میکے جاؤں کیونکر
اطاعت فرض ہے مجھ پر میاں کی
مزے میں نے اڑائے زندگی کے
نگوڑی سوت ہی نے خاک پھانکی
نہ ہار ہی ماننا ہے تو نہ جیتی
موئے تجھ میں ہے ہٹ دھرمی کہاں کی (۲)

☆☆

(۱) تسکین عابدی سخنوران دکن، حیدرآباد ۱۹۳۸ء، صفحہ۔(۱۲۹)
(۲) تسکین عابدی سخنوران دکن، حیدرآباد ۱۹۳۸ء، صفحہ۔(۱۲۹)

محمد حفیظ الدین پاسؔ

نام محمد حفیظ الدین اور تخلص پاس تھا۔ آپ کے دادا عہد سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے زمانہ میں دکن تشریف لائے۔ مملکتِ آصفیہ میں محکمہ فوج میں ملازم ہوئے۔ ان کے فرزند غلام عبدالقادر عرف بنومیاں تھے۔ بنومیاں کا عقد شہزادی جمال النساء بیگم سے ہوا اور پاس ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ پاس ۱۲۶۰ھ میں حیدرآباد دکن میں تولد ہوئے۔ بچپن میں گھر پر تعلیم حاصل کی۔ اردو کے علاوہ عربی فارسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ پاس اپنی خاندانی ملازمت سپاہ گری کو خیرباد کر کے محکمۂ دار القضات میں ملازم ہو گئے۔ مختلف زبانوں پر عبور تھا۔ اس لئے ترقی کرتے ہوئے تحصیلدار بن گئے اور اسی محکمہ میں وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ پاس حیدرآباد میں محلّہ پتھرگٹی کے قریب مکان میں رہتے تھے۔ ان کا انتقال ۲۹ رجب المرجب ۱۳۳۱ھ کو اکہتر برس میں ہوا۔ ان کا مزار درگاہ حضرت یوسف شریف صاحب قبلہ کے احاطہ میں ہے۔ آپ کے تین صاحبزادے تھے جن میں ایک بحیثیت شاعر کافی مشہور ہوئے۔ ان کا نام رشید الدین رشید تھا۔

پاس ان چار شاعروں میں ایک ہیں جو حضرت فیض کے جملہ تلامذہ نظر رکھتے تھے اور آپ کے ہم عصر شعراء میں پاس کا مقام بلند تھا۔ تمیز، فیاض، عصر اور پاس حضرت فیض کے مقبول شاگرد گزرے ہیں۔ پاس جس محفل میں رونق افروز ہوتے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام پر اعتراض اور تنقید کر دیتے۔ پاس کبھی بھی کسی شاعر سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر زور اپنے ایک مضمون میں حفیظ الدین پاس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

مشہور ہے کہ حضرت آصف جاہ سادس ابتداء میں پاس کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ شاعروں میں ان کی شاعری اور شعر فہمی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی (۱)

پاس ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ان کا کلام ماہنامہ ''گلدستۂ فیض'' میں اکثر شائع ہوتا تھا۔پاس کے شاگردوں میں نواب لقمان الدولہ دل جو آصف جاہ سادس کے طبیب تھے قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ سید حسین ادیب،محمد عبدالرحمٰن افضل،میر داور حسین داور، محمد رشید الدین رشید،سید رشید الدین رشید،شیخ یوسف علی فریدی،عزیز محمد کوہری فتح اور عبدالجید آپ کے مشہور شاگرد گزرے ہیں۔پاس کا کلام ابھی زیورطباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ پاس اگرمشاعرہ میں جاتے اور وہاں اگرداغ بھی موجود یامدعو ہوتے تو ایک دوسرے کا حریف اور مقابل سمجھا جاتا تھا۔

پاس اپنی وضعداری اور قابلیت کی وجہ سے خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔تذکرہ ''سخنوران چشم دیدہ'' فارسی میں ان کا کلام موجود ہے۔

پاس نے غزل کے علاوہ مختلف اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔لیکن غزل ان کی محبوب صنف تھی۔بطور نمونہ غزل کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

تمہارے خط سے نمودار ہے کدورت دل — چھپائے سے نہیں چھپتی غبار کی صورت
چھپی نہ لاکھ چھپائے سے حشر میں اے پاس — قدح کشانِ مئے خوش گوار کی صورت

ولہ

مستی میں سیر عالم امکان مدام ہے — جام جہاں نما مرے ساغر کا نام ہے
ہے دل میں بے شمار مرے حسرت والم — اس مختصر مکان میں کیا اژدہام ہے
جنت میں کب نصیب ہیں دنیا کی لذتیں — زاہد کی بندگی کو ہمارا سلام ہے
اے پاس علم شعر تو دشوار ہے مگر — موزوں طبیعتوں میں ہمارا بھی نام ہے(۲)

☆☆

(۱) ڈاکٹر زور،مرقع سخن جلد دوم حیدرآباد ۱۹۳۷ء،صفحہ (۱۳۷)
(۲) غلام صمدانی گوہر،تزک محبوبیہ،جلد دوم،حصہ پنجم،حیدرآباد،۱۳۰۹ھ،صفحہ (۳۶)

جناب محمد عبدالغفار صاحب پہلوانؔ

نام محمد عبدالغفار تھا اور پہلوان تخلص تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۹۰ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ کے اجداد شاہی پہلوان تھے جناب پہلوان بھی عہد ''محبوبیہ'' اور اس کے بعد عہد عثمانیہ میں شاہی شہزادوں کو فن کشتی سکھاتے تھے۔ شکل وصورت میں جناب پہلوان واقعی پہلوان تھے قد تقریباً سات فٹ تھا بڑی بڑی موچھیں رکھتے تھے۔ ہاتھ کی کلائی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے فولاد کی بنی ہوئی ہو۔ خوراک بھی ماشاءاللہ خوب تھی۔ آپ کو شاہی خزانہ سے منصب بھی ملتی تھی۔ آپ کے چار صاحب زادے اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ جناب پہلوان کی وفات ۱۳۸۰ھ میں ہوئی بہت طویل عمر میں انتقال کیا(۱)

جناب پہلوان زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے۔ اس کے باوجود علمی ذوق ان کی رگ رگ میں بسا تھا۔ جناب رحمت حیدرآبادی کے شاگرد تھے۔

جناب رحمت حیدرآبادی راقم کے دادا ہوتے ہیں۔ جناب پہلوان کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ تھوڑا بہت کلام ملتا ہے۔ انہیں مشاعروں میں شرکت کا بہت شوق تھا۔ ان کے کلام میں بھی پہلوانی جھلکتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جم گئی ہے بت رعنا کی جو صورت دل میں
تختۂ مشق ہے ظالم کی محبت دل میں

نقد دیدار حنا بار سے محروم نہ کر
ہم بھی رکھیں گے تیری دی ہوئی نعمت دل میں

کیوں نہ ہم تم کو پہلوان کہیں مرد سخن
جب کہ تم کرتے ہو اذکار کی کثرت دل میں (۲)

☆☆

(۱) انٹرویو فرزانہ اکبر محمد عبدالقادر، ۳۰ر جنوری ۱۹۹۳ء، حیدرآباد
(۲) تسکین عابدی سخنوران دکن، حیدرآباد ۱۹۳۸ء، صفحہ۔ ۱۳۱

5.69KB/s 3:15 84%

سید منتجب الدین تجلی

نام سید منتجب الدین اور تخلص تجلی تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۹۲ھ م ۱۸۸۳ء میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔ آپ کے دادا نواب سید یار جنگ بہادر بخارا سے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ جناب تجلی اپنے والد کے انتقال کے تیسرے روز پیدا ہوئے (۱)۔ ان کی والدہ نے انہیں منحوس سمجھ کر اپنی آغوش سے دور کر دیا۔ تو ان کی خالا نے اپنے گھر لیجا کر تجلی کی پرورش کی۔ آہستہ آہستہ ماں کی ممتا پکار اٹھی۔ تجلی کو خالا کے گھر سے واپس بلا لیا گیا۔ بہت لاڈ پیار سے ان کی بسم اللہ کی گئی۔ بعد ازاں مدرسہ اعزہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر دار العلوم حیدر آباد میں شریک ہوگئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجلی نے نوجوانی میں حضرت آغا داؤد صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت حاصل کی۔ ابتدا میں وہ صوبہ گلبرگہ میں صیغہ دار ہوئے پھر ضلع رائچور کے خزانے دار (آفیسر) ہوگئے۔ نوجوانی میں انھوں نے طب کا امتحان بھی کامیاب کیا تھا۔ عملی تجربہ قطعانہ تھا۔

تجلی کی نشو ونما حیدر آباد میں ہوئی ۱۹۰۸ء تک وہ حیدر آباد دکن میں تھے۔ اس زمانے میں علمی و ادبی سوسائٹی میں خاصا رسوخ رکھتے تھے۔ ان کی شادی سید عبد الرحیم اول تعلقدار کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن سے انھیں دس لڑکے لڑکیاں تولد ہوئیں لیکن بہ جز تین کے سب بچپن میں فوت ہوگئے۔ آپ کے بڑے لڑکے جناب سید مصباح الدین کاظمی (قلمی نام تمکین کاظمی) مشہور ادیب و شاعر ہیں۔ دوسرے سید رفیع الدین کاظمی، تیسرے سید رشید الدین کاظمی تھے۔ تمکین کاظمی خود اپنے والد کی شخصیت اور مزاج کے بارے میں رسالہ نقوش لاہور میں رقمطراز ہیں: ''والد صاحب کچے کان کے تھے۔ ہر ایک کی بات کا یقین کر لیتے۔ فوراً بگڑ جاتے اور جلد ہی مان بھی جاتے۔ قلبی کیفیت اچھی تھی۔ مذہبی آدمی

3

تھے اس لئے مجاذیب اور مزارات کے بڑے منعقد تھے۔ جو مجذوب مل جاتا اسے پکڑ کر گھر لاتے کھلاتے پلاتے کپڑے بناتے اور نذر دیکر رخصت کرتے تھے۔"(۲)

جناب تجلی بزرگانِ دین سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی ملازمت گلبرگہ میں تھی اسی مناسبت سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے گھر میں فاتحہ، نیاز، نذر بہت اہتمام سے ہوتی تھی۔ تمکین کاظمی اس عقیدہ سے متفق نہ تھے۔ اس بنا پر تجلی اپنے ہونہار فرزند تمکین کاظمی سے خفا رہتے تھے۔ جب تجلی اپنی عمر کی آخری منزلیں طئے کررہے تھے بیمار پڑ گئے۔ انھیں تمکین کاظمی نے حیدرآباد لانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر تجلی نے فرمایا کہ مجھ کو اس شرط پر حیدرآباد لے چلو۔ میں مرنے والا ہوں۔ وعدہ کرو کہ میری نعش گلبرگہ لاکر خواجہ صاحب کے پائین میں دفناؤ گے۔(۱) اگر یہ شرط منظور ہو تو لے چلو ورنہ انتظار کرو چنانچہ وہیں ۹ رمہر ۱۳۳۶ف م ۱۹۲۷ء (۱۶/اگست) کو گلبرگہ میں انتقال کیا اور وہیں خواجہ کے پائین میں آسودہ خاک ہوگئے۔

جناب تجلی حضرت استاد داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ جب داغ کا انتقال ہوگیا تو پھر کسی سے اصلاح لینا مناسب نہیں سمجھا۔ تجلی حیدرآباد میں "سامرینِ داغ" کی علمی و ادبی محفلوں کی روحِ رواں تھے۔ ان کے ہم عمر شعرا میں غلام حسین داد، عبدالحی بازغ، رضی الدین کیفی، نادر علی برتر، قطب الدین ستی، پاشاہ محی الدین وجودی محمد علی خان ناظم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔(۳)

جناب تجلی ملازمت ملنے پر گلبرگہ منتقل ہوگئے، مگر ان کی علمی سرگرمیوں میں فرق نہیں آیا۔ تجلی اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے اور فنونِ لطیفہ سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے چار دیوان مکمل تھے مگر زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے۔ تجلی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر موزوں فرماتے تھے۔

تمکین کاظمی نے اپنی زندگی میں والد کے چار دواوین کو یکجا کیا اور طباعت کے لئے ابوالعلائی پریس آگرہ سے معاملہ طے کیا۔ مسودہ اور ڈھائی سو روپیہ بھجوایا مگر شائع نہ ہوسکا۔ مطبع برخاست ہوگیا۔ نجانے اب مسودہ کہاں ہے(۴) تجلی کی شاعری عشق و عاشقی سے نابلد تھی۔ مولوی آدمی تھے مشق بھی جاری نہ رکھتے۔ جی چاہتا تو روزانہ دوغزلیں کہتے

ورنہ مہینوں شعر کہنے کی نوبت نہ آئی نہ اس موضوع پر بات کرتے۔

ان کی شاعری کا طریقہ نرالا تھا۔ پہلے قافیہ پیمائی کرتے ان کو مصرعوں میں موزوں کرتے پھر مصرع بہم پہنچاتے۔ اس طرح غزلوں میں آورد ہوتی آمد نادرد۔ ایک آدھ شعر صاف نکلتا اور بس سارا دیوان ایسا ہی تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں نعت کہنے لگے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

اب نہیں سوا تیرے کوئی بھی اپنا　　آشنا وہ غیروں کا ہوگیا جو تھا اپنا

تجلی کی غزل کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں جن میں انہوں نے تخلص استعمال کیا ہے۔

لگانا آگ دل کو دفن کردینا تجلی تم
نہ کرنا دل لگی پیدا کسی نا اہل انساں سے
قیامت میں جمالِ حق بھی ہے دیدارِ حضرت بھی
کسے دیکھوں ابھی سے میری ڈانواں ڈول نیت ہے
عدو سے بزم میں سرگوشیاں دیکھی نہیں جاتیں
تمہارے گھر سے ہم اشکوں سے منہ دھو کر نکلتے ہیں
(۵)

☆☆

(۱) تمکین کاظمی مضمون مشمولہ رسالہ نقوش پاکستان ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۸۸

(۲) تمکین کاظمی مضمون مشمولہ رسالہ نقوش پاکستان ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۸۹

(۳) تسکین عابدی سخنوران دکن حیدرآباد ۱۳۳۸ھ، ص ۱۳۵

(۴) تمکین کاظمی مضمون مشمولہ رسالہ نقوشی پاکستان ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۹۰

(۵) تسکین عابدی سخنوران دکنی حیدرآباد ۱۳۳۸ھ، ص ۱۳۷

ترک علی شاہ ترکیؔ

نام ترک علی شاہ اور تخلص ترکیؔ تھا۔ ترکیؔ کی ولادت ۱۲۴۳ھ میں لاہور میں ہوئی آپ کے جداعلیٰ نادرشاہ کے ساتھ ہرات سے آکر لاہور میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ جناب ترکیؔ کی حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی سے بیعت تھی اس لئے اپنے نام کے ساتھ قلندر لکھا کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی۔ زندگی کا زیادہ حصہ تقریباً (۶۰) سال لاہور میں گزارا بعد میں حیدرآباد آئے اور یہاں (۳۵) سال زندہ رہ کر پچانوے سال کی عمر میں ۱۳۳۷ھ م ۱۳۲۸ء فصلی میں انتقال کیا۔ آپ کی صاحبزادی بسم اللہ بیگم عصمت بھی مشہور شاعرہ تھیں۔ اپنے والد سے اصلاح لیتی تھیں۔

جناب ترکیؔ کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ شروع میں امام بخش ناسخ صہبائی دہلوی سے اصلاح لیتے رہے بعد میں اپنا ریختی کلام میر علی اوسط رشک کو دکھایا۔ ضرورت سے زیادہ زندہ دل یار باش بزرگ تھے۔ فارسی شاعری میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی کئی تصانیف شائع ہوچکی ہیں جس میں دیوان سرمایہ پیری ''گلبانگ ترکی'' تذکرہ سخنوران چشم دیدہ قابل ذکر ہیں (۲)

حضرت ترکیؔ کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ قابلِ ذکر ناموں میں تجلی، ناظم، شائق، امجد وغیرہ آپ کو اپنا فارسی کلام بہ غرض اصلاح دکھاتے تھے۔ ترکیؔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے متوسل تھے۔ نمونہ کے طور پر ان کے اردو دیوان سے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

بدلی نہ شب وصل میں حالت مرے دل کی — نکلی نہ سحر تک کوئی حسرت مرے دل کی
سن لیتے ہیں جس شب وہ حکایت مرے دل کی — دھودیتے ہیں اشکوں سے کدورت مرے دل کی
کب زیست میں جائے گی ملامت مرے دل کی — نکلے گی نہ اب خاک ہی حسرت مرے دل کی (۲)

رباعی

پیری میں ہوئی فکر عقبیٰ مجھ کو — دولت کی نہیں ہے اب تمنا مجھ کو
جس دن سے ہوا ہوں میں قلندر ترکی — بھاتی ہی نہیں عروسِ دنیا مجھ کو

ترکی نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ خود اپنی فارسی کے متعلق اردو میں ہجو کہی ہے۔

چار مینار میں جا کر گل سوسن بیچو — پھول مہنگے ہیں اگر پان کی کترن بیچو
اور یہ بھی نہیں تو دودھ کی کھرچن بیچو — شاعری سے تمہیں کیا کام ہے روغن بیچو
فن یہ مشکل ہے اسے چھوڑ کے صابن بیچو (۳)

☆☆

---

(۱) نصیر الدین ہاشمی۔ خواتین دکن کی اردو خدمات۔ ۱۳۵۹ھ، صفحہ۔ (۵۰)
(۲) تسکین عابدی۔ سخنوران دکن حیدر آباد، ۱۳۵۷ھ
(۳) ترک علی شاہ۔ دیوان سرمایۂ حیات۔ حیدر آباد، ۱۳۲۳ھ، صفحہ۔ (۲۳۷)
(۴) ترک علی شاہ۔ دیوان سرمایۂ حیات۔ حیدر آباد، ۱۳۲۳ھ، صفحہ۔ (۲۸۵)

سید عبدالحکیم تدبیر

نام سید عبدالحکیم اور تخلص تدبیر تھا۔ تدبیر کی ولادت ۲ ر شعبان ۱۳۰۹ھ میں ہوئی۔ تدبیر فرقۂ مہدویہ کے پیرومرشد تھے۔ ابتدائی تعلیم گھریلو ماحول میں ہوئی۔ دارالعلوم سے منشی عالم اور مولوی فاضل کامیاب کیا۔ فقہ، تفسیر، حدیث کا درس علامہ شمسی سے حاصل کیا۔ مدرسہ گوشہ محل میں مدرس کی حیثیت سے ملازمت کی۔ وہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔ باقی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔

جناب تدبیر کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ گھر کے مذہبی ماحول کی وجہ سے شروع میں نعتیہ کلام لکھا۔ بزرگان دین سے عقیدت کے سبب کلام میں تصوف اور عرفان کا رنگ نمایاں ہے۔

نعتیہ کلام ہمدست نہ ہو سکا۔ نمونے کے طور پر مختلف غزلوں سے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

یہ بے رنگی تو دیکھو رنگ تک آتا نہیں لیکن	نکالے دیتے ہیں ہاتھوں کی مہندی چلبلے پن سے
ایک کیا سیکڑوں دل ہو گئے پامال خرام	فتنہ ساماں مرا جس راہ گزر سے نکلا
آئینۂ طلعتِ زیبا کا ہے کاشانۂ دل	حسن کا ایک مرقع ہے پری خانۂ دل
چشم مخمور میں ہوتی ہے شگفتہ جو باہر	ہے اسی رنگ میں ڈوبا ہوا پیمانۂ دل
موجزن اس میں حقیقت کا بڑا دریا ہے	دیکھنے کے لئے چھوٹا سا ہے پیمانۂ دل (۱)

☆☆

(۱) تسکین عابدی۔ سخنوران دکن۔ حیدرآباد۔ ۱۳۵۷ھ، صفحہ۔ (۱۳۷)

اقبال بیگم ترکؔ

نام اقبال بیگم اور تخلص ترک تھا۔ترک کی ولادت ۱۲۸۵ھ میں بلگرام میں ہوئی والدین کی سرپرستی میں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی۔اردواور فارسی میں خاصی مہارت رکھتی تھیں۔ان کی شادی عہد محبوبیہ کے نامور شاعر جناب گرامی سے ہوئی۔شاعری میں آپ اپنے شوہر گرامی سے اصلاح لیتی تھیں۔اپنے شوہر کے ساتھ بلگرام سے دکن تشریف لائیں اور یہیں کی ہو کر رہ گئیں(۱)

نمونے کے طور پر غزل کے اشعار درج کیئے جاتے ہیں۔

دل کو رہتی ہے جستجو تیری
عشق تیرا ہے آرزو تیری

دیتے ہیں دل ہم اپنی آنکھوں کو
رکھ کے تصویر روبرو تیری

اگر پہلو میں دل ہے اور دل میں عشق کی لذت
کوئی مشکل نہیں انسان کو مجبور ہوجانا

مزے ملتے ہیں اک دیوانگی کے دونوں عالم کے
کبھی رنجور ہوجانا، کبھی مسرور ہوجانا

دل عشاق کا اے ترک یہ بھی اک کرشمہ ہے
کبھی برباد ہوجانا، کبھی معمور ہوجانا

☆☆

(۱) تمکین عابدی،سخنوران دکن،حیدرآباد۔۱۳۵۷ھ،صفحہ۔(۴۱)

سید یوسف تسکین

نام سید یوسف اور تخلص تسکین تھا۔ تسکین کی ولادت ۱۲۶۰ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ فرقہ مہدویہ کے پیرو مرشد تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اپنے فرقہ مہدویہ کے شائع ہونے والے رسالہ المصدق میں مذہبی موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔ ان کے دو مضامین ''حضرت موعود کا سفر نامۂ قندھار'' اور ''ابوالغازی سلطان مظفر حسین مرزا مہدی کے نام'' قابل ذکر ہیں۔ تسکین کے نثری کارناموں کے علاوہ شعر تخلیقات بھی ملتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جس کا موضوع ''نامہ تسکین ہے۔''

نہ اترا نو جوانی پر کہ ہے اک بے وفا یہ بھی — نہ بھول اس حسن پر اپنے ہے دو دن کی ہوا یہ بھی

کریں ہم یار کا شکوہ کہ اس بے رحمی دل کا — اگر وہ ہم سے ناخوش ہیں تو مدت سے خفا یہ بھی

ہوا خواہوں میں تیری زلف کے اے یار ہم بھی ہیں — صبا میری طرف سے اس کو کہہ دینا ذرا یہ بھی

ادھر تم اور تمہارا دن ادھر میں اور میرا دل — جدا تم بھی جدا میں بھی جدا وہ بھی جدا یہ بھی

رہا تھا پاس کیا اپنے سوا اس بے وفا دل کے — چلو جانے بھی دو تسکین گیا وہ بھی گیا یہ بھی (۱)

وہ آئے خواب میں میرے نہ تھا یہ میرے سا مکاں میں — کہ بحث غیر تھا شامل مرے خواب پریشاں میں

ہمیں بھی عندلیبو کچھ یونہیں سا یاد پڑتا ہے — کوئی دن آشیاں اپنا بھی تھا شاید گلستاں میں

بجز سوز تمنا کچھ نہیں تسکین آرائش — دل پر داغ کا عالم ہے طاؤس گلستان میں (۲)

☆☆

(۱) رسالہ المصدق جلد اول۔ ۱۳۳۲ھ، صفحہ (۳۰)

(۲) رسالہ المصدق جلد اول۔ ۱۳۳۲ھ، صفحہ (۳۱،۳۰)

سید یوسف تصور

نام سید یوسف اور تخلص تصور تھا۔تصور کی شعری تخلیقات کے علاوہ نثری مضامین بھی رسالہ المصدق میں شائع ہوتے تھے۔انہوں نے تمام اصناف سخن میں شعر کہے ہیں۔تصور سید جلال الدین توفیق کے داماد تھے۔نمونہ کے طور پر غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ملتا ہے جب خدا کہ خودی کا پتہ نہ ہو
خلوت میں چاہیے کہ کوئی دوسرا نہ ہو
میں جانتا ہوں اس پہ گزرتی ہے جس طرح
دل زندگی سے ہائے کسی کا خفا نہ ہو
وہ گفتگو میں آپ کو بھولا ہوا ہے آج
ڈرتا ہوں میرے پیچھے کہیں آئینہ نہ ہو
ہم سے کشی کو چھوڑ بھی دیں کے بہار میں
لیکن دراز دستی آب و ہوا نہ ہو
عرصہ ہوا کہ ہم سے تصور نہیں ملا
حسرت نصیب ہائے کہیں مرگیا نہ ہو(۱)

جناب تصور نے ''افکارِ تصور'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کسی کے آنے نہ آنے سے اس کو کیا مطلب   نظر کو وقف انتظار ہونا تھا
کسی کا نام کسی نے لیا، بہانہ ہوا   ہماری آنکھ کو بس اشکبار ہونا تھا

تصور ایک غمِ یار کے سوا مجھ کو
ہزار بار غمِ روزگار ہوتا تھا(۲)

☆☆

(۱) رسالہ الصدق، جلد اول، شمارہ ۳۵۔ صفر ۱۳۳۲ھ، صفحہ (۳۲)
(۲) رسالہ الصدق، جلد اول، شمارہ ۳۵۔ ذیقعد ۱۳۳۰ھ، صفحہ (۳۰)

سید جلال الدین توفیق

نام سید جلال الدین اور تخلص توفیق تھا۔ توفیق ۱۲۸۱ھ میں اپنے نانا سید ابراہیم صاحب کے مکان میں تولد ہوئے جو سکندر آباد میں قیام پذیر تھے۔ توفیق کی ابتدائی تعلیم سید محمود افسوس کے مکتب واقع کاچی گوڑہ میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں عربی و فارسی کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مولانا احمد سیالکوٹی سے عربی اور مولانا منور میاں سے فرقۂ مہدویت کی تعلیم حاصل کی کیونکہ آپ فرقۂ مہدویت سے تعلق رکھتے تھے۔ ملازمت کی ابتداء محکمہ انکم ٹیکس سے کی۔ اس کے بعد محکمہ صدر محاسبی میں منتقل ہوگئے وظیفہ کی عمر گزارنے کے بعد وظیفہ حاصل نہیں کیا اس بنا پر ان کے فرزند سید امیر الدین توصیف کو ملازمت دی گئی۔

توفیق فرقہ مہدویہ کے رو سے وظیفہ نالے کر ترک دنیا کر دیا تھا۔ توفیق پاکیزگی کے حامل تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور دین اسلام کے سچے پیرو تھے۔ مذہبی عقائد کے فریفتہ، وضع دار، نیک اطوار، حلیم الطبع، خوش اخلاق اور آزاد مشرب برگزیدہ شخصیت کے حامل تھے(۱) انہوں نے اپنی ساری زندگی رشد و ہدایت میں گزاری، طبیعت میں انانیت و نخوت نام کو نہیں تھی۔ جس محفل میں تشریف لاتے شمعِ محفل بن جاتے۔ سرکاری کام کاج کرنے کے بعد تصنیف و تالیف، شعر و شاعری و مطالعۂ کتب میں وقت گزارتے۔ فن خطاطی کے ماہر تھے۔ آپ کی وفات کی تاریخ ''توفیق اہل بہشت'' سے برآمد ہوتی ہے جس کے اعداد جمع کرنے پر ۱۳۳۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ نبیرہ توفیق راقم الحرف کے پڑوسی ہیں۔

حضرت توفیق کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا۔ انہوں نے ۱۴ برس کی عمر میں اپنا تخلص توفیق رکھا اور اپنے والد تصدیق سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ حضرت توفیق شاعری میں اپنے عہد کے غالب دکنی کہلاتے تھے۔ سید اشرف شمسی دیوان توفیق میں رقمطراز ہیں۔

''مولانا توفیق کی لیاقت نہایت اچھی تھی اور چونکہ ان کے والد بزرگوار کو شعر وسخن سے دلچسپی تھی اور شعرائے بلدہ میں تحقیق کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ رات دن ان کے مکان میں شعرا کا مجمع اور شعر وسخن کا چرچا رہتا تھا۔(۲)

حضرت توفیق نے شاعری اس وقت شروع کی جب حیدر آباد میں حضرت فیض، اور ان کے تلامذہ کا چرچا زوروں پر تھا۔ مگر توفیق اس دبستانِ فیض سے متاثر نہیں ہوئے۔ ان کی اپنی انانیت نے انہیں مومن اور غالب کے کلام کی طرف مائل کر دیا۔ اس لیے توفیق کے کلام میں غالب کا رنگ جھلکتا ہے۔ حضرت توفیق کا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔

شاعری کے علاوہ حضرت توفیق کے چند نثری کارنامے بھی ملتے ہیں۔ جیسے:

(۱) تذکرہ شعر (۲) کلیات طیبات (۳) الحقائق (۴) السلوک (۵) رسالہ علم عروض (۶) ڈرامہ اردو

آپ کے فرزند سید امیر الدین توصیف نے ''فانوس خیال'' کے نام سے آپ کے تمام کلام کو جمع کر کے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ ''فانوس خیال'' میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن بھی ملتے ہیں اس کے علاوہ نبرہ توفیق سید جلال الدین نے فانوس خیال تو تیسری مرتبہ 2003ء میں شائع کیا۔ یہاں تصوف سے متعلق شعر درج کیے جاتے ہیں۔

یہ کہاں کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی حیرتیں چھا گئیں
کہ ہزاروں آئینے لگ گئے ہیں نگاہ آئینہ ساز میں

جما رنگ ہوس حسن فزوں تاثیر سے پہلے
بنا آئینہ دل یار کی تصویر سے پہلے(۳)

اس نے کہا ہستی تری، میں نے کہا جلوہ ترا
اس نے کہا پھر نیتی میں نے کہا سودا ترا

اس نے کہا جانا مرا، میں نے کہا میری اجل
اس نے کہا پھر زندگی، میں نے کہا آنا ترا

اس نے کہا شامِ بلا، میں نے کہا گیسو ترے

اس نے کہا صبحِ صفا، میں نے کہا چہرا ترا
اس نے کہا شب کون تھا، میں نے توفیق تھا
اس نے کہا وہ کون ہے میں نے کہا شیدا ترا (۴)

حضرت توفیق کے کلام میں مثلث، مخمس، مسدس، رباعی، قصیدہ اور قطعات بھی ملتے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

ایک وہ بھی ہیں کہ ساقی کی بدولت سرپر — سارا میخانے کا میخانہ لیے پھرتے ہیں
ایک ہم بھی ہیں کہ خالی صفتِ دل توفیق — مے کی امید میں پیانہ لئے پھرتے ہیں

مثلث:۔

بربادیوں کو میری ٹھکانے لگادیا
منظور خاک میں تھا ملانا ملا دیا
لکھ کر زمیں پہ نام کو میرے مٹادیا

ابھرے نہ تھے کہ دیدہ تر نے ڈبو دیا
جلنے نہ پائے تھے کہ تمنا نے کھو دیا
شعلہ اٹھا نہ تھا کہ ہوا نے بجھا دیا

☆☆

(۱) عبدالقادر سروری صاحب، مرقع سخن، جلد اول، مرتب ڈاکٹر زور، حیدر آباد ۱۹۳۵ء، صفحہ۔ (۴۴۷)
(۲) مولانا سید اشرف شمسی، دیباچہ دیوان توفیق، باراول، حیدر آباد
(۳) امتہ السلام عالمہ، آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء، مقالہ ایم فل، حیدر آباد، صفحہ۔ (۳۳۱)
(۴) جلال الدین توفیق، دیوان فانوس خیال، حیدر آباد، ۱۹۳۹ء، صفحہ۔ (۱۱۶)

سید شہاب الدین توقیرؔ

نام سید شہاب الدین اور تخلص توقیر تھا۔ سید ابراہیم تصدیق والد کا نام تھا آپ سید جلال الدین توفیق کے برادر خورد ہیں۔ توقیر لاولد تھے۔ توقیر کے کلام میں مدح، نعت، غزل اور قصیدہ ملتے ہیں۔ یعقوب میاں بندگی پر چند مدح کے شعر ملاحظہ ہوں۔

شہ یعقوب کیا کہنا ترے روضے کی عظمت کا
کہ ہے رضوان اک ادنیٰ، مجاور تیری تربت کا
شرف حاصل ہوا ہے مجھ کو جو تیری زیارت کا
ستارہ اوج پر آیا ہے شاید میری قسمت کا
تو مظہر ثانی مہدی کا وہ مظہر ہیں مہدی کا
کہاں جا کر ملا ہے سلسلہ تیری رشادت کا
تو مہدی کا ہے پوتا شاہ والا پوچھنا کیا ہے
ترے فقر و توکل اور تیرے فخر و عظمت کا
اگر ہے التجا توقیر کی تجھ سے تو اتنی ہے
کہ آساں مرحلہ اس پر شہ دین ہو قیامت کا (۱)

جناب توقیر کی غزل میں بلا کی چاشنی ہے جیسا کہ ذیل کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

کچھ خیال اس کا نہیں ہم کو جو بدنام چلے
رنج یہ ہے کہ تری بزم سے ناکام چلے

کیسے ممکن ہے کہ ہو ترکِ محبت ان سے
کام کی بات ہو ناصح تو کوئی کام چلے
کس خرابی سے کٹی منزلِ ہستی توقیر
صورتِ عمرِ رواں صبح چلے شام چلے(۲)

☆☆

(۱) رسالہ الصدق، جلد اول شمارہ ۸، شعبان ۱۳۳۲ھ، صفحہ۔(۳۰)

(۲) رسالہ الصدق، جلد دوم شمارہ ۲، صفر ۱۳۳۳ھ، صفحہ (۲۹)

سید یوسف تنویرؔ

نام سید یوسف اور تخلص تنویر تھا۔ رسالہ المصدق میں تنویر کا کلام پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ نعت کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ چنانچہ نعت کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

ہاتھ آیا ہے دامن جو رسول عربی کا موقع ہے یہ امت کو شفاعت طلبی کا
محشر میں ترے شربتِ دیدار سے دل کو صد شکر کہ شکوہ نہ رہا تشنہ لبی کا
آبا ہیں ترے آدم و شیث اور ابراہیم قائل ہے زمانہ ترے عالی نسبی کا

مانا کہ گنہگار و خطاکار ہے تنویر
کیا ڈر اسے خادم ہے رسول عربی کا(۱)

جناب تنویر کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خانۂ دل میں نہاں وہ شاہدِ طناز ہے ذوقِ ارمانِ چلیدن جلوہ گاہِ ناز ہے
مژدہ باد اے جوشِ ناکامی حسرت مژدہ باد اضطرابِ دم شکستن ہجر میں دمساز ہے
دیکھ لیتے ہیں وہ میرے شوقِ پنہاں کی بہار جوش سے بیتابیِ دل آئینہ اعجاز ہے
ہوں کسی کافر کی چشمِ نرگسی کا شیفتہ دل مرا تنویر ممنونِ نگاہ ناز ہے(۲)

☆☆

(۱) رسالہ المصدق، جلد اول، شمارہ ۳، ۱۳۴۲ھ، صفحہ۔ (۲)

(۲) رسالہ المصدق، جلد دوم، شمارہ ۲، ۱۳۵۱ھ، صفحہ۔ (۴۸، ۴۷)

پنڈت راگھویندرراؤ جذبؔ عالمپوری

نام راگھویندرراؤ تھا اور تخلص جذبؔ۔ آپ کی پیدائش ۲۰/اپریل ۱۸۹۴ء کو تعلقہ گنگاوتی ضلع رائچور میں ہوئی۔ ضلع رائچور عہدِ محبوبیہ میں نظام اسٹیٹ میں شامل تھا۔ جناب جذب کے والد رام راؤ نوجوانی میں فوت ہوگئے جبکہ جذب صغیرسنی ہی میں تھے(۱) جذب کی والدہ آپ کی پرورش کے قابل نہیں تھیں اس لئے انہیں سیتابائی نامی ایک برہمن عورت نے گود لے لیا۔ آپ متبنیٰ ماں کے زیرپرورش رہ کر زمانے کے دستور کے مطابق راجہ رام نرسو سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اردو میں ادیب کامل اور فارسی میں منشی فاضل تک تعلیم پائی۔ زیادہ وقت پنڈتوں کی صحبت میں رہ کر سنسکرت بھی سیکھی۔ ۱۳۳۲ف میں امتحان جوڈیشنل کامیاب کیا اور عالم پور میں وکالت شروع کردی۔ کافی عرصہ تک عالمپور مین وکالت کرتے رہے۔ عہد عثمانی میں حیدرآباد آ کر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کردی۔ آپ کے ایک فرزند پرہلادراؤ اور ایک دختر تھی۔ تقریباً (۸۰) سال عمر پائی ۱۹۷۳ء کو وفات پاگئے (۲)

جناب جذب کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں شعر موزوں کر کے استاد شوکت میرٹھی سے اصلاح لی۔ بعد میں حضرت امجد سے رجوع

ہو گئے۔ آپ کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ لیکن رباعی گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ جناب جذب نے ہندو ویدانت کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس طرح تصوف اور ویدانت کی آمیزش سے رباعی موزوں کرتے تھے۔ جذب کی رباعیات کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جذب کے کلام میں اخلاق کی سادگی اور وعظ و نصیحت کی متانت پائی جاتی ہے۔ وہ سنسکرت کے غیر فانی خیالات کو اردو میں نظم کرتے تھے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کر جاتی ہے تاثیر بروں کی صحبت　　یعنی کہ بگڑ جاتی ہے اچھی خصلت
ملتے ہی سمندر میں وہ کھارا ہوگا　　گنگا کا وہ پانی ہے جو میٹھا شربت (۳)

جناب جذب کے کلام کا پہلا مجموعہ ''ارمغان جذب'' کے نام سے ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا مجموعہ ''رباعیات آہنگ'' کے نام سے ڈاکٹر حسن الدین احمد نے ۱۹۷۰ء میں جذب کی اجازت سے شائع کیا۔

جناب جذب نے اپنی مادری زبان کنتری سے دیگر زبانوں میں کامیاب تجربہ کیا۔ آپ کا غیر مطبوعہ کلام ان کے صاحبزادے کے پاس محفوظ ہے۔ جناب جذب نے عمر خیال کی فارسی رباعیات کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک ترجمہ ملاحظہ ہو۔

رباعی

آنکھوں میں جو اپنی راہگور رکھتا ہے
ہر شاہ و گدا اسی پر نظر رکھتا ہے
جویان دریا غواصی اور گوہر خود ہے
اس بات کی تہہ کی وہ خبر رکھتا ہے(۴)

جناب تسکین عابدی سخنورانِ دکن میں رقمطراز ہیں کہ جذب کی سو رباعیات کا مجموعہ ''رباعیات جذب'' کے نام سے نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان میں سے چند مشہور رباعیات ملاحظہ ہوں۔

اشراف سے کم ظرف نہ پیدا ہوگا　　اچھا ہو جو بیج پھل بھی اچھا ہوگا
کیا کہتے ہوا ے جذب یہ انہونی بات　　معدن میں گہر کے ساتھ شیشہ ہوگا

دیگر

اس میں نہ پھنسو کیونکہ ہے دنیا دلدل — اور اتنے نہ بھاگو کہ بسا دو جنگل
سب میں رہو اور سب سے جدا تم اے جذب — مرشد نے کیا ہے یہ معمہ یوں حل (۵)

☆☆

(۱) حفیظ قتیل، راہرو اور کاروان، حیدرآباد، ۱۹۵۵ء، صفحہ۔(۲۶)
(۲) مظفرالدین خان۔ جنوبی ہند کی رباعی گوئی، حیدرآباد ۱۹۸۴ء، صفحہ۔(۹۶)
(۳) نصیرالدین ہاشمی، دکنی ہند اور اردو، حیدرآباد، ۱۹۵۴ء، صفحہ۔(۱۰۳)
(۴) نصیرالدین ہاشمی، دکنی ہند اور اردو، حیدرآباد، ۱۹۵۴ء، صفحہ۔(۱۰۳)
(۵) تسکین عابدی، سخنوران دکن۔ حیدرآباد، ۱۳۵۷، صفحہ۔(۱۵۸)

جلیل حسن جلیلؔ مانکپوری

نام جلیل حسن اور تخلص جلیل تھا۔جلیل کی ولادت ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۷ء میں مانکپور (یو۔پی) میں ہوئی۔اپنے والد حافظ عبدالکریم سے عربی وفارسی کا درس لیا۔بارہ سال کی عمر میں جلیل حافظِ قرآن ہوگئے۔پھر علوم متداولہ کی تکمیل کے لئے لکھنو گئے اور وہاں علمائے فرنگی محل سے مکمل استفادہ کیا۔بعد تحصیل وتکمیل علم مانکپور واپس آ گئے۔

حضرت جلیل طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔مانکپور میں شاعری کی فضا موجود تھی۔ابتدائی مشق سخن کے بعد ہی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔بعدازاں ذوقِ سخن کو پروان چڑھانے کے لئے امیر مینائی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔جناب امیر اس وقت رامپور میں تھے اور والی رامپور کے دربار سے وابستہ تھے۔خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح ہونے لگی۔کچھ عرصہ بعد جب رام پور میں امیر مینائی کی نگرانی میں امیر اللغات کا دفتر قائم ہوا تو جناب امیر کی نظر جوہر شناس نے جلیل کو مانکپور سے طلب کیا۔رام پور پہنچ کر جناب جلیل دفتر امیر اللغات کے سکریٹری بنا دیئے گئے(۱)

اس وقت رام پور میں نواب حامد علی خاں فرمانروا تھے اوران کی قدردانی کے سبب ریاست رام پور دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کا مرکز بنی ہوئی تھی۔یہاں استادان کامل کی صحبت میں جلیل کے جوہر شاعری نے خوب جلا پائی۔یہاں تک کہ ہمعصروں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں۔کچھ عرصہ بعد مالی دشواریوں کے سبب امیر اللغات کا کام بند ہوگیا تو امیر مینائی نے دکن کا سفر اختیار کیا۔۱۰رجمادی الاول ۱۳۱۸ھ م ۵ر اگست ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد پہنچے۔ان کے ہمراہ ان کے شاگرد رشید جلیل بھی تھے۔حیدرآباد میں اس وقت نواب میر محبوب علی خان سربرآرائے سلطنت تھے۔اور مرزا داغ استادِ شاہِ دکن تھے۔جناب داغ نے امیر مینائی کی مہمان

نوازی کی لیکن حیدر آباد پہنچتے ہی امیر ایسے بیمار ہوئے کہ ایک ماہ کے اندر وفات پا گئے۔ اس عالمِ غربت میں سر کشن پرشاد شاد نے جلیل کی سرپرستی کی۔ ۱۹۰۵ء میں مرزا داغ کا انتقال ہو گیا۔

اس وقت تک جلیل مانکپوری کو جانشین امیر تسلیم کیا جا چکا تھا اور یہاں کے مشاعروں میں شریک ہو کر جلیل نے اپنی شناخت بنالی تھی۔ چنانچہ شاہ آصف سادس نے سیکڑوں اساتذہ سخن کی موجودتی میں اپنے کلام پر اصلاح کے لئے جلیل کا انتخاب کیا اور مرزا داغ کی جگہ وہ استادِ شاہ بن گئے۔ جلیل القدر کے القاب سے نوازے گئے۔ شاہ آصف کے انتقال کے بعد میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے تو انہوں نے بھی مشورہ سخن کے لئے حضرت جلیل کو دربار شاہی سے وابستہ کرلیا۔ فصاحت جنگ اور امام الفن کے خطابات سے نوازے گئے۔

(۲) جناب جلیل یکم صفر ۱۳۵۶ھ م ۶ ر جنوری ۱۹۴۶ء کو (۷۹) سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ سرکاری اعزازات کے ساتھ خط صالحین میں ان کی تدفین ہوئی۔

استاد جلیل کثیر اولاد تھے ان میں صدیق احمد اثر، انیس احمد کلیم، مونس احمد مونس، عزیز احمد جلیلی اور علی احمد جلیلی نے شاعری کی روایت کو قائم رکھا بالخصوص ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے والد کے نام کو روشن کرنے میں بڑا اہم حصہ ادا کیا ہے۔

جلیل مانک پوری اس سلسلے کے آخری یادگار تھی جو میر و مرزا سے شروع ہوا تھا۔ ان کا تعلق لکھنؤ اسکول سے تھا۔ وہ خالص لکھنوی شاعر تھے تاہم انہوں نے اپنی ذات اور اپنی شاعری میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے دونوں مکاتیب کی خصوصیات یکجا کرلیتی تھیں۔ وہ قدیم سلسلہ تلمذ کے خاتم اور لکھنوی شاعری کی آخری یادگار ہیں۔ جس طرز سخن کو انہوں نے رواج دیا وہ جرات و مصحفی کا ہے۔ جلیل کے کلام میں وہ خارجیت نکھرتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

اس سخن کا جلیل کیا کہنا مصحفی کی زبان ہے گویا

جناب جلیل کے پاس روایت کا کتنا احترام تھا اور اس روایت میں رہ کر استادی کی جو منزلیں انہوں نے طے کیں اس کا جواب ایک تو ان کی مقبولیت وشہرت سے، دوسرے ان کا وہ سارا کلام ہے جو اس فنکارانہ پختگی کا احساس دلاتا ہے۔ انہوں نے غزل میں حیات و کائنات کی گتھیاں نہیں سلجھائیں بلکہ ان گتھیوں میں الجھنے والوں کو گہے طفلے

شووستانہ می رقص، کی دعوت دی۔ یہی ان کا ارٹ ہے۔ انہوں نے شدت جذبات پر لطافت جذبات کو ترجیح دی چنانچہ ان کی شاعری کا سرمایہ یہی نفاست و لطافت ہے۔ جلیل کی شاعری پر شمس الرحمٰن فاروقی یوں رقمطراز ہیں۔

جناب جلیل مانکپوری پرانے استادوں کی آخری یادگار تھے۔ قادر الکلامی کے ساتھ شگفتگی، طرز ادا مضمون آفرینی ان کے کلام کے خاص صفات ہیں۔

پروفیسر ثریا حسین (علیگڑھ) حضرت جلیل کی شاعری پر لکھتی ہیں۔

"جلیل نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ غزل کا رنگ و مزاج لکھنوی ہے۔ جس میں نشاط وحسن پرستی اور موسیقیت کے عناصر غالب ہیں (۳)

جلیل کی تصانیف اور تالیفات کا مختصر جائزہ۔

شاعری:- غزلوں کے دیوان، تاج سخن، جان سخن، روح سخن۔

نعتوں کا مجموعہ:- معراج سخن، مدحیہ قصائد قطعات، سرتاج سخن، درباری شاعری کا مجموعہ۔

نثر:- سوانح امیر مینائی، تذکیر و تانیث، معیار اردو، اردو کا عروض، مکاتیب جلیل۔

استاد جلیل کی مختلف غزلوں سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جو زبان زد ہیں:

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اس شان سے وہ آج پے امتحان چلے — فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے — جب تم چلو زمین چلے، آسمان چلے

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی — آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی
ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال — اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی
پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل — بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی — کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
آتے آتے آئے گا ان کو خیال — جاتے جاتے بے خیال جائے گی

جاتے ہوئے خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے — جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی — ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

تم نے جو اپنے رخ سے پردہ اٹھا دیا ہے — تارے فلک پہ ماہ کامل کو ڈھونڈتے ہیں

محبت رنگ دے جاتی ہے جب دل دل سے ملتا ہے — مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے

عہد شباب چشم زدن میں گزر گیا — جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا — راہ کعبے کی ملی ہے مجھے بتخانے سے

دکان مے پہ پہنچ کر کھلی حقیقت حال — حیات بیچ رہا تھا وہ میفروش نہ تھا

جلیل اچھا نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ انکا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

☆☆

---

(۱) علی احمد جلیل، ڈاکٹر فصاحت جنگ جلیل، مقالہ پی۔ایچ۔ڈی حیدرآباد، ۱۹۹۱ء صفحہ۔(۵۷)
(۲) ڈاکٹر علی احمد جلیلی، مقالہ فصاحت جنگ جلیل، ۱۹۹۱ء صفحہ۔(۲۰۰)
(۳) پروفیسر ثریا حسین، جلیل کی غزل گوئی، مشمولہ، حیدرآباد میں بیرونی شعراء، ۱۹۸۸ء صفحہ۔(۱۵)

ڈاکٹر میر وزیر علی خان جوشؔ (سلطان الحکما)

نام میر وزیر علی خان اور تخلص جوش تھا۔ جوش کی ولادت کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ جوش نے عہد محبوبیہ میں فن ڈاکٹری میں مہارت حاصل کی اور اپنی خدمت کے سبب بہت مقبول ہو گئے۔ انہوں نے خاندان آصفیہ کی برسوں خدمت انجام دی۔ اس فن طب کی وجہ سے آصف جاہ سادس نے انہیں ۱۳۰۳ھ میں سلطان الحکما کا خطاب اور ایک ہزاری منصب سے سرفراز فرمایا۔ آپ اپنے وقت کے لقمان تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے میر محمود علی خان تھے(۱)

شاعری کا شوق انہیں نوجوانی میں ہوا۔ حضرت شہید دہلوی سے سولہ سال اصلاح لی اور اسی زمانے میں ایک مختصر دیوان مرتب کیا جو شائع ہو چکا۔ جوش نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی۔ آپ کا ایک دیوان فارسی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ جو تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''تاریخ ثمرۃ الحسایت'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی اور ایک مثنوی بھی لکھی۔ انہوں نے فن طب پر بھی کئی کتابیں تصنیف کیں جو دستیاب نہیں ہیں۔ آپ کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔

نمونہ کے طور پر غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

میں ہوں مدت سے آشنا تیرا ۔۔۔ جان و دل سے ہوں مبتلا تیرا
اب کہاں ظلم چرخ تفرقہ ساز ۔۔۔ تو مرا اور میں ہوا تیرا
مجھ کو دیتا ہے گالیاں ناحق ۔۔۔ کچھ تو کہہ کیا برا کیا تیرا

تو نے اک بار بھی نہ یاد کیا
جوش بھرتا ہے دم سدا تیرا

غیروں پہ کرو لطف و عطا اور زیادہ ۔۔۔ یاں اس کے عوض ہم سے جفا اور زیادہ
معلوم ہو عاشق کی رضا اور زیادہ ۔۔۔ دو چار ابھی وار لگا اور زیادہ
میں نے جو وفا اپنی بیاں کی تو وہ بولا ۔۔۔ اے جوش نہ حق اپنا جتا اور زیادہ

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ ۔ ۴۷

مرزا غلام علی الجعفری جوشؔ

نام مرزا غلام علی الجعفری اور تخلص جوش تھا۔ جوش کی ولادت ۱۲۶۳ھ میں ہوئی آپ کے والد مرزا محمد علی مدراس سے حیدرآباد منتقل ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدراس میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد جوش ملازمت کی غرض سے حیدرآباد منتقل ہوگئے۔ علم منطق، علم معانی، علوم متداولہ میں ماہر تھے۔ آپ کے احباب میں نواب عبدالعلی خان بہادر اور فرزند نواب شمشیر جنگ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ ایک کامیاب مدرس تھے۔ جوش کے اجداد سلاطین بیجاپور کے مقربین میں تھے۔ جوش اہل بیت اطہر سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔(۱)

جوش کی شاعری میں غزل سلام مرثیہ قصیدہ نوحے رباعی کثرت سے ملتے ہیں۔ مدارس میں جوش اپنے کلام پر میر طاہر علی غریب سے اصلاح لیتے تھے۔ حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد بلگرامی سے رجوع ہوگئے۔ کلام بہت پاکیزہ اور درد وآہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جوش کے کلیات میں فارسی کلام بھی موجود ہے۔ اردو کا نمونہ کلام درج ہے۔

لگا اک وار اور ایسا کہ قصہ پاک ہوجائے
نہایت کرب میں ہے، یہ ترے گھائل کی صورت ہے
وصل میں ان کا حجاب دیکھئے کب تک رہے
چاند پہ چھایا سحاب دیکھئے کب تک رہے

☆☆

(۱) غلام صمدانی خان گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر بلفتح حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ۔(۴۵)

سید محمد کاظم حبیبؔ کنتوری

سید محمد کاظم نام اور تخلص حبیب تھا۔ کنتور ایک موضع تھا جو ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) میں موجود ہے۔ آپ اسی موضع کی نسبت سے حبیب کنتوری نام سے مشہور و مقبول ہوئے۔ آپ کی ولادت ۱۲رذی الحجہ ۱۲۶۷ ہجری کو کنتور میں ہوئی۔ بچپن میں اردو عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے جد اعلیٰ کا سلسلہ نسب حضرت عباسؓ سے ملتا ہے اور حضرت سید امام موسیٰ کاظم تک یہ نسبت پہنچتی ہے۔ حبیب ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد آئے اور محکمۂ پولیس میں میر منشی کی نوکری پر فائز ہو گئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ حبیب کنتوری کے دو فرزند تھے ایک سید محمد ضامن کنتوری اور سید محمد مظفر کنتوری (۱)

حبیب کنتوری کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ انہوں نے حضرت محمد کاظم سے اصلاح لی۔ آپ کے کئی تصانیف مشہور و مقبول ہوئے۔ آپ کا ایک دیوان قلمی کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ نمونہ کے طور پر غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ دو غزلوں سے ان کے یہ اشعار انتخاب کئے گئے ہیں۔

حسن جب صورت گر ذوق خود آرائی ہوا
ہر بت بیباک گرم لاف یکتائی ہوا

دیکھ کر آئینۂ وحدت میں کثرت کا جمال
محشرستانِ تعین کنج تنہائی ہوا

دوسری غزل کے اشعار:

سر ہے جب تک ترے سودائی کا
شور کم ہوگا نہ رسوائی کا

کھینچتا اس کی خیالی تصویر
مشغلہ ہے مری تنہائی کا

☆☆

(۱) غلام صمدانی خان گوہر، تزکِ محبوبیہ، جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ۔(۵۱)

حضرت محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی حسرت

نام محمد عبدالقدیر صدیقی تھا اور تخلص حسرت فرماتے تھے۔ آپ کے والد بعہد نواب صلابت جاہ احمد نگر گجرات سے دکن تشریف لائے۔ دکن میں آپ رشد و ہدایت کا درس دیتے رہے اور مملکتِ آصفیہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ حسرت ۲۷ر رجب المرجب ۱۲۸۸ء بروز جمعہ ۱۱ر ساعت تولد ہوئے (۱) آپ کا سلسلہ نسب ۱۲۸ اٹھائیس واسطوں سے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق سے جا ملتا ہے۔ آپ کی تعلیم دار العلوم حیدر آباد میں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے علاوہ منطق فلسفہ عربی، اردو، فارسی میں کافی عبور حاصل کر لیا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد ملازمت کی دنیا میں قدم رکھا۔ ابتداء میں دار العلوم حیدر آباد میں تقرر ہوا۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے صدر منتخب ہوئے۔ وظیفہ ہونے کے بعد ملازمت میں گیارہ سال تک توسیع دی گئی۔ ۱۳۴۳ر فصلی م ۱۹۳۲ء کو وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

حسرت کا خاندانی سلسلہ پیری مریدی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے آپ نے بھی اپنے حلقۂ احباب میں اسی طریقت کو جاری رکھا۔ آپ حضرت خواجہ محمد صدیق محبوب اللہ کے مرید تھے۔ زندگی کا زیادہ وقت ذکر و اذکار میں گزارتے تھے۔ آپ کو اپنے والد عبدالقادر صدیقی صاحب سے بھی سلسلہ بیعت حاصل تھا۔ حسرت کو بچپن سے ہی بزرگان دین سے خلافت کے سبب خاص مقام حاصل ہو گیا تھا۔ حضرت حسرت کی ذات میں علم و معرفت اور اخلاص و عبودیت جمع ہو گئے تھے اور وہ دوسروں کو بھی اسی طرح کی زندگی گزارنے کی تلقین فرماتے تھے۔

آپ کی علمی ادبی خدمات پر بہت لکھا جا سکتا ہے۔ حسرت، تفسیر، حدیث، عقاید،

تصوف، منطق، فلسفہ کلام وغیرہ کے ماہر تھے۔ آپ کا مقام علماء فضلا میں نمایاں تھا۔ فن موسیقی و شعر گوئی سے بچپن ہی سے شغف تھا۔ اس کے علاوہ بنوٹ، کشتی اور فنون حرب سے خاص دلچسپی اور مہارت رکھتے تھے۔ حسرت نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ خوش نویسی اور خطاطی میں بھی کمال حاصل کیا۔ انگریزی میں بھی حسب ضرورت استعداد پیدا کی آپ کے اساتذہ آپ کی ذہانت کے معترف تھے۔ انہیں تحریر اور انشا پردازی پر دسترس حاصل تھی۔ مولانا حسرت کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ صرف کالج تک ہی محدود نہ تھا بلکہ گھر پر بھی وہ حدیث، تفسیر، قرات اور دیگر علوم دین کے طالب علموں کو درس دیتے تھے۔ طالب علم ان سے اہم موضوعات پر استفسار کرتے۔ مشکل سے مشکل مسائل آپ آسانی سے سمجھا دیتے۔ جب مراتب کا خیال رکھتے۔ محبت اور شفقت میں یکساں برتاؤ ہوتا۔ مزاج میں انتہائی سادگی تھی (۲) حج وزیارت مقام مقدسہ سے بھی مشرف ہوئے۔ حج میں متعدد رفقاء آپ کے ساتھ تھے۔ قابل ذکر مولانا الیاس برنی ہیں۔ ان سب کی تفصیلات مولانا الیاس برنی صاحب کے سفرنامہ میں موجود ہیں۔

مذہبی رہنما ہونے کی وجہ سے آپ کے وعظ ونصیحت کا انداز بڑا دلنشین ہوتا۔ آپ کے مکان میں حلقہ ذکر وشغل اور محافل درس وعرفان بھی ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ میاں صاحب قبلہ سے فیض ظاہری و باطنی پایا۔

حسرت نے پہلی شادی حضرت کی چچازاد بہن بادشاہ بیگم بنت غلام حسین سے کی موصوفہ کی رحلت کے بعد دوسری شادی عائشہ بیگم صاحب بنت شاہ احسان الحق سے کی۔ جب آپ کا بھی انتقال ہوگیا تو تیسری شادی فرخ بیگم صاحبہ بنت حکیم سید حبیب الرحمٰن صاحب سے عمل میں آئی۔ یہ اہلیہ صرف نو ماہ زندہ رہی اور انتقال فرمایا۔ چوتھی شادی سید بی بی رابعہ مدنی بنت سید اکبر علی سے فرمائی۔ چار بیویوں سے آپ کو چوبیس اولادیں ہوئی۔ حسرت نے ۱۷ر شوال ۱۳۸۱ھ م ۲۴ر مارچ ۱۹۶۲ء کو وصال فرمایا۔

ذیل میں حضرت کے تصانیف کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

شاعری:۔ حضرت حسرت نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی (۳)

(۱) حمد ومدح:۔ اس کے تحت حمد و مدح آتے ہیں جو انہوں نے سلطان الوجود کی شان میں لکھے ہیں اس کے علاوہ نعت شریف، اس میں سنت نبوی اکرمؐ اور اولیائے اکرام

کی سبقت داخل ہے۔ان کے اس دیوان کے حصہ کا نام "محبت ہے"۔

(۲) معیار الحق:- یہ پچاس رباعیات کا مجموعہ ہے۔جس میں ہر رباعی میں تصوف کے کسی نہ کسی سلسلہ کی تفہیم کی ہے۔

(۳) مراۃ الحقائق:- اس طویل نظم میں تصوف کے معرکتہ الآرا مسائل کو سمجھا گیا ہے۔جس، میں سورہ فاتحہ، معارف علم، اقسام حکماوغیرہ درج ہیں۔

(۴) مراۃ الصدق:- اس رسالہ میں انہوں نے قرآن وحدیث سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جو فضیلت ہے ثابت کی ہے۔اس کو منظوم فرمایا ہے۔ہر شعر کے ساتھ احادیث معہ ترجمہ پیش کئے ہیں۔

(۵) تحفہ اطفال:- آسان زبان میں تحفہ اطفال کے نام سے ایک نظم لکھی ہے۔ نظم اتنی سادہ اور آسان زبان اسلوب میں ہے کہ کمسن بچے بغیر کسی مدد کے آسانی سے خود سمجھ سکتے ہیں (۴) حضرت حسرت نہ صرف شاعر تھے بلکہ مفسر قرآن، ایک عالم دین دار، صاحب وصف وکرامات مرشد تھے۔آپ نے تفسیر صدیقی کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ عام فہم اور آسان زبان میں فرمایا۔اس کے علاوہ لاتعداد مضامین علمی مذہبی مکالے لکھے ہیں۔ جن میں قابل ذکر حقیقت بیعت، التوحید، قول وفعل، سماع، دین فطرت، کلمہ طیبہ۔ابلیس ازم، درس قرآن، شجرۃ الکون، انتخاب شاہ نامہ، روح ادب وغیرہ مشہور ہیں۔آپ کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔نعت شریف کے دو شعر۔

تم پہ ہوجاؤں میں قربان رسول عربی
تم میری جان کی ہو جان رسول عربی
سوادِ دیدہ بنکر جائے لی ہے چشم انسان نے
زمین پر کس طرح سایہ گرے قد محمد کا

حضرت حسرت کے کلام میں تصوف کی جھلک نمایاں ہے۔ذیل میں چند شعر درج ہیں۔

میں جلوہ، محبوب میں بت بن کے کھڑا ہوں
وہ بھی ہیں کھڑے محو تماشا میرے آگے

یادِ نگہہ مست میں تھا بے خبران سے
بیکار رہے ساغر و مینا مرے آگے

☆☆

(۱) محمد انورالدین صدیقی، صدیقی خواب......، حیدرآباد، ۱۳۷۵ء، صفحہ۔(۸)

(۲) حافظ محمد مظہر، دارالعلوم کے سپوت، حیدرآباد، ۱۹۵۳ء، صفحہ۔(۲۰)

(۳) تسکین عابدی، سخنورانِ دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ۔(۱۶۸)

(۴) محمد انورالدین صدیقی خورن لفی، حیدرآباد ۱۳۷۵ھ، صفحہ۔(۱۵)

محمد جمال الدین خاں حلم

نام محمد جمال الدین خاں اور تخلص حلم تھا۔ حلم کا سلسلہ والدہ کی طرف سے خانوادہ آصفیہ سے جاملتا ہے۔ آپ کی ولادت ۱۲۷۶ھ میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ آپ کے جداعلیٰ قاضی بدرالدین حسین خاں تھے۔ جناب حلم کی تعلیم اپنے والد منیرالدین خاں صادق جنگ ثانی کی نگرانی میں ہوئی مدرسہ عالیہ سے مڈل کامیاب کیا۔ اس زمانے میں ساتویں جماعت کامیاب کرنا بڑا کمال تھا۔ جناب حلم وہ واحد فرزند جاگیردار تھے جنہوں نے مڈل کامیاب کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حلم کو شہزادہ میر عثمان علی خان کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ عہد محبوبیہ کے چالیس سالہ جشن سالگرہ ۱۳۱۱ھ میں انہیں خان بہادر، منصب دوہزاری اور صادق جنگ ثالث کے خطاب سے نوازے گئے۔

جناب حلم کا عقد نواب رسول یار خان محی الدولہ کی صاحبزادی سے ہوا جن سے دو لڑکے تولد ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد حلم کی بیوی اور بچوں کا انتقال ہوگیا انھوں نے دوسری شادی کی حلم (۶۳) سال کی عمر پا کر وفات پا گئے (۱)

شاعری کا شوق حلم کو بچپن سے تھا۔ حلم ہندی زبان پر کافی عبور رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کے کلام میں ٹھمریاں بھی ملتی ہیں۔ جناب حلم ڈاکٹر مائل حیدرآبادی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ ان کے فرزند نے ''پیت کی ریت'' کے نام سے شائع کیا۔ حلم کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نمونہ کے طور پر غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

چشم ساقی کی بدولت اک جہاں مدہوش ہے
میکدے کی عقل گم ہے ہوش بھی بے ہوش ہے

بزم میں ساقی کی مستی کا کچھ ایسا ہے اثر
عقل کی ہے عقل گم اور ہوش بھی بے ہوش ہے

زندگی ہوتی بسر ہے حلم کی کس لطف سے
شاہد مقصود سے دن رات ہم آغوش ہے

آخر میں جناب حلم کی ٹھُمری کے بھی چند بند درج کیے جاتے ہیں:

دور نہیں میں پاس ہوں سب کے
مجھ کو کوئی ڈھونڈے تو
پھیر و جدھر مکھ سامنے ہوں میں
کھول کے آنکھیں دیکھو تو
حلم نہیں میں اور ہی کچھ ہوں
جانو، بوجھو، سوچو تو

دوسری ٹھُمری کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

یہ کام کسو کی یاری ہے
میں اور میرا یار بھلا
سانچ کہت ہوں سن ری مائیں
ہر پل مورے سنگ ہیں سائیں
ہر گھٹ میں واکی پرچھائیں
خلوت سے بازار بھلا
ہاتھی گھوڑا اونٹ چڑھت ہوں
دھن دولت سب پاس رکھت ہوں
بھولی سب جگ دھندے میں
قلم کو اپنا کار بھلا

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، طبقۂ امراء حیدرآباد۔ ۱۳۱۹ء، صفحہ۔(۸)

منشی شمس الدین محمد امیر حمزہ

حمزہ کا اصلی نام محمد شمس الدین تھا اور عرفیت امیر حمزہ تھی۔ سچ پوچھئے ''تو داستان امیر حمزہ'' کے حافظ تھے اس لئے امیر حمزہ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ امیر حمزہ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں قندھار ضلع ناندیڑ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب محمد سالار غیور ایک جید عالم اور مدرس تھے(۱) چنانچہ امیر حمزہ کی ابتدائی تعلیم ان ہی کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ حمزہ اردو کے علاوہ فارسی کے بھی ماہر تھے۔ ان کے والد غیور طبیعت کے حامل اور اچھے شاعر بھی تھے چنانچہ حمزہ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ وہ اپنے کلام پر والد ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ والد کے بعد ظفر الدین معلیٰ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حمزہ نے ابتدائی ملازمت محکمہ مال سے شروع کی پھر ترقی کرتے ہوئے ۱۲۹۱ھ میں محکمہ ٹپہ میں منتقل ہوگئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ ۱۳۳۷ھ میں حمزہ نے اکسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔(۱)

حمزہ نے کئی بلند پایہ تصانیف تخلیق کیں جیسے تاریخ قندھار دکن۔ تاریخ کولاس، روضہ شہید (سوانح شاہ عنایت اللہ حسینی شہید) مکاشفات سروری وغیرہ۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی نثری اور منظوم ڈرامے لکھے جیسے سحر سامری، غنچۂ اکبری، سامر سبھا، سحر مومن، گل وبلبل، شرارِ عشق اور جوہر خنجر وغیرہ۔

امیر حمزہ کا محبوب مشغلہ شاعری تھا۔ اگرچہ ان کا نثری سرمایہ کافی ہے مگر شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی اس لئے انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی جیسے غزل، قصیدہ، نعت، نظم اور ٹھمری وغیرہ۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''چمنستان شعراء'' کے نام سے شائع ہوا جس میں قصیدے اور ٹھمریاں شامل ہیں۔ حمزہ نے نعتیہ ٹھمریاں بھی لکھیں۔ اس زمانے میں اعظم علی شائق کے بعد ان ہی کا درجہ بلند تھا۔ چمنستان حمزہ کے مجموعے سے چند اشعار پیش

کئے جاتے ہیں۔

حمد کے اشعار:

یا رب یہ سب ہے کام تیرا عالم میں ہے انتظام تیرا
جن ہوں کہ ملک ہوں یا بشر ہوں ہے سب کی زباں پہ نام تیرا
گو شان ہے تیری بے زبانی موسیٰ نے سنا کلام تیرا(۲)

نعت کے اشعار:

عشقِ محبوب خدا کی رہنمائی دل نے کی
مل گیا اللہ کے گھر سے نشانِ مصطفیٰ
بیخودی نے دیکھنا اللہ تک پہنچا دیا
ڈھونڈنے نکلے تھے ہم گھر سے نشانِ مصطفیٰ

حمزہ کے پاس ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جس میں انہوں نے الفاظ کی تکرار سے شعر میں لطافت پیدا کی ہے۔مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

کہیں چشم سپہر کو پیارے نبی کوئی تجھ سا حسین بشر نہ ملا
کہیں تیری نظر کو نظر نہ لگے تو کسی کی نظر سے نظر نہ ملا

حمزہ کو اپنے وطن سے بے پناہ لگاؤ تھا۔وہ اپنے قندھاری ہونے پر فخر کرتے تھے۔انہوں نے اپنی غزلوں اور متعدد اشعار میں قندھار کا اکثر ذکر کیا ہے۔نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کی خدمت میں حمزہ نے قلعہ قندھار کی زبانی ایک عرضی پیش کی تھی۔ ذیل میں اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

اے مرے والی مرے سلطان عالی منزلت
عہد میں تیرے زمانہ اک گلِ بے خار ہے
ہے زمانے پر ترا ابرِ کرم سایہ فگن
اک، گھرِ محروم بخشش قلعۂ قندھار ہے
ہو خدارا اب تو میری خستہ حالی پر نظر
بس یہی اک التجائے قلعۂ قندھار ہے

امیر حمزہ کی ٹھمریوں میں وطن دوستی کے جذبات ملتے ہیں۔ ذیل کے اشعار اس کی ترجمانی کرتے ہیں:

دھیان آجاتا ہے جب اپنی سیہ کاری کا
منہ تکا کرتا ہوں یارب تری غفاری کا
ہو شفاعت سے یقین جبکہ سبک ساری کا
بول بالا ہو نہ کیوں حمزہ قندھاری کا

حمزہ کی ٹھمریاں بے حد مقبول ہوئیں۔ قصبات و مواضعات کی میلاد کی محفلوں میں ان کی لکھی ہوئی ٹھمریاں اکثر پڑھی جاتی تھیں۔ ٹھمریوں کے چند بند درج کئے جاتے ہیں:

نبی جیؐ کی کہانی جب میں دنیا میں آئی
میں نے کیا کی برائی ان سے جو دل لگائی
پر وہ نزدیک مجھ کو بلاتے نہیں
کوئی دنیا میں کیا دل لگاتے نہیں(۳)

☆☆

(۱) محمد اکبرالدین صدیقی مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ۔(۱۷۷)

(۲) محمد اکبرالدین صدیقی مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ۔(۱۸۳)

(۳) محمد امیر حمزہ، دیوان چمنستان حمزہ، حیدرآباد، ۱۳۳۹ھ، صفحہ۔(۱۳۶)

صغرا بیگم حیا

نام صغرا بیگم اور تخلص حیا تھا۔ حیا کی ولادت ۱۸۸۲ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی آپ کے والد حاجی مقتدر علی مرزا حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر گزرے ہیں۔ حیا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مطالعہ کا بہت شوق تھا اس بنا پر آپ کی تعلیم کا سلسلہ گھر پر ہی رہا۔ عہد محبوبیہ میں خواتین کا مدرسہ مین تعلیم دلوانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ حیا نے بھی گھر ہی پر تعلیم مکمل کی۔

آپ کئی کتاب کی مصنفہ تھیں۔ اب تک جو تخلیقات شائع ہوئیں ان میں قابلِ ذکر حسب ذیل ہیں۔

(۱) مشیر نسوان (۲) تحریر النسا (۳) سفینۂ نجات (۴) سرگزشت ہاجرہ (۵) مجموعہ نصائح (۶) موہنی (۷) مقالات صغرا (۸) آوازِ غیب (۹) سفرنامہ عراق (۱۰) سفرنامہ پونا (۱۱) سفرنامۂ یوروپ (دو جلدوں میں) (۱۲) سیر بہار و بنگال (۱۳) سیاحت جنوبی (۱۴) رہبر کشمیر وغیرہ (۱)۔

ان تمام تصانیف کے علاوہ آپ کے کئی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ ایک رسالہ "النسا" کے نام سے شائع کرتی تھیں۔ حیا کو شاعری کا بھی بچپن سے شوق تھا اپنے کلام پر حضرت جلیل سے اصلاح لیتی تھیں۔ ان کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں تغزل بھی ہے اور تصوف بھی۔

دیر و حرم کلیسا بیکار کا ہے جھگڑا
یہ سب ہیں تیرے مسکن جس جا پہ دیکھو تو ہے
نہ جینے کی خوشی مجھ کو، نہ مرنے کا الم کچھ ہے
جو ہوتا ہے مقدر میں وہ ہوجائے تو ہوجائے

رقیب روسیہ سے ہو عبث امید نیکی کی
کوئی کانٹا میرے حق میں وہ بو جائے تو بو جائے (۲)

آپ کے کلام میں تمام اصناف ملتے ہیں۔غزل اور نظم کے علاوہ نثر میں بھی کمال حاصل تھا۔اچھی مقرر بھی تھیں۔محفل خواتین کی ہو یا مردانہ آپ تقریر کرنے میں کبھی گھبراتی نہیں تھیں۔قومی کاموں کا بھی بڑا شوق تھا۔غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

آنکھ میں نور ہو دل میرا منور ہو جائے جز تجلی کے ترے اور نظر کچھ بھی نہ آئے

ناز کیونکر نہ کروں اپنے مقدر پہ بھلا
کھل گیئی دل کی کلی روضۂ خواجہ دیکھا (۳)

☆☆

(۱) نصیرالدین ہاشمی۔خواتین دکن کی اردو خدمات۔حیدرآباد۔۱۳۵۹ھ،صفحہ۔(۳۱)
(۲) نصیرالدین ہاشمی۔خواتین دکن کی اردو خدمات۔حیدرآباد۔۱۳۵۹ھ،صفحہ۔(۳۱)
(۳) تسکین عابدی۔سخنوران دکن۔حیدرآباد۔۱۳۵۷ھ،صفحہ۔(۴۶)

سیتل پرشاد خرمؔ

نام سیتل پرشاد تھا اور خرم تخلص فرماتے تھے۔کائستھ خاندان سے تعلق تھا۔خرم کی ولادت ۴ا ربیع الاول ۱۲۳۸ھ م ۱۸۲۲ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔خرم کے والد بچھمی پرشاد نے آپ کی تعلیم کا خاص انتظام کیا تھا۔خرم کے جد اعلےٰ راجہ بچھمی چندو یر بہادر کٹرا مانک پور علاقہ کے دیوان تھے۔یہ علاقہ دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔جناب خرم فارسی، عربی اردو کے علاوہ سیاق وسباق سے بخوبی واقف تھے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے صرف خاص مبارک میں ملازمت اختیار کرلی۔چالیس روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔آپ کے صرف ایک فرزند للتا پرشاد تھے۔خرم کا مکان اندرون لعل دروازہ تھا۔للتا پرشاد کی کم عمری میں شادی کردی گئی۔ان کو صرف ایک فرزند ہے۔جناب خرم نے طویل عمر پائی (۸۴) سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔

جناب خرم کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔وہ اپنے کلام پر حضرت فیض سے اصلاح لیتے تھے۔جناب خرم کو شاعری کے تمام اصناف میں کمال حاصل تھا۔خاص کر فن تاریخ گوئی میں انھوں نے بڑی مہارت پیدا کی تھی۔(۱)

خرم کے کلام کی خوبی یہ تھی کہ کلام صاف وسادہ تھا آسان زبان میں شعر کہتے تھے۔معنوی اعتبار سے بھی کلام خوب تھا۔استاد کے انتقال کے بعد ان کے سالانہ عرس کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور طرحی غزل کہتے تھے۔کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

جس کو دیکھو آشنا ہے دولت و اقبال کا
بیکسی میں کون ساتھی ہے کسی کے حال کا

میں نے تو سر دیدیا دل دیدیا اور جان دی
تم بھی کچھ دید و تصدق حسن کے اقبال کا

عشق نے جوگی بنایا ہے اس آہو چشم کا

وحشیو مجھ کو بچھونا ہو ہرن کی کھال کا
میں بنوں خرم انھیں کے فیض سے اے حاسدو
بند کردوں ناطقہ گویا کہ قیل و قال کا(۲)

خرم کے بارے میں تلاش بسیار کے باوجود صرف مختصر مواد دستیاب ہوا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کی تصانیف دکن میں اردو اور دکنی ہندو اور اردو میں جو مواد ہے، وہ تزک محبوبیہ ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ خرم کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شعرا کی طرح انھوں نے بھی معاملہ بندی اور حسن وعشق کے موضوع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

ہم کو فراق یار نے ناچار کردیا   عشق ستم شعار نے بیمار کردیا
اک درخت رز کے عشق نے میخوار کردیا   تر شیخ جی کا جبہ و دستار کردیا

خرم کو اپنے استادِ سخن حضرت فیض سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کے سالانہ عرس اور مشاعروں میں پابندی سے جاتے تھے اور استاد کے مصرع طرح پر غزل سناتے تھے۔ ایک طرحی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جدائی کی شکایت کررہا تھا   جھکا کر سر کو رب العالمین سے
یکا یک آکے وہ بت میرے نزدیک   کہا دیکھو تو چشم دور میں ہے
جناب فیض کی درگاہ ہے فیاض
ہے خرم فیض عالم کو یہیں سے (۳)

جب زمانہ کا الٰہی رنگ دیگر ہوگیا   دل غم ہجر بتاں کھا کھا کے پتھر ہوگیا
دشت میں بھی تیرے عاشق کو بہت آرام ہے   کوہ کا دامن اے دامانِ مادر ہوگیا
عشق نے خرم ملایا ہم کو ایسا خاک میں
کاسۂ دست گدایاں کاسۂ سر ہوگیا(۴)

---

(۱) نصیرالدین ہاشمی، دکنی ہندو اور حیدرآباد۔ ۱۹۵۸ء، صفحہ۔ (۲۳)

(۲) غلام صمدانی گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، طبقہ شعراء، صفحہ۔ (۵۷)

(۳) گلدستہ فیض، حیدرآباد۔ ۱۳۲۴ھ، صفحہ۔ (۲۷)

(۴) عبداللہ خاں ضیغم۔ یادگار ضیغم۔ قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو، داخلہ نشان (۴۹۶) صفحہ۔ (۲۳۸)

بدر النسا بیگم خفی

نام بدر النساء اور تخلص خفی تھا۔ خفی کی ولادت حیدر آباد میں ۱۲۸۰ھ میں ہوئی آپ کی تعلیم و تربیت گھریلو ماحول میں ہوئی۔ اپنے گھر پر ہی خاتون اساتذہ سے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ خفی کے والد محمد ابوالفیض سعید الدین کی ملازمت نارائن پیٹ میں تھی۔ والدین ہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر احمد حسین مائل بھی وہیں رہتے تھے چنانچہ اطراف بلدہ کا علاقہ بھی شعر و ادب کی محفلوں سے آراستہ ہوتا تھا۔ ماحول کے ان اثرات سے خفی بھی متاثر ہوئیں اور شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوگئی۔

خفی حضرت مائل سے اصلاحِ سخن حاصل کرتی تھیں۔ خفی کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ ان میں غزل، رباعی، مرثیہ قطعہ وغیرہ۔ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا ایک دیوان بھی شائع ہوا تھا۔ مگر اب دستیاب نہیں۔ چند اشعار غزل کے ملاحظہ ہوں (۱)

حجاب منہ سے اٹھا چکے ہیں، مجھے وہ صورت دکھا چکے ہیں
مری نظر میں سما چکے ہیں۔ نظر سے پھر دل میں آ چکے ہیں

کاش تدبیر سے تقدیر موافق ہوتی
خانۂ دل میں ہم اس شاہ کو مہماں کرتے

اے خفی حضرت یوسف اگر اس دم ہوتے
حسن احمد کو دکھا کر انہیں حیراں کرتے (۲)

☆☆

(۱)(۲) نصیر الدین ہاشمی، خواتین دکن کی اردو خدمات۔ حیدر آباد۔ ۱۳۵۹ء، صفحہ۔ (۳۵)

حضرت سید محمد صدیق حسینی خلقؒ

سید محمد صدیق حسینی نام خلق تخلص اور خواجہ میاں عرفیت تھی آپ کے والد حضرت سید محمد پرورش المعروف بادشاہ حسینی کے نام سے مشہور تھے۔اور شاہ تخلص فرماتے تھے۔خلق کا تعلق پیری مریدی گھرانے سے تھا اس لئے آپ کا زیادہ تر کلام مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔حضرت خلق کی ولادت ۲۹ رشعبان ۱۲۶۳ھ حیدرآباد میں ہوئی مادہ تاریخ ولادت چراغ ہند (۱۲۶۳ھ) ہے حضرت خلق کا خاندانی سلسلہ بیس واسطوں سے سید امام تقی بن سید امام علی الرضاء سے ملتا ہے(۱) حضرت خلق کے جد اعلیٰ حضرت سید محی الدین قدس سرہ نواب میر نظام علی خان آصف جاہ اول کے ساتھ دکن تشریف لائے تھے۔حضرت خلق کے والد حضرت بادشاہ حسینی آصف جاہ خامس افضل الدولہ کے اتالیق مقرر ہوئے (۲) حضرت خلق عربی فارسی اور اردو ادب کے علاوہ منطق تفسیر حدیث فقہ میں بھی کامل عبور رکھے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم حضرت مولانا نیاز محمد خان برادر مولوی زماں خان صاحب شہید سے حاصل کی اس کے علاوہ فن طب میں بھی دخل تھا۔فن خوشنویسی سے آپ اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔آپ کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔آپ کے تین فرزند تھے۔بڑے فرزند حضرت سید عثمان حسینی فائق دوسرے حضرت سید محمد یحیٰ حسینی حاذق جانشین سلسلہ طریقت ہوئے اور تیسرے فرزند حضرت سید محمد باقر حسینی طارق تھے۔حضرت یحیٰ حسینی حاذق بھی جید عالم اور پیر طریقت تھے آپ کے فرزند کا نام سید محی الدینی حسینی اور تخلص محی تھا۔آپ بھی عالم دین اور پیرومرشد تھے۔فی زمانہ آپ کے پانچ صاحب زادے اول سید محمد صدیق حسینی عارف دوم ڈاکٹر سید ابو عبداللہ الحسینی سوم ڈاکٹر سید عبدالقادر حسینی لکچرار عربی چہارم میر برکت اللہ حسینی اور پنجم سید خواجہ محمد تقی حسینی موجود ہیں۔سب سے بڑے صاحب زادے حضرت خلق

کے پڑپوتے سید محمد صدیق حسینی عارف جانشین سلسلہ طریقت ہیں۔ آپ بھی اپنے جد اعلیٰ کی طرح ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور دائرۃ المعارف حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔

حضرت خلق نے استادکل حضرت شمس الدین فیض کے آگے زانوے ادب تہہ کیا تھا۔ فیض کی مدح میں انہوں نے ایک نظم لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

میرے استاد میرے پیشوا فیض
مرے ہادی مرے ہیں رہنما فیض
نہ بھولوں گا کبھی ناز آپ کا فیض
مرے پر بھی زبان پر ہوگا یا فیض
دعا دے خلق کیجئے ہاتھ اٹھا کر
جزاک اللہ خیر مرحبا فیض

حضرت خلق کی شاعری میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں آپ کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

محبت میں نام اپنا کر جایئے
یہی جی میں آتا ہے مر جایئے
میرے دل میں ہرگز نہ پاؤ گے دخل
خدا کیلئے اپنے گھر جایئے (۳)

حضرت خلق کے دیوان کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ کیوں ہوگیا دل کو سودا کسی کا
نہ لینا کسی کا نہ دینا کسی کا
ڈراتے ہو کیا تیغ ابرو سے ہم کو
نہیں جان پر اپنی قبضہ کسی کا

☆☆

(۱) محی الدین سید گلدستہ تجلیات، ۱۴۱۳ھ، صفحہ۔۶

(۲) محی الدین سید گلدستہ تجلیات، ۱۴۱۳ھ، صفحہ۔۶

(۳) سید محمد صدیقی حسینی عارف افکار غیب، حیدرآباد، ۱۹۹۳ء، صفحہ۔۷۲

نواب مرزا خاں داغؔ

نام ابراہیم خان تھا جوان کے والدین نے رکھا تھا۔ جب داغ سن شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنا نام ابراہیم خان سے بدل کر مرزا خاں رکھ لیا۔ ممکن ہے کہ لال قلعہ کی پرورش سے انہوں نے اپنے نام میں نواب بھی شامل کر لیا ہو۔ اس طرح نواب مرزا خاں داغ ہو گئے۔ داغ کی ولادت کوچۂ چاندنی چوک دہلی میں ۲۵ رمئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی (۱) داغ کے نانا محمد یوسف سادہ کار کشمیری کو دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک عمدہ بیگم دوسری وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم، مرزا داغ چھوٹی بیگم کی اولاد تھے۔ چھوٹی بیگم کے ساتھ داغ لال قلعہ پہنچ گئے۔ اس وقت داغ کی عمر تقریباً ۱۲ سال تھی۔ یہاں انہوں نے غلام حسین شکیب کے صاحبزادے مولوی سید احمد حسین سے فارسی اور اردو کتابیں پڑھیں۔ اس عہد کے مشہور خوشنویس سید امر پنجہ کش دہلوی سے فن خوشنویسی میں مہارت حاصل کی۔ داغ بہت خوش نصیب تھے انہوں نے ایسے ایسے فنون میں بھی مہارت حاصل کی جو شہزادے اور امرا حاصل کرتے ہیں۔ مرزا فخرو نے مرزا خاں کا تخلص داغ رکھا اور استاد ذوق کے تلامذہ میں شامل کر دیا۔ (۱)

ابھی مرزا داغ پندرہ سال کے تھے کہ ان کی خالہ زاد بہن فاطمہ بیگم سے ان کی شادی کر دی گئی۔ فاطمہ بیگم نواب یوسف علی خاں کی صاحبزادی تھیں۔ داغ ابھی تلاش معاش کی جستجو میں تھے کہ دہلی میں غدر شروع ہو گیا۔ لال قلعہ برباد ہو گیا۔ شاعرانہ محفلیں اجڑ گئیں۔ داغ رام پور کی راہ گامزن ہوئے۔ والی رام پور نواب یوسف علی خاں کچھ عرصہ داغ کی آؤ بھگت کرنے کے بعد وفات پا گئے۔ ان کی جگہ کلب علی خاں تخت نشین ہوئے۔ داغ کی ذہانت اور مختلف فنون میں مہارت سے کلب علی خاں کافی متاثر ہوئے اور انہیں ۱۴ را پریل ۱۸۶۶ھ میں زمرہ مصاحبین میں شامل کر لیا اور کارخانہ جات فراشی خانہ اور اصطبل کی نگرانی

ان کے سپرد ہوئی۔ ستر روپے ماہوار تنخواہ پانے لگے۔ رام پور میں داغ کے گھر ایک لڑکا احمد مرزا تولد ہوا لیکن بچپن ہی میں فوت ہوگیا۔ داغ کو اس حادثہ کا بہت رنج ہوا۔

داغ کے عشق کی داستان بھی بہت مشہور ہے۔ داغ اپنی پختہ عمر میں ایک طوائف منی جان کے عشق میں گرفتار ہوگئے (۲) یہ سلسلہ تقریباً تیس سال تک جاری رہا۔ داغ کے انتقال سے دو سال قبل یہ سلسلہ تلخیوں کے ساتھ ٹوٹ گیا۔

کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے فرزند مشتاق علی خاں مسند نشین ہوئے انہیں شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نواب صاحب نے داغ کو نوکری سے علیحدہ کر دیا یا داغ مستعفی ہوگئے یہ امر تحقیق طلب ہے۔ داغ رام پور چھوڑ کر دہلی لوٹ آئے۔ (۲)

دلی میں قیام زیادہ دن نہ رہا۔ وہاں سے امرتسر، کشن کوٹ، اجمیر، آگرہ، علی گڑھ اور جے پور وغیرہ کا سفر اختیار کیا۔ پھر حیدرآباد کا رخ کیا۔ اس زمانے میں حیدرآباد علم وادب کا گہوارہ تھا۔ سارے ہندوستان کے راجہ مہاراجہ اور نوابوں کے دربار اجڑ گئے تھے۔ صرف دکن کی آصفیہ سلطنت اپنے پورے آب و تاب سے رواں دواں تھی۔ ایسے میں داغ ۱۲ر جولائی ۱۸۸۹ میں حیدرآباد وارد ہوئے مگر دربارشاہی تک رسائی نہیں ہوئی۔ چند روز سیف الحق ادیب کے مہمان رہے۔ پھر دلی چلے گئے۔ جناب حاجی ابراہیم خان ساماں شاہی سے داغ کی خط و کتابت تھی۔ وہ شعر وادب کے دلدادہ تھے۔ اور داغ کے پرستاروں میں سے تھے۔ انہوں نے پھر داغ کو حیدرآباد آنے کی ترغیب دی (۳) راجہ گردھاری پرشاد باقی اور خانساماں کو آصفجاہ سادس کا تقریب حاصل تھا۔ انہوں نے داغ کے کلام کی تعریف کر کے داغ کی شہرت سے واقف کرایا اور داغ کا لکھا ہوا ایک قصیدہ بھی شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اس قصیدے کے دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

میں ہوا بادیہ پیما طرف ملک دکن
سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گردِ دامن

نازنینوں کی کمر بید کی شاخ لرزاں
موجہ ریگ رواں زلف پریشاں کی شکن (۳)

داغ کو حیدرآباد آکر تقریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ ہوگیا مگر شاہ دکن کے دربار

میں حاضری کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ یکا یک ۶ رفروری ۱۸۹۱ء کو نواب آصفجاہ سادس نے اپنی ایک غزل بغرض اصلاح سرفراز فرمائی اور پھر اتوار کی شب کو ۹ بجے چوبدار ایک سربمہر لفافہ میں غزل لیکر داغ کے گھر پہنچا اور صبح دربار میں حاضری کا مژدۂ جانفزا بھی سنایا (۴) دوسرے روز علی الصبح ۲۷ رجمادی الثانی ۱۳۰۵ھ م ۷ رفروری ۱۸۹۱ء۔ بروز دوشنبہ داغ حاضرِ دربار آصفجاہ سادس ہوئے۔ نذر پیش کی اور آصف جاہ کی حضور میں قصیدہ کے یہ اشعار نذر کیئے۔ (۴)

قدم بوسی حضرت کی حاصل ہوئی — بڑے شوق سے اور ارمان سے
حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر — یہ کہہ دو ملے داغ سلطان سے (۵)

۱۳۰۸ھ

داغ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ حضور آصفجاہ سادس کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ تقریباً ۱۴ برس تک داغ سلطان وقت کے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہے۔ چنانچہ آصف کے کلام میں اکثر جگہ مرزا داغ کیکلام کی جھلک ملتی ہے (۶)

ابتدا میں داغ کی تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی۔ تین سال تک یہی ماہوار ملتی رہی۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ کو ایک حکم نامہ کے ذریعہ ساڑھے پانچ سو کا اضافہ ہوا اور اس طرح جملہ ایک ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا (۷) اس کے علاوہ داغ دیگر اعزازات سے بھی نوازے گئے جہاں استاد، بلبل ہندوستان، نواب فصیح الملک، ناظم یار جنگ اور دبیر الدولہ خطابات سے سرفراز ہوئے۔

داغ کی جو قدر و منزلت حیدرآباد دکن میں ہوئی شائد ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ داغ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ شاہی امرا میں شامل کرلئے گئے۔ انہیں ایسا تقرب حاصل ہوگیا تھا کہ سفر و حضر و شکار میں ہر وقت بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اس سے داغ بھی بہت خوش تھے۔ ایک شعر میں اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا ہے۔

ہے لاکھ لاکھ شکر کہ اے داغ ہر طرح
آرام سے گزرتی ہے شاہ دکن کے پاس

حیدرآباد میں داغ کا قیام تقریباً سترہ سال رہا اس کے باوجود اپنا ذاتی گھر نہیں

تعمیر کیا کرایہ کی کوٹھی میں زندگی گزار دی۔اب حیدرآباد دکن میں ہر چھوٹا بڑا شاعر داغ کی شاگردی کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھنے لگا۔داغ بھی شاگردوں کے کلام کی صرف نوک پلک درست کرتے تھے۔زیادہ کانٹ چھانٹ کی عادت نہیں تھی۔

داغ کے مرض الموت کی تفصیل ''دبدبۂ آصفی'' ۶رذی الحجہ ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی تھی داغ آٹھ دن تک بستر علالت پر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے آخر ۷۴ سال کی عمر میں ۹رذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کی شام داعی اجل کو لبیک کہا۔آصفجاہ سادس کو اپنے استاد کی رحلت کا بہت ملال ہوا۔انہوں نے شاہی اعزازات کے ساتھ تجہیز و تکفین کا حکم دیا اور سرکاری خزانے سے تین ہزار روپے روانہ کئے۔اس دن عید الضحیٰ تھی۔صبح کو داغ کی نماز جنازہ حیدرآباد کی تاریخی مکہ مسجد میں ادا کی گئی اور یہاں سے جنازہ درگاہ یوسفین لے جایا گیا اور ان کی رفیق حیات کی قبر کے پہلو میں جانب جنوب درگاہ یوسفین میں سپرد خاک کیا گیا۔شعرا نے ہزاروں تاریخیں لکھیں ان میں ''نواب مرزا داغ'' سے ان کی وفات کی تاریخ نکل آتی ہے۔تاریخ مشرف جنگ فیاض نے نکالی ہے۔

داغ کی تمام شاعری جمالیاتی عناصر سے سرشار نظر آتی ہے۔

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو — اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

کیوں وصل کی شب ہاتھ لگانے نہیں دیتے — معشوق ہو یا کوئی امانت ہو کسی کی

دی شب وصل موذن نے اذاں پچھلی رات — ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

داغ کا انداز بیان بے حد دلنشیں اور بندشیں نہایت برجستہ و بے ساختہ ہوتی ہیں جس سے سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ رس اور ترنم بدرجہ اتم ہوتا ہے۔انکی غزلیں تصنع سے خالی ہیں ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو تغزل کی جان ہیں۔ملاحظہ کیجئے۔

بات تک کرنی نہ آتی تھی تمہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے
خدا کی قسم اس نے کھائی تھی آج
قسم ہے خدا کی مزہ آگیا

داغ کو تم سے یہ ہرگز کبھی امید نہ تھی
جھوٹے منہ بھی تو نہ پوچھا کہ پریشاں کیوں ہو(۸)

☆☆

(۱) خلیق انجم۔شخصیت اور سیرت داغ،مشمولہ داغ حیات اور کارنامے کامل قریشی،صفحہ۔(۱۶)
(۲) پروفیسر سیدہ جعفر۔مضمون۔داغ حیدرآباد میں،صفحہ(۵۵)
(۳) تمکین کاظمی۔داغ،صفحہ (۹۹)
(۴) نوراللہ محمد نوری۔داغ دہلوی،صفحہ (۱۱)
(۵) عبدالجبار ملکاپوری،محبوب الزمن جلد دوم،صفحہ (۲۱۹)
(۶) نوراللہ محمد نوری۔داغ دہلوی،صفحہ (۱۱)
(۷) غلام صمدانی خاں گوہر۔تزک محبوبیہ حصہ دوم،۱۳۱۹ھ،صفحہ (۳۳)
(۸) خلیق انجم،شخصیت اور سیرت داغ مضمون مشمولہ داغ حیات اور کارنامے،کامل قریشی،صفحہ (۱۶)

میر دلاور علی دانشؔ حیدر آبادی

نام میر دلاور علی اور تخلص دانش تھا۔ دانش کی ولادت ۱۲۶۶ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ دانش کے والد آقا سید علی دشتی بعہد نواب سکندر جاہ سیر و سیاحت کے لئے ایران سے حیدر آباد آئے تھے۔ دانش کا بچپن حیدر آباد کے ماحول میں گزرا۔ آپ کی مادری زبان فارسی تھی اس لئے فارسی میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کوتوالی میں ملازم ہو گئے ایک سو روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ سوم کے اتالیق عربی و فارسی مقرر ہوئے۔ وہاں سے بھی سو روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں تھی۔ بھائی کے لڑکے میر عباس علی کو گود لے لیا۔ ۱۳۲۰ھ میں وفات ہوئی۔ دائرہ مومن میں مدفون ہیں۔

شاعری کا شوق دانش کو بچپن سے تھا۔ آپ کا کلام فارسی اور اردو میں ملتا ہے۔ ابتداء میں سید اصغر حسین ناجی سے اصلاح لی۔ آپ کے کلام میں سلام، مرثیہ، نوحہ، قصیدہ اور چند غزلیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مثنوی ''تحفہ عثمانیہ'' اور مثنوی ''حسن یوسف'' اور خمسہ ''پنجۂ حیدری'' نام سے شائع کیں۔ آپ کی اردو غزلیات کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو موجود ہے۔ فارسی قصیدہ کا ایک شعر بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

دوست وارد نبیرۂ او را
یعنی یوسف علی خاں از من(۱)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدر آباد۔ ۱۳۱۹ھ، صفحہ (۶۲)

نواب محمد حیدر خاں دلؔ

نواب محمد حیدر خاں نام اور تخلص دل تھا۔ وہ خانوادہ آصفیہ کے خاص حکیم تھے جن کے طبی مشوروں پر آصف جاہ سادس کو ہمیشہ اعتماد رہا۔ دل کو ۱۳۱۱ھ میں "اشرف الحکماء" فلاطون جنگ لقمان الدولہ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ شاہی خاندان کی خدمت کرتے ہوئے ۱۲۰۳ھ میں وظیفہ پر علیحدہ ہوگئے۔ ۱۳۴۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ درگاہ شاہ خاموش حیدرآباد میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کی اولاد میں دو لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے کا نام قادر اشرف اور چھوٹے کا نام محمد اشرف تھا۔ دل کو مصوری اور موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ وہ ایک صوفی منش انسان تھے اور بزرگان دین سے انہیں خاصی عقیدت تھی۔ دل نے تصوف و عرفان کا درس بھی حاصل کیا تھا۔ شعروشاعری میں حفیظ الدین پاس سے مشورہ لیا کرتے تھے (۱) آپ نے حضرت شاہ خاموش سے بیعت حاصل کی۔ دل فارسی شعرا میں حافظ، مولانا روم، مولانا جامی اور اردو شعرا میں مومن خاں مومن کے کلام سے متاثر تھے۔

دل اپنے وقت کے ان معروف حکما میں سے تھے جنہیں آصفجاہ سادس نے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا یہاں تک کہ آصفجاہ سادس شکار میں بھی انہیں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ دل کی وفادارانہ خدمات کے صلہ میں آصفجاہ سادس نے ان کے بھتیجے اور بھانجے کو بھی کمسنی ہی میں خطابات سے نوازا تھا۔

دل باوجود ظاہری شان وشوکت کے ایک صوفی منش صاحب دل فقیر تھے۔ انہوں نے عرفان و تصوف کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ بزرگان دین سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

دل خطابات سے القاب سے مسرور نہیں
فخر ہے مجھ کو پکاریں جو غلام صابر(۲)

ان کی ایک مثنوی "سلوک معنوی" گلزار دل ہے، جس میں نماز کا فلسفہ ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں۔

یا رب غفار ہے تو میرا
اور میں ہوں گناہگار تیرا
ہوتا ہو نہ اگر کوئی گنہگار
کہتا پھر کون تجھ کو غفار

دل کی شاعری میں سادگی جوش سلاست کے عناصر ہیں۔ ذیل کے اشعار ان خصوصیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

نگاہ چشم مست یار دیکھو
یہ غفلت میں بھی ہے ہشیار دیکھو
یہ حسن لم یزل کے آئینے ہیں
حسینوں میں جمالِ یار دیکھو
مجھے بیخود بنایا چشم بددور
یہ تاثیرِ نگاہ یار دیکھو

☆☆

(۱) میر عزیز الحق، مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر زور۔ حیدر آباد ۱۹۳۷ء صفحہ۔ (۱۹۹)
(۲) میر عزیز الحق، مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر زور۔ حیدر آباد ۱۹۳۷ء صفحہ۔ (۱۹۹)

سید خواجہ دوست حیدر آبادی

نام سید خواجہ اور دوست تخلص تھا۔ دوست کی ولادت ۱۳۸۴ھ میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر کے ماحول میں پائی بعد میں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے آپ کے والد سید حیات تھے۔ جناب دوست کے دیگر تفصیلات نامعلوم ہیں۔

جناب دوست کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے اپنا کلام حضرت شیخ فدا حسین مشہور لکھنوی کو بغرض اصلاح دکھایا(۱) آپ کا کلام تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے۔

جناب دوست نے اپنی زندگی میں اپنا دیوان شائع کر دیا تھا۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ جامعہ نظامیہ شبلی گنج میں محفوظ ہے۔ یہ دیوان بعنوان ''کلیات سید خواب صاحب'' با اہتمام سید عبداللطیف مرتب ہوا تھا۔ جناب دوست قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے نایاب تاریخیں بھی نکالی ہیں۔

سالار جنگ کی وفات پر انہوں نے تاریخ نکالی۔ ''رونق از صفحہء دکن برخاست'' جس سے سن ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ حضور آصفجاہ سادس کی تخت نشینی کی بھی تاریخ نکالی ''جلوس شاہ دکن در چشم مبارکباد'' جس سے مطلوبہ سن ۱۳۰۱ھ برآمد ہوتا ہے(۲)

جناب دوست کی متفرق غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خالی میکش نہیں اس ابروئے خمدار کے پاس
ڈھال بھی رکھی ہے سفاک نے تلوار کے پاس
قبلہ سے کبھی قبلہ نما پھر نہیں سکتا
پھرتی ہے ادھر آنکھ کہ پھرتے ہیں جدھر آپ

ناصح بہت سنی ہیں تمہاری حکایتیں
جاتا ہے کون کوچۂ جاناں کو چھوڑ کر(۳)

رباعیات کے کچھ نمونے بھی درج کیے جاتے ہیں۔

آ کر دنیا میں ہم نے کیا کیا دیکھا
ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا
دیکھے چمن دھر میں اقسام کے گل
ہر گل میں ترے رنگ کا نقشا دیکھا

ہر ایک سے کب داد سخن لیتا ہوں
جو کوئی کہے اس کی سن لیتا ہوں
کانٹوں کی طرح کھٹکتے ہیں لفظ رکیک
گلزارِ سخن سے پھول چن لیتا ہوں

حامی جو خدائے ذوالاکرام اپنا ہو
خوش فکری سے دیوان تمام اپنا ہو
اشعار پسند ہوں سخن فہموں کو
مقبولِ طبع یہ کلام اپنا ہو

☆☆

---

(۱) عبدالجبار ملکاپوری، محبوب الزمن، جلد اول، صفحہ۔(۴۳۵)
(۲) صاحب حیدرآبادی۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی، صفحہ۔(۱۱۳)
(۳) عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ محبوب الزمن۔ حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، صفحہ۔(۴۳۵)

دوارکا پرشاد ذکاؔ فتح پوری

نام دوارکا پرشاد اور تخلص ذکا تھا۔ ذکا کی پیدائش ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۳ء میں بمقام فتح پور ہوئی۔ بچپن میں فارسی، انگریزی اور اردو میں مہارت حاصل کی آپ کے اجداد حکومت برطانیہ کے ملازم تھے۔ تلاشِ معاش کے لئے ''عہد محبوبیہ'' میں حیدر آباد آئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ عہد محبوبیہ میں سیکڑوں اصحاب شمالی ہند اور جنوبی ہند سے سلطنت آصفیہ میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ ایک ایسی ریاست تھی جو انگریزی کے ظلم وستم سے پاک تھی۔ جناب ذکا حیدر آباد آنے کے بعد یہاں رسالہ ''ہزار داستان'' کے ایڈیٹر بنائے گئے۔ ان کی ادارت میں یہ رسالہ بڑی آب وتاب سے شائع ہوتا تھا(۱) جب انہیں سرکاری ملازمت مل گئی تو وہ ایڈیٹری کے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ آپ کے بعد رسالہ بند ہو گیا۔ تقریباً (۷۰) برس کی عمر پا کر ۱۳۴۰ھ میں فتح پور میں فوت ہوئے۔

جناب ذکا فتح پوری کو شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ انہوں نے جناب نیاز احمد خاں ہوش سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ ذکا کا کلام رنگین اور معاملہ بندی سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کے کلام میں ہر صنفِ سخن ملتی ہے۔ غزل، رباعی، قطعات وغیرہ کا ذخیرہ زیادہ ہے۔ ذکا کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے استادوں سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

بے رنگ گل ہے رشک گلستان کو دیکھ کر   سکتے میں سرو ہے قدِ جاناں کو دیکھ کر

یہ چار دن بہار کے ہیں پھر وہی خزاں   اترا نہ عندلیب گلستاں کو دیکھ کر

سکتہ اگر ہوا ہے تو اس کا عجب نہیں   حیراں ہے آئینہ رخ جاناں کو دیکھ کر

ایک اور غزل میں ذکا نے وصل کی تڑپ کو بہت خوبی سے منظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہاں تو غیر سے شغلِ شراب رہتا ہے　　شبِ الم سے یہاں دل کباب رہتا ہے
شبِ وصال بھی پائی نہیں ہے لذتِ وصل　　ادھر حجاب ادھر اضطراب رہتا ہے(۲)

☆☆

(۱) عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ محبوب الزمن۔ جلد اول۔ حیدر آباد۔ ۱۳۲۹ھ، صفحہ۔ (۴۴۳)

(۲) عبدالجبار خاں آصفی۔ محبوب الزمن۔ جلد اول۔ حیدر آباد۔ ۱۳۲۹ھ، صفحہ۔ (۴۴۴)

محمد جیب اللہ ذکاؔ مدراسی

نام محمد جیب اللہ اور تخلص ذکا تھا۔ ذکا کی ولادت ۱۲۴۴ھ م ۱۸۳۰ء میں اودگیر ضلع نیلور مدراس میں ہوئی۔ انہوں نے "خاش وخماش" کے دیباچہ میں خود اپنی تاریخ پیدائش "بے خود بدخوے" سے نکالی ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ محمد میراں ناطقی کی نگرانی میں مدراس میں ہوئی۔ پھر علوم متداولہ دوسرے اساتذہ وقت سے حاصل کیے۔ جناب ذکا کو فارسی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ فارسی نظم ونثر خوب لکھتے تھے۔(۱) جناب ذکا عہد محبوبیہ میں مدراس سے حیدرآباد منتقل ہوگئے اور بحیثیت منشی محکمہ تعلقات عامہ میں ملازم ہوگئے۔ بعد میں صدر محاسبی میں میر منشی (چیف کونٹنٹ) ہوگئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۲۹۲ھ م ۱۸۷۶ء میں بعارضۂ فالج انتقال کیا۔ حفیظ الدین پاس نے تاریخ کہی مات فی عشق رب حبیب اللہ" حیدرآباد میں مدفون ہیں۔

جناب جیب اللہ ذکا نے دو نکاح کئے۔ پہلی بیوی سے ان کے ایک صاحبزادے محمد میراں تنہا ہوئے اور دوسری بیوی سے محمد اسد اللہ۔

جناب ذکا فارسی اور اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ فارسی میں روانی سے گفتگو کرتے اور ہر بات میں محاورہ استعمال کرتے تھے۔ عبد الجبار ملکاپوری محبوب الزمن میں رقمطراز ہیں:

> "آپ کی فارسی اہل زبان کی طرح با محاورہ تھی۔ تلفظ ولہجہ میں خاص اہل فارس معلوم ہوتے تھے۔ آپ کے تحریر فاضلانہ با محاورہ ہوتی تھی۔ نظم ونثر خوب لکھتے تھے(۲)

ابتداء میں ذکا راپنے کلام پر حضرت سید مہدی ثاقب سے اصلاح لیتے تھے بعد میں جب حیدرآباد منتقل ہوگئے تو حضرت میر شمس الدین فیض سے رجوع ہوگئے۔ فیض کے

3

بعد اسد اللہ خاں غالب دہلوی سے خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لینے لگے۔ غالب کو بھی ذکا کی قابلیت کا اعتراف تھا۔ غالب رسالہ ترقی میں رقمطراز ہیں۔

> ''یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں کسی شیخ کا نہیں، یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بنظر دشمنی دیکھنا پس جب تعلق نہیں، مداوا نہیں تو مجھ کو جو نظر آتا ہے میں بے حیف و میل کہوں گا۔''(۳)

جناب ذکا کے کلام میں حمد و نعت قصیدہ رباعی قطعات غزل وغیرہ ملتے ہیں۔ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی کلام زیادہ رقم کیا ہے۔ شاعری میں ذکا کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ آپ کا کلام نہایت شگفتہ اور شیریں ہے۔ افسوس کہ ذکا کا کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔ کتب خانہ آصفیہ میں ایک قلمی مخطوطہ دستیاب ہوا ہے۔ جس میں فارسی کا کلام ہیں۔

ذکا کے کلام میں ہجو بھی ملتی ہے۔ آپ کسی کی بھی ہجو کہنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ صرف تاریخ کے حوالوں سے ہجو کے بارے میں معلومات ملتے ہیں۔ کلام کہیں نہیں ملتا۔ جناب ذکا جس محفل میں ہوتے رونق بڑھا دیتے۔ بطور نمونہ قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اے خداوند کار بندہ نواز　　فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی ترے آگے　　گر میں چلاؤں رووں زار نزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا　　کسی صورت ملازم سرکار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت　　جس میں دو ماہ ہوے بیش قرار

بس ذکا دیکھی تیری لسانی
با ادب ہے یہ آصفی دربار(۴)

(۱) مالک رام۔ تلامذہ، غالب دہلی۔ ۱۹۵۷ء، صفحہ۔(۱۰۵)
(۲) عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن۔ جلد اول۔ حیدرآباد۔ ۱۳۲۹ء، صفحہ(۴۴۴)
(۳) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، بحوالہ رسالہ ترقی۔ صفحہ۔(۵۰۸)
(۴) نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ بحوالہ رسالہ ترقی، صفحہ۔(۵۰۸)

سید محمد عبدالرزاق راشدؔ

نام سید محمد عبدالرزاق اور تخلیق راشد تھا۔ ولادت ۱۳۰۶ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد ہی میں حاصل کی بعد میں علی گڑھ سے بی۔ ایس سی کامیاب کیا۔ پھر ناگپور میں فینانس اور حساب کی خصوصی ٹریننگ حاصل کی۔ حیدر آباد سول سروس کا امتحان بھی کامیاب کیا اور مددگار محاسبی کے عہدہ سے ملازمت شروع کی۔ اسی محکمہ سے وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔(۱) آپ کی وفات ۱۳۷۵ھ میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔

جناب راشد کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ آپ نے شاعری میں اچھا نام پیدا کیا۔ شاعری کے علاوہ ایک ممتاز ادیب بھی تھے۔ شاعری میں استادِ سخن حضرت جلیل مانک پوری سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ کی شاعری کی تخلیقات کے ساتھ نثری تصانیف کی مطبوعات بھی ملتی ہیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اقبال کا کلام ''کلیات اقبال'' کی صورت میں شائع کیا۔

آپ کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے تری قوم میں لب تشنگی ذوقِ حیات
خضر سا راہبر چشمۂ حیوان ہوجا

آمدورفتِ نفس سے یہ صدا آتی ہے
دو گھڑی کے لئے اس دہر میں مہمان ہوجا

جب اٹھاتا ہوں قدم منزل الفت کی طرف
شوق چلتا ہے مرا راہ نما سے پہلے

کتنی بیتاب جبیں تھی مری اللہ اللہ
نقش سجدوں کے تھے نقشِ کفِ پا سے پہلے(۲)

☆☆

(۱) رحیم علی ہاشمی، اسٹار ڈائرکٹری۔الہ آباد۔۱۹۱۹ء، صفحہ (۵۱)
(۲) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ (۱۹۴)

جنابِ رحمت اللہ خاں رحمتؔ

نام رحمت اللہ خاں اور تخلص رحمت حیدر آبادی تھا۔ ولادت یکم شوال ۱۳۰۰ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد جناب احمد اللہ خاں صاحب آصفجاہی فوج میں ملازم تھے رحمت حیدر آبادی کے دادا قائم خان نے پیر سید عابد شاہ حسینی کی کتاب کنز المومنین عربی کا دکنی نظم میں ترجمہ ۱۲۵۷ھ میں کیا راقم کے پاس یہ مخطوط محفوظ ہے۔ احمد اللہ خان نے اپنے ہونہار فرزند رحمت کی تعلیم تربیت کا بہتر انتظام کیا۔ شروع میں ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی بعد میں مدرسہ دار العلوم سے مولوی فاضل کامیاب کئے۔ پھر محکمۂ ٹیلیفون میں ملازمت شروع کی۔ ملازمت کے دوران آپ کی پاک سیرت اور دیانت داری دیکھ کر ناظم ٹیلیفون نے جلد ہی آپ کا عہد بڑھا دیا۔ ساتھ ہی ٹیلیفون ڈائرکٹری مرتب کرنے کی ذمہ داری دی۔ اس سے قبل حیدر آباد میں ٹیلیفون ڈائرکٹری موجود نہیں تھی۔ اگر آج کسی کے پاس پہلی ڈائرکٹری موجود ہو تو وہ رحمت حیدر آبادی ہی کا کارنامہ ہے۔ وظیفہ حسن خدمت حاصل کرنے کے بعد بھی محکمہ نے آپ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مزید پانچ سال تک برقرار رکھا۔ آپ کے صرف دو اولاد ہیں۔ پہلی صاحبزادی بدیع النساء بیگم صاحبہ مرحومہ تھی۔ دوسرے فرزند جناب ضیاء اللہ خاں صاحب راقم الحروف کے والد صاحب قبلہ مرحوم ہیں۔

جناب رحمت کا وصال ۳ محرم ۱۳۷۳ھ میں محلہ چنچل گوڑہ حیدر آباد میں ہوا اور حضرت عباد اللہ شاہ صاحب کے احاطہ میں مدفون ہیں۔ رحمت حیدر آبادی کے وصال پر آپ کے فرزند ضیاء اللہ خاں ضیاء نے قطعہ تاریخ لکھا ہے ملاحظہ ہو۔

تیسری محرم تھی دن اتوار تھا   تھا گھرانہ نقشبندی پیر کا
راہی خلد بریں رحمت ہوئے   با امیرے داخلِ جنت ہوئے

۱۳۷۳ھ

آپ کو حضرت پیر جماعت علی شاہ نقشبندی سیالکوٹی سے شرف بیعت تھا۔
حضرت ممدوح جب بھی حیدرآباد تشریف لاتے دعاؤں سے رحمت حیدرآبادی سرفراز ہوئے۔
جناب رحمت کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ آپ کا شمار "عہد محبوبیہ" کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ جناب رحمت کے بارے میں تسکین عابدی سخنوران دکن میں رقم طراز ہیں۔

"رحمت نعت اور مدح بڑی اچھی کہتے ہیں۔ خوش فکر شاعر ہیں (۱)

نعت شریف کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

م۔ ملا جب میم سے منشائے ذات ربِ واحد کا
ح۔ حریمِ دل میں نقش حائے حطی بنگیا قد کا
م۔ مصور نے ملایا جب سرا میم مشدد کا
د۔ دکھایا دال نے سرتاپا نقشہ محمدؐ کا
دل دیوانہ آخر ہوگیا صدقہ کھڑے قد کا

آپ کو تاریخی قطعات میں مہارت حاصل تھی۔ ملاحظہ ہوں دو قطعات۔
رقبہ رزیڈنسی کی واپسی پر لکھی گئی تاریخی قطعہ۔

اپنے ہی ملک کا جو تھا حصہ　　ہوگئی آج واپسی اس کی
کہا رحمت نے یہ سنہ ہجری　　مسترد رقبہ رزیڈنسی
۱۳۵۲ھ

مکرم جاہ کی ولادت بمقام نائیس (ترکی) میں ہوئی تھی نائیس مقام کا استعمال کرتے ہوئے رحمت نے کیا خوب تاریخی قطعہ لکھا ملاحظہ ہو۔

پیدا ہوا ہے آنکھ کا تارہ نائیس میں　　نکہت فزا ہے پھنکے ہزارہ نائیس میں
رحمت نے سال سنتے ہی بے ساختہ کیا　　شاہِ دکن کا چمکا ستارہ نائیس میں
۱۳۵۲ھ

جناب رحمت کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ جیسے حمد، نعت، قصیدہ، نوحہ، قطعات، رباعیات، مخمسات، مسدسات، سہرے اور ہجو اس کے علاوہ دکنی زبان میں بھی طبع

آزمائی کی ہے۔ جناب رحمت کے چار دیوان آپ کے قلم سے لکھے ہوئے راقم کے پاس موجود ہیں۔ اس پر تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے۔

جناب رحمت ایک شریف النفس شاعر تھے۔ بہت کم مشاعروں میں جاتے تھے۔ انہیں نام و نمود کی چاشنی نہیں تھی۔ آپ کو آصف جاہِ سابع کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل تھا۔ جناب آصفِ سابع آپ کے قطعات سنکر بہت متاثر ہوتے تھے اور ایک ایک قطعہ کو کئی مرتبہ پڑھواتے تھے۔ ملاحظہ ہو تلوار کی تعریف میں قطعہ۔

کیا نرالا وصف ہے شمشیر آصفجاہ کا
جوہر اسلام ہے اور خم ہے بسم اللہ کا
پہل علیؓ عثمانؓ قبضہؓ رخ ہیں بوبکرؓ و عمرؓ
دہار احمد مصطفیٰؐ کی، وار ہے اللہ کا

جناب رحمت کی شاعری پر جناب سید عظیم الدین نے اپنے ''انتخاب عظیم'' میں بھی آپ کا ایک شعر درج کیا ہے۔

عکس ابرو مئے رنگین میں نہیں ہے ساقی
مچھلیاں تیر رہی ہیں ترے پیمانے میں(۲)

جناب رحمت کے کلام کے چند مطلع ملاحظہ ہوں۔

ٹھکانا کیا کہیں اپنا کہ کس منزل میں رہتے ہیں
اسیر زلف و رخ ہیں رات دن مشکل میں رہتے ہیں

نگاہ خشمگیں سے جب وہ دل پر وار کرتے ہیں
نظر بہالا پلک برچھی بھوں تلوار کرتے ہیں

جو کھینچوں آہ سوزاں میں تو خاکہ ہو بیابان کا
اگر روؤں بیاباں میں تو نقشہ ہو گلستاں کا

رحمت کی رباعیات میں حمد و نعت کس خوبی سے استعمال کیا ہے ملاحظہ کیجئے۔

راست جس کا ہو مدعا حق سے جو پھرا حق سے وہ پھرا حق سے
حق پرستی عجیب ہے رحمت اوسکو بس ملکیا صلہ حق سے

لب پہ ہو لا الہ الا اللہ   اور دل میں نبی رسول اللہ
جس کا یہ ورد ہو سدا رحمت   اوسکو دو جگ کا ڈر نہ ہو واللہ

آج جبریل امین فرش پہ کیوں آتے ہیں   کس کی آمد کی خبر حور و ملک لاتے تھے
پے تعظیم انھیں سارے ادب سے رحمت   عرش سے فرش پہ ممدوحِ خدا آتے ہیں

مرنے کے لئے جان سے ڈرتا ہے کوئی   جینے کی ہوس میں دم بھرتا ہے کوئی
جس کا کہ توکل ہے حقیقی رحمت   یہ کرتا ہے کوئی نہ وہ کرتا ہے کوئی

رحمت کے مخمس ملاحظہ ہو۔

بنائے ہر دو عالم کی ہوا کچھ اور کہتی ہے   حقیقت میں حقیقت کی ضیا کچھ اور کہتی ہے
فضائے مدحت جود و سخا کچھ اور کہتی ہے   محمد آپ کو خلق خدا کچھ اور کہتی ہے
سراپا شانِ نور کبریا کچھ اور کہتی ہے
مراتب کوئی کیا جانے شہنشاہ امم تیرے   گئے ہیں فرش سے تو عرش اعلیٰ پر قدم تیرے
پر جبریل تک پہنچے نہیں واللہ بہم تیرے   کہاں معراج میں پائے تصور ہمقدم تیرے
ثنائے رفعت بلغ العلا کچھ اور کہتی ہے

☆☆

(۱) تسکین عابدی، سخنوران دکن، عہد عثمانی، حیدرآباد ۱۳۵۸ھ، صفحہ۔(۱۹۵)
(۲) سید عظیم الدین حسن، انتخاب عظیم، حیدرآباد، ۱۳۶۸ھ، صفحہ۔(۱۳۴)

محمد عبدالرشید فاروق رشیدؔ

نام محمد عبدالرشید اور تخلص رشید تھا۔ ولادت کا سنہ معلوم نہ ہوسکا۔ آپ کی علمی قابلیت دیکھ کر منتظم دفتر تدوین اہل بیت سرکار عالی نے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ جہاں وہ ترقی کرتے کرتے منتظم ہوگئے۔ ۱۳۱۹ف میں وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔

جناب رشید شاعری میں اپنا کلام جناب شیفتہ کنتوری کو بغرض اصلاح دکھاتے تھے۔ رشید کو اپنے استادِ سخن کی شاگردی پر فخر تھا۔ ان کی مدح میں رشید نے اپنی عقیدت کا یوں اظہار کیا ہے۔

میرے شعروں میں کوئی عیب رہے گا نہ رشید
حضرت شیفتہ جب ایک نظر دیکھیں گے(۱)

رشید عہد محبوبیہ کے نامور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنا دیوان ۱۳۱۹ھ میں شائع کیا۔ اس دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آصف سادس محبوب علی خاں کی مدح میں انہوں نے کئی قصیدے اور رباعیات موزوں کئے ہیں۔

ایک مدحیہ رباعی ملاحظہ ہو:

جو دو کرم و عطا ہے شہ کا دستور   حضرت میں نہیں نام کو بھی کبر و غرور
ثانی نہیں ان کا یہ عدل و انصاف   یکتا ہیں زمانے میں حضورِ پر نور

جناب رشید کے دیوان میں (۴۳) رباعیات ہیں۔ ان میں سے دو رباعیات بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

بگڑی ہوئی تقدیر کو سیدھا کردے
ناشاد ہوں میں خوش مرے مولا کردے
بیماری سے حیراں و پریشاں ہوں بہت
جلدی سے الٰہی مجھے اچھا کردے

ہیں حضرت صدیقؓ جہاں سے بہتر
اور حضرت فاروقؓ ہیں یکتا رہبر
بے مثل ہیں واللہ یہ چاروں اصحاب
عثمان غنیؓ اور جناب حیدرؓ

تسکین عابدی کے سخنوران دکن میں ان کی غزل کا یہ شعر لکھا ہے۔

دل مرا وابستۂ زلفِ چلیپا ہوگیا
سامنا اے دوستو کالی بلا کا ہوگیا(۲)

☆☆

(۱) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدرآباد ۔۱۹۸۴ء، صفحہ(۱۱۴)
(۲) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ۔(۱۱۹)

سید مخدوم محمد محمد الحسینی رفعتؔ حیدر آباد

نام سید مخدوم محمد محمد الحسینی چشتی بندہ نوازی اور تخلص رفعت تھا۔ رفعت کی ولادت باسعادت ۱۲۷۹ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت حسین شاہ ولی قبلہ ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب پیری و مریدی ہے۔ آپ کی کشف و کرامات بچپن ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ آپ کی روحانی حالت دیکھ کر عہد محبوبیہ کے اکثر علماء اور فضلا آپ کے ہم مکتب رہتے تھے۔ دنیا سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ آپ کی وفات کے صحیح سنہ کا پتہ نہیں چلتا۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے شروع ہوا۔ آپ کا زیادہ تر کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعری میں حضرت شیفتہ کنتوری سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے تھے۔ اس کے بعد انہیں اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ نمونے کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں۔

انساں کو خوص کثرتِ وحدت میں چاہئے
تفریق پھر مجاز و حقیقت میں چاہئے
یارب یہ التجا ہے کہ ہو خاتمہ بخیر
تیری ہی یاد بس دلِ رفعت میں چاہئے(۱)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ۔ دفتر شعرائے نازک خیال۔ جلد دوم۔ صفحہ۔(۶۸)

سدانند جوگی بہاری لال رمزؔ

نام سدانند جوگی بہاری لال اور تخلص رمز تھا۔ والد منشی گنولال، بچپن میں دہلی سے حیدرآباد تشریف لائے اور استاد فیض کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ رمز حیدرآباد میں ۱۲۵۰ھ میں تولد ہوئے۔ بچپن میں والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور اپنے والد کے استاد حضرت فیض کی فیضانیت سے سرفراز ہوتے رہے۔ رمز اپنے استادِ سخن کی نسبت بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ رمز کے تعلق سے نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں یوں رقمطراز ہیں کہ حضرت فیض کے عرس پر منعقد کئے گئے مشاعرہ میں رمز نے جب یہ شعر پڑھا تھا۔

جو دل شد مستقل کن ہرچہ خواہی
کنوں گویم چہ رمزایں کن کہ آں کن (۱)

تو شعر ختم ہوتے ہی بہاری لال رمز گر پڑے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ رمز ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ کثیر کلام اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔

رمز کے والد کا مکان حضرت فیض کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اس لئے رمز اپنے استادِ سخن حضرت فیض سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ایک شعر میں رمز لکھتے ہیں۔

ہے فیض کے قدموں کے تلے رمز کا تکیہ
جس جائے کے رتبہ کا بیان ہو نہیں سکتا

رمز نے اپنے استاد کے سایۂ عاطفت میں تقریباً چالیس برس گزارے اور جب حضرت فیض کا انتقال ہو گیا تو رمز کی طبیعت میں انتشار پیدا ہو گیا اور مجذوب ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ یہی کیفیت تقریباً (۲۰) برس رہی۔ رفتہ رفتہ حالت جذب میں اغراق ہوتا گیا۔

کبھی استاد کے مزار کے قریب برہنہ حالت میں چلے جاتے۔ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل اور دوسرے ہاتھ میں کتے کا بچہ لئے پھرتے تھے۔(۶۶) سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس حالت میں کمی ہونے لگی۔تب دوبارہ شاعری شروع کردی۔رمز کی باقیات میں ہم کو ایک قلمی کلیات ملتا ہے۔جس میں سات ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ان میں غزل، رباعی، قطعات، قصائد، تاریخ تہنیت فارسی رباعیات، فارسی قطعات۔فارسی خمسے، کلام ہندی بھاشا وغیرہ شامل ہیں۔رمز بعض اوقات ایک رات میں سوسو اشعار کہتے تھے۔چنانچہ کہتے ہیں(۲)

اک رات میں سو شعر تو کہنے لگا اے رمز

رمز نے اپنے کلام میں فیض کے دوسرے شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

فیاض ہیں مزاج ہیں اور عصر ہیں بزرگ
تلمیذ فیض کے ہیں فقط انتخاب آپ
فیاض و عصر اور تقی و مزاج و پاس
ایسے بھی اور اہل سخن اب کہیں نہیں

رمز تھے تو دہلی کے مگر ان کو اپنے مادر وطن سے زیادہ دکن بہت عزیز تھا۔چنانچہ کہتے ہیں۔

عاشق نہیں دیا میں کسی رشک چمن کا
گل خوردہ ہوں میں عارض سبزان دکن کا
انداز حور خلد کا مشہور ہے مگر
آتی نہیں ہے دلبر ملک دکن کی بات

رمز دنیاوی زندگی سے بیزار تھے۔اپنے کلام میں اس بات کا جابجا تذکرہ کیا ہے۔نیز اپنے کلام میں اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات کو بھی قلمبند کیا ہے۔

آغاز میرے عشق کا احباب لیجے سن — تھا میں وزیر شاہ دکن کا جو کارکن
سامان عیش دہر کے سب میں لیا تھا چن — تھا دھیان سب ادھر کا نہ تھی اک ادھر کی دھن
اس جائے میں بھی خود ہمہ تن نور نور تھا — خاکی وجود تک بھی گویا کوہ طور تھا

معشوق وے بھی راگ بھی سب کچھ نصیب تھا
بس آسمان دو ہی تو انگل قریب تھا(۳)

☆☆

(۱) نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو، دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ۔(۵۳۶)
(۲) نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو، دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ۔(۵۶۳)
(۳) ڈاکٹر زور، مرقع، جلد دوم، حیدرآباد ۱۹۳۷ء، صفحہ۔(۱۱۱تا۱۲۰)

میر محمد علی رنجؔ حیدر آبادی

نام میر محمد علی اور تخلص رنج تھا۔ ولادت ۲۶ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد میر احمد علی کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے۔ رنج کی تعلیم و تربیت ان کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ رنج نے عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی اس کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ انہوں نے وکالت کا امتحان کامیاب کیا۔ عدالت العالیہ میں ملازم ہوگئے اور عدالت ہی سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

رنج کو شاعری کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کے والد میر احمد علی بھی شاعر تھے۔ انہوں نے ابتداء میں اپنے والد سے اصلاح لی بعد میں جب داغ حیدر آباد آئے تو رنج ان سے بھی اصلاح لینے لگے۔ آپ کا ایک دیوان ''مجز عشق'' ہے جس سے تاریخ طبع ۱۳۱۲ھ نکلتی ہے۔ ان کے کلام میں غزل، سلام، مرثیہ، قصیدہ، نوحہ اور رباعیات ہیں۔ ان کی چند ٹھمریاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ انداز وہ روئے روشن کسی کا
ملا ہے کوئی خاک میں ملنے والا
وہ اٹھتی جوانی وہ جو بن کسی کا
ہوا آج پامال مدفن کسی کا(۱)

☆☆

(۱) مظفر الدین خاں صاحب، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدر آباد ۱۹۸۴ء، صفحہ۔ (۱۱۷)

سید غلام محمد شاہ زعمؔ

نام سید غلام محمد اور تخلص زعم تھا۔ آپ کی ولادت ۵؍محرم الحرام ۱۲۹۵ھ میں بمقام قندھار ہوئی۔ آپ کا خاندانی سلسلہ حضرت سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان سے ملتا ہے۔ آپ کے جداعلیٰ ''سانگڑے سلطان مشکل آسان'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ جناب سید علی سانگڑے آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں میں شہر قندھار ضلع ناندیڑ میں تولد ہوئے۔ وہاں سے آپ سندھ کے قصبہ سنگوہ میں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ جناب سید علی سانگڑے بہت نیک اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔ آپ کے شغف وکرامات دیکھ کر وہاں کی مخلوق جوق در جوق آپ کے زمرہ معتقدین میں شامل ہونے لگی۔ حسین عقیدت کی بنا پر آپ ''سانگڑے سلطان'' کے نام سے مشہور ہوگئے (۱)۔ جناب زعم کے والد حضرت صاحب عالم شہید کے اکلوتے فرزند تھے۔

جناب زعم کی ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں ہوئی۔ سلسلہ رفاعیہ وقادریہ کی بیعت مولانا عبدالوہاب محدث سے حاصل کی۔ حضرت زعم پابند صوم وصلوۃ تھے اور نماز با جماعت ادا کرتے تھے۔ جناب زعم کی مجلس وعظ میں سامعین پر بے اختیار وقت طاری ہوجاتی تھی۔ حضرت زعم۔ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے قاری بھی تھے۔ ۱۸؍صفر المظفر ۱۳۶۱ھ کو آپ کا وصال ہوگیا (۲)

جناب زعم کے ہونہار لائق صاحبزادے سید محی الدین قادری زور سے کون واقف نہیں۔ کل ہند شہرت کے حامل تھے۔ حضرت زعم کو پیری مریدی کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ حضرت زعم کی اپنی خودنوشت سوانحی حیات جو چار جلدوں پر مشتمل ہے ڈاکٹر زور کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ حضرت زعم نے اپنی زندگی میں اپنے پوتے

سید شاہ تقی الدین قادری ابن ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو سجادہ مقرر کر دیا تھا۔ وفات کی تاریخ لطف علی عارف نے لکھی ہے۔

عاشق دین و عارف کامل
کچھ نہ تھی ان کو دنیوی خواہش
داخل خلد ہوگئے عارف
سال ہے زعم طالب بخشش

۱۳۶۱ھ

حضرت زعم کو شاعری کا شوق عنفوان شباب سے تھا۔ آپ نے شروع میں میرا تراب علی زور سے اصلاح لی بعد میں جب داغ دہلوی حیدر آباد تشریف لائے تو کچھ کلام ان کو بھی دکھایا۔ حضرت زعم ایک برگزیدہ مرشد تھے۔ اس لئے شاعری ترک کر دی۔ جو کلام بھی دستیاب ہوتا ہے وہ زیادہ تر تصوف میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ نمونہ کے طور پر دو شعر غزل کے ملاحظہ ہوں۔

اس دل کے عوض اور کوئی دل مجھے دیدے
بندوں پہ الٰہی ترے احسان بہت ہیں

قیس نے نالہ اگر منہ سے نکالا ہی نہیں
اتنی پھر بے چین لیلیٰ کس لئے محمل میں ہے

ایک شعر اور ملاحظہ ہو جس میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔

زعم کس ناز سے وہ رات کو فرماتے ہیں
نیند آتی ہے ہمیں اب نہ ستائے کوئی (۲)

☆☆

(۱) اکبر الدین صدیقی۔ مشاہیر قندھار۔ حیدر آباد۔ ۱۳۵۵ھ، صفحہ۔ (۴۱)

(۲) امتہ السلام صدیقی۔ مقالہ آصفجاہی کے صوفی شعراء۔ حیدر آباد۔ ۱۹۹۰ء صفحہ۔ (۴۴۲)

(۳) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدر آباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ۔ (۲۱۰)

میر تراب علی زورؔ حیدر آبادی

نام میر تراب علی اور تخلص زور تھا۔ ولادت ۱۲۵۴ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد سید مہدی علی خاں بعہد افضل الدولہ آصفجاہ خامس حیدر آباد آئے۔ یہیں زور کی پیدائش ہوئی۔ بچپن میں زور نے فارسی، عربی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ نو جوانی میں محکمۂ خزانہ عامرہ میں ملازم ہوئے اور یہیں سے ۱۳۲۰ھ میں وظیفہ حاصل کیا۔ انھیں کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے اپنے برادر کے فرزند کو گود لیا جو میر تراب علی کے وارث جانے جاتے ہیں۔ آپ نہایت خوش اخلاق، باذوق ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں لطیفہ گوئی کا بہت شوق تھا جب کسی محفل میں تشریف رکھتے۔ ساری محفل کو زعفران زار کر دیتے تھے۔ آپ کا وصال ۱۳۳۵ھ میں ہوا(۱)

زور کو شاعری کا شوق نو جوانی سے شروع ہوا۔ آپ حضرت میر احمد علی خاں شہید دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ فن تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ فی البدیہہ تاریخ نکالنا ان کا مشغلہ تھا۔ آن واحد میں تاریخ نکالتے تھے۔ زور کا ایک دیوان قلمی کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر غزل کے درج کئے جاتے ہیں۔

تمھیں یہ ناز کہ چہرہ ہے آب و تاب میں برق
مجھے یہ فخر مرا دل ہے اضطراب میں برق
سوال وصل پہ وہ کھکھلا کے ہنستے ہیں
دکھاتے ہیں مجھے دندان شکنجواب میں برق

زور کی ایک اور غزل کے شعر جو شوخی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

شوق سے دل میں رہو یا مری آنکھوں میں رہو
آپ کی جس میں خوشی، اس میں مسرت میری
دوستی اتنی تو انسان کسی سے رکھے
ڈھونڈتی پھرتی ہے مجھ کو شبِ فرقت میری
زور اذاں سنکے وہ آہستہ یہ کہتے اٹھے
ہوگئی سحر رہی جان سلامت میری

جناب زور حضرت شمس الدین فیض کے سالانہ عرس کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے اور اپنی غزلوں سے مشاعرہ میں خوب داد پاتے تھے۔ نمونہ کے طور پر گلدستہ فیض میں شائع غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ مانا تم نہیں آتے کہیں سے — پسینہ کیوں ٹپکتا ہے جبیں سے
نہیں ہے عشق زلفِ عنبریں سے — پڑا پالا ہے مارِ آستیں سے
ہمارے آگے غیروں سے اشارے — یہ بیباکی یہ گستاخی ہمیں سے
سوالِ وصل پر کیا سوچتے ہو — زیادہ ہے مزا ہاں میں نہیں سے
مجھے ایدل ہے شادی مرگ کا خوف — نویدِ وصل آتی ہے کہیں سے
جہاں ہے فیض شمس الدیں سے روشن — منور عرس ہے فیاض دیں سے

ہو میرا خاتمہ بالخیر اے زور
یہی ہے عرض ختم المرسلیں سے(۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، دفتر ہفتم، صفحہ۔(۷۳)
(۲) تراب علی زور، مشمولہ گلدستہ فیض مرتبہ، مشرف جنگ فیاض، حیدرآباد۔ ۱۳۲۲ھ، صفحہ۔(۳۲،۳۱)

میر اکرام علی سخی حیدر آبادی

نام میر اکرام علی عرف میر خیرات علی خاں اور تخلص سخی تھا۔ سخی کی ولادت ۱۲۶۵ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ سخی کے جداعلیٰ بعہد آصف خاہ خامس حیدر آباد تشریف لائے۔ سخی نے تعلیم حیدر آباد ہی میں حاصل کی۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو میں مہارت پیدا کی۔ سرکار آصفیہ میں محکمہ پولیس میں عہدہ رسالداری پر بمشاہر پچاس روپیہ مامور ملازم ہوگئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ آپ کے اکلوتے فرزند میر پرورش علیخاں سخی تھے۔ سخی کی وفات ۵۴ برس کی عمر میں رجب المرجب ۱۳۱۹ھ کو ہوئی (۱)

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ حضرت آتش سے کلام پر اصلاح لی۔ آپ کے کلام میں غزل، مرثیہ، رباعی، قطعات ملتے ہیں۔ سخی کا کلام نہایت صاف اور شگفتہ ہے۔ نمونے کے طور پر غزل کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔"

آئے ہیں رنج و الم پر دم اٹھانے کے لئے
خلق خالق نے کیا ہے آزمانے کے لیے
چھوڑ کر مرقد میں تنہا چل دیے احباب سے
شمع باقی رہ گئی آنسو بہانے کے لیے
نزع میں جب ہچکیاں آئیں تو میں سمجھا سخی
ہے طلب، ہرکارے آئے ہیں بلانے کے لیے

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدر آباد، ۱۳۱۹ھ صفحہ (۷۵)

مرزا غلام عباس سعیدؔ حیدر آبادی

نام غلام عباس اور تخلص سعید حیدر آبادی تھا۔ سعید کی ولادت ۱۲۹۰ھ میں ہوئی۔ سنہ ولادت تاریخی نام "مولود غلام عباس" سے برآمد ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں عربی، فارسی اور اردو سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ نوجوانی میں محکمۂ مالگزاری میں ملازمت اختیار کی اور اسی محکمہ سے وظیفۂ حسن خدمت حاصل کیا۔ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ (۱)

سعید حیدر آبادی کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ انہوں نے اس وقت کے استاد شاعر میر خیرات علی خاں سخی سے مشورۂ سخن کیا۔ کلام سادہ اور شگفتہ ہوتا تھا۔ جذبات کے اظہار کا ان کو خاص ملکہ تھا۔ آپ کے کلیات زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئے۔ صرف چند تصانیف میں آپ کا کلام دستیاب ہوتا ہے۔ یوں تو انہوں نے کئی اصناف سخن میں اپنی فکر کے جوہر دکھلائے ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ اس سے ان کے قدرتِ کلام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آہیں گواہی دیتی ہیں خالی نہیں ہے دل
اوجڑا ہوا یہ گھر بھی کسی کا مقام ہے

شکرِ خدا کہ رخ کے قریب زلف کی ہے جا
دن صبح وصل اور یہ فرقت کی شام ہے

ایک اور غزل کا شعر جس میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔

حامی ہے وہی اپنا سعید جگر افکار
دکھ درد میں خالق کی رہے یاد ہمیشہ

جناب سعید کی دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کے نمونے کے طور پر دو رباعیات

ملاحظہ ہوں جوانہوں نے آصف سادس کی سال گرہ پر کہی تھیں۔

کیوں رنج و الم ہوں نہ جہاں سے کافور
کس طرح رعایا کے نہ دل ہوں مسرور
ہے سالگرہ آج شہ آصف کی
مصروف ہیں خود عیش و مسرت میں حضور(۲)

دیگر

اے شاہ دکن دکن کے سالار ہیں آپ
مالک ہیں خداوند ہیں مختار ہیں آپ
خم کرکے سر نیاز کہتا ہے سعید
میں بندہ ناچیز ہوں سردار ہیں آپ(۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد ۱۳۱۹ھ صفحہ۔(81)

(۲)(۳) سید مظفر الدین خاں صاحب، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدرآباد ۱۹۸۴ء صفحہ۔(۲۸۴)

میر تراب علی خاں سعیدؔ

نام میر تراب علی خاں اور تخلص سعید تھا۔ ولادت ۱۳۰۶ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد میر داور علی خاں بہرام الدولہ کے جداعلیٰ میر عاقل علی خاں بہادر فرخ سیر کے ملازمین میں خاص اہمیت رکھتے تھے۔ دہلی کی مغلیہ سلطنت کا جب شیرازہ بکھرا تب آصف جاہ اول کے ساتھ سید عاقل خاں بھی دکن تشریف لائے۔ سعید کا مسلک اثناعشری تھا۔ انہوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق اور منکسر المزاجی جو انہیں اسی خاندان کی وراثت سے ملی تھی اس کو جانے نہیں دیا۔ سعید نے نہایت وضعداری کی زندگی گزاری۔ آپ کے والد بہرام الدولہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا تھا۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے سعید نے انگلستان کا سفر بھی کیا تھا(۱)

سعید کی شاعری میں غزلیات کا سرمایہ زیادہ ہے۔ انہوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کی غزلیات کا پلہ بھاری ہے جو صاف اور سادہ مگر شیریں ہیں۔ پہلے امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے بعد میں جلیل کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے مشاعروں میں خاص اہتمام سے مدعو کئے جاتے تھے۔ ان کے کلام میں سلام، مرثیہ، قصیدہ، نوحہ اور واسوخت بھی ملتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

روضۂ شہ جلوہ گاہِ نورِ ایماں ہوگیا
ذرہ ذرہ کربلا کا مہرِ تاباں ہوگیا
اور بھی کچھ اضطرابِ دل کا سامان ہوگیا
مہمان کربلا کا حر جو مہماں ہوگیا

غزل کے بھی چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

رہے خود بے خبر ہم آشیاں سے شکایت اب کریں کیا باغباں سے
مری تقدیر کے جتنے ستم تھے ملے کچھ آپ سے کچھ آسماں سے
سعید اس سے سمجھ کر بات کرنا وہ بدظن ہو نہ اندازِ بیاں سے

وہ دن گئے کہ کہتے تھے دل بیقرار ہے
اب وہ سکون ہے کہ طبیعت پہ بار ہے
تکلیف میں بھی آئے نہ لب پر کوئی گلہ
سمجھو یہی مشیتِ پروردگار ہے
دامن نہ چھٹنے پائے صداقت کا ہاتھ سے
یہ اے سعید اہل وفا کا شعار ہے(۲)

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ۔ ۶۰۵

(۲) میر سرفراز علی، مضمون مرقع سخن، جلد اول۔ مرتب ڈاکٹر زور حیدر آباد ۱۹۳۵ء، صفحہ۔ ۳۶۰

سید خواجہ معین الدین سلام مدراسی

نام سید خواجہ معین الدین چشتی اور تخلص سلام مدراسی تھا۔ آپ کی ولادت ۱۵ رصفر ۱۲۸۷ھ مدراس میں ہوئی۔ سلام کے جدِ اعلیٰ بعہد آصف جاہ ثانی حیدر آباد تشریف لائے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت خواجہ معین الدین چشتی صاحب کشف و کرامات تھے۔ اسی وجہ سے آپ کو سرکار آصفیہ کی طرف سے جاگیر عطا کی گئی۔ سلام اپنے نام کے ساتھ مدراسی اس لئے پیوست کرتے ہیں کہ آپ کے جدِ اعلیٰ مدراس سے حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے۔ سلام مدراسی فارسی، عربی، انگریزی اور علم عروض میں مہارت رکھتے تھے۔ نوجوانی میں محکمہ ٹپہ میں ملازم ہو گئے اور وہیں سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ آپ کے تین فرزند (۱) سید خواجہ فخر الدین (۲) سید خواجہ محی الدین (۳) خواجہ محمد محمود حسین تھے (۱)

شاعری کا شوق سلام کو بچپن ہی سے تھا۔ آپ جناب حبیب کنتوری سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ شاعری میں آپ کے کلام میں حمد، نعت، غزل، مرثیہ، رباعی، قصیدہ ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مثنوی ''آشوب وفا''، لکھی جو حضرت خواجہ معین الدین سلطان الہند غریب نواز کی سوانح عمری ہے اور جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

سلام کے دو غیر مطبوعہ قلمی دیوان کا پتہ چلا ہے۔ نمونہ کے طور پر حمد کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

کس جا نہیں جہاں میں مالک ظہور تیرا
جس شے کو دیکھتا ہوں اس میں ہے نور تیرا

بڑھتی ہیں گو خطائیں گھٹتی نہیں عطائیں
ہو شکر کس زبان سے رب غفور تیرا

نعت شریف کے کچھ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

اس قدر محوِ جمالِ روئے پیغمبر ہوا
نیّر تاباں مری تقدیر کا اختر ہوا
الفت زلف نبی ہے دائرہ اسلام کا
اس سے جو باہر ہوا اسلام سے باہر ہوا
کام آئی مدحتِ ساقی کوثر اے سلام
خوف کا ہر ایک دامن چشمۂ کوثر ہوا

سلام مدراسی کی ایک رباعی بھی درج کی جاتی ہے۔

گلزار کو صرف گلفشانی دیکھا
ہر پھول میں رنگِ شادمانی دیکھا
اعجاز ہے سیرتِ گلستاں کا شاید
ہر چیز میں زورِ نوجوانی دیکھا(۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدر آباد ۱۳۱۹ھ صفحہ۔(۷۷)

(۲) سید مظفر الدین خاں صاحب، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء صفحہ۔(۲۸۴)

شاہ محمد صدیقی سوداگر

نام محمد صدیق کنیت شاہ اور تخلص سوداگر تھا۔ سوداگر کے والد شاہ محمد عبدالقادر صدیقی کشمیری تھے۔ شاہ صاحب کا خاندان پیری مریدی طریقت سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کے اجداد تجارت کرتے تھے۔ سوداگر کے والد جب تجارت کی غرض سے بمبئی آئے تو آپ کے اہل و عیال بھی بمبئی منتقل ہو گئے۔ سوداگر بمبئی میں ۱۲۷۶ھ کو تولد ہوئے اور اپنے والد کے ساتھ بچپن ہی میں بعہد محبوبیہ ریاست حیدرآباد میں وارد ہوئے۔ پٹلہ برج محلّہ میں سکونت اختیار کیا۔

سوداگر کو بچپن ہی سے علمی ذوق تھا۔ مذہبی ماحول دینی علوم سے فارغ التحصیل ہوئے مگر حصول روزگار کی گردش میں اپنے بھائی اسمعیل صدیقی کے ساتھ کشمیر میں ملبوسات کی تجارت شروع کر دی۔ تجارت کے ساتھ ساتھ انہوں نے مذہب کی سخت پابندی کی۔ صوم و صلوٰۃ اور احکام شرعی کے سخت پابند تھے۔ نوجوانی میں حضرت مرزا سردار بیگ صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چند سال تجارت کرنے کے بعد سوداگر نے تجارت ترک کر دی اور سلوک کے مدارج طے کرتے گئے (۱) سوداگر کے پیر و مرشد حضرت مرزا سردار بیگ صاحبؒ نے اپنے وصال سے قبل (تاریخ وصال ۱۳۱۰ہجری) شاہ محمد صدیقی سوداگر کو "شاہ محمد" کا لقب عطا کیا (۲)۔ سوداگر نے اجمیر شریف کا بھی سفر کیا اور ہر سال عرس کے موقع پر پابندی سے تشریف لے جانے لگے۔ نواب میر عثمان علی خاں نے آپ کے کشف و کرامات سے متاثر ہو کر پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کیا جو تاحیات سوداگر صاحب کو ملتا رہا۔ سوداگر شاہ محمد کا وصال ۱۳۶۶ھ میں ہوا اور بہادر پورہ کے قریب خواجہ پہاڑی پر تدفین عمل میں آئی۔

سوداگر ایک قابل ترین صوفی شخصیت کے مالک تھے۔ بحیثیت شاعر زیادہ مشہور

نہیں ہوئے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاعری میں آپ کے دو دیوان موجود ہیں۔ ایک دیوان اردو کا اور ایک دیوان فارسی کا آپ کی یادگار ہیں۔ شاعری کے علاوہ آپ کے نثری کارنامے بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں جیسے (۱) کتاب الوجوب۔ یہ تصنیف بزبان فارسی ۱۳۶۰ھ میں تصنیف کی۔ جو علم تصوف میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری تصانیف ''اعیان ثابتہ''، ''کتاب خطرات''، ''وحدت الوجود''، ''نغمات رحمانی''، ''نون والقلم''، ''فنابقا'' اور ''پیرومرید'' ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ نثری کارنامہ میں سب سے زیادہ اہمیت آپ کی لکھی ہوئی تصنیف ''شرح خصوص الحکم'' ہے۔ یہ شیخ محی الدین ابن عربی کی بزبان عربی تصنیف ہے۔ جس کی شرح حضرت سوداگر نے لکھی۔ علم تصوف میں اس تصنیف کی کافی اہمیت ہے۔

سوداگر نے دیگر شعراء کی طرح اپنی غزل کی ہیئت میں تصوف اور صوفی ازم کے مضامین شرح و بسط کے ساتھ ڈھالے ہیں۔ آپ کی غزلیات گویا صوفی ازم کی نمائندگی کرتی ہے شاعری علم عرفان کے مسائل کی توضیح و تشریح کی ہے۔ غزل کے چند شعر جو صرف عشق حقیقی کی نمائندگی کرتے ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

کیا کہوں اس عشق نے کیا کردیا
دل کو میرے کس پہ شیدا کردیا

ان کی نظروں سے نظر میری یکایک لڑگئی
دید جاناں میں عجب دیدار آتا ہے نظر

حضرت سوداگر کے کلام میں غزل بھی ملتی ہے۔ اس کا ایک شعر

روز و شب دارم خیال میرزا
خویش راچوں گم کنم از خویشتن (۳)

☆☆

(۱) امتہ السلام عالمہ، آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء مقالہ ایم۔ فل، حیدرآباد۔ صفحہ۔ (۳۱۰)
(۲) شاہ حامد صدیقی۔ دیوان ساگر، حیدرآباد۔ صفحہ (۳)
(۳) شاہ حامد صدیقی۔ دیوان سوداگر، حیدرآباد۔ صفحہ (۱۷)

مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد

نام کشن پرشاد اور شاد تخلص تھا۔ شاد کی پیدائش ۱۸/شعبان ۱۲۸۰ھ م ۲۸/جنوری ۱۸۶۴ء کو جوالا بی بی کے بطن سے ہوئی۔ آپ کی زائچہ کے حساب سے نجومی نے آپ کا نام پرشوتم داس رکھا۔ مگر آپ کے نانا مہاراجہ نریندر پرشاد نے اپنے نواسہ کا نام کشن پرشاد کہہ دیا اور آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ کشن پرشاد کا خاندان راجہ ٹوڈرمل (وزیر اکبر اعظم) سے ملتا ہے۔ شاد اپنے والد راجہ ہری کشن کی اکلوتی اولاد تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب سورج بنی کھتری خاندان سے ملتا ہے۔ آپ کے پرنانا راجہ چندو لال سکندر جاہ کے عہد میں مدار المہام تھے آپ کے نانا نریندر پرشاد نے آپ کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ چنانچہ آپ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے سنسکرت کی تعلیم درگا پرشاد سے حاصل کی سیاق کا علم مراری لال سے اور خطاطی رائے بچو لال سے سیکھی۔ اس کے علاوہ آپ نے تیراندازی بنوٹ اور شہسواری کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور گرمکھی کا علم گرونانک شاہ سے حاصل کیا تھا(۱) آپ ہندی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاد نے پیشکاری کے عہدہ سے اپنی ملازمت شروع کی۔ اور ترقی کرتے کرتے صدر اعظم جیسے جلیل القدر عہدہ سے نوازے گئے۔ شاد کو ۱۳۲۰ھ م ۱۹۰۳ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے ۔سی۔ آئی۔ ای کا خطاب عطا کیا گیا۔ پھر جارج پنجم کی سالگرہ کے موقع پر جی۔ آئی۔ ای کا خطاب عطا کیا گیا۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے عہد میں آپ مدار المہام کے عہدہ پر فائز رہے اور جب میر عثمان علی خاں نے عنان سلطنت ہاتھ میں لی تو انہوں نے ۲۵/رجب ۱۳۳۰ھ م ۱۹۱۲ء کو استعفیٰ دیدیا اور سیاسی

زندگی سے سبکدوشی اختیار کر لی۔ سبکدوشی کے بعد شاد کے گھر پر باقاعدہ علم وادب اور شعر وسخن کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ شاد کا دربار ایک بادشاہ کے دربار سے کسی طرح کم نہ تھا۔ آپ کے دربار میں ہر وقت شعراء ہند کا کثیر اجتماع موجود رہتا۔ روزانہ محفل سخن سجائی جاتی تھی۔

سرکشن پرشاد شاد نے سات شادیاں کی تھیں۔ پہلی تین بیویاں ہندو تھیں۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) رانی دھروپتی بائی عرف تہنیت محل (۲) رانی کشا بائی عرف مبارک محل (۳) رادھا بھائی عرف راحت محل بعد میں چار شادیاں مسلمان خواتین سے انجام پائیں (۱) یسین بیگم شاد محل (۲) غوثیہ بیگم مسرت محل (۳) آفتاب بیگم فرحت محل (۴) رحیمہ بیگم عشرت محل۔ آپ کی کل اولادیں پندرہ لڑکے اور اکیس لڑکیاں سات محلات سے تولد ہوئے (۲)

شاد کے مذہب کے بارے میں کافی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اگر سچ پوچھا جائے تو آپ پکے ہندو تھے۔ مگر مسلمان عقیدہ سے کافی متاثر تھے۔ قرآن شریف کی آیات روانی سے پڑھتے تھے۔ بزرگان دین سے بے پناہ عقیدت تھی۔ آپ کا طرز زندگی مسلمانوں کی طرح تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی سے انہیں بیعت حاصل تھی۔ اپنی تمام زندگی میں شاد نے کبھی بھی مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ اپنے حسب نسب سے کھتری ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ان کے ایک شعر سے ہندو ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
ہم تو ہیں آپ بھلے اپنا دلارام بھلا (۳)

شاد نے اپنی مختلف نظموں میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے۔ ذیل میں ”پریم درپن“ نظم کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلمان　　ہر مذہب ہے میرا ایمان
شاذ کا مذہب شاد ہی جانے　　آزادی آزاد ہی جانے

مہاراجہ کشن پرشاد اپنے طور طریقہ لباس رہن سہن سے پکے مسلمان معلوم ہوتے تھے مگر ان کے دل میں بت پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاد جس محفل میں شریک ہوتے ایسے گھل مل جاتے کہ لوگ انہیں اپنے عقیدہ کا ہی تصور کرتے مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک پکے بت پرست تھے۔ مگر ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب سے بے پناہ عقیدت رکھتے

تھے۔ مہاراجہ شاد سرکاری مصروفیات کے بعد ادبی محفلوں میں رنگ جماتے تھے۔ انہیں مشاعروں کا بہت شوق تھا۔ ان کا دربار بھی ایک اچھا خاصا بادشاہ کے دربار سے کم نہیں تھا۔ ہروقت آپ کے دربار میں شعراء اہل ہنر اور اہل قلم موجود رہتے۔ آپ کے ادبی خدمات کو ہم دو حصوں میں آسانی سے تقسیم کرسکتے ہیں (۴) حصہ نظم دوسرا حصہ نثر

حصہ نظم:-

مہاراجہ پرشاد کے ذوق شعری کا جھکاؤ کسی خاص صنف سخن کی طرف نہیں تھا بلکہ شروع ہی سے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ جہاں انہوں نے غزل، قصیدہ اور مرثیہ جیسی قدیم اصناف میں اپنا کمال دکھایا۔ وہیں نظمیں بھی لکھیں۔ اور مثنویاں بھی، شاد ابتداء میں اپنا کلام آصف جاہ سادس کو دکھلاتے تھے۔ جب داغ حیدرآباد تشریف لائے آصف کے ساتھ شاد نے بھی داغ سے اصلاح لینی شروع کردی۔ مہاراجہ شاد نے موضوعاتی نظمیں بھی لکھیں۔ جیسے (۱) رین بسیرا (۲) مجموعہ مناجات (۳) نظم روپیہ (۴) نعرۂ مستانہ (۵) درس محبت (۶) جذبۂ قومی یہ سب اردو نظموں کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی میں (۱) آئینہ عقیدت (۲) پیمانۂ عقیدت (۳) ایمان شاد بھی موجود ہے۔ یہ سب کلام آپ کی زندگی ہی میں زیورطبع سے آراستہ ہو چکا تھا۔ شاد کو غزل سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ اپنے سرکاری مصروفیات سے وقت نکال کر شعر شاعری کرتے تھے۔ شاد کی غزلوں کے چار دیوان موجود ہیں (۱۰) باغ (۲) غمکدہ رحمت (۳) نغمۂ شاد (۴) بیاض شاد۔

اس کے علاوہ آپ نے قصیدہ گوئی میں بھی مہارت حاصل کی۔ انہوں نے کئی قصیدے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ جیسے قصیدہ درتہنیت میر عثمان علی خاں (۲) قصیدہ درمدح آصف جاہ سادس (۳) جو آصف جاہ سادس کی سالگرہ کے موقع پر لکھا گیا۔ قصیدہ کے علاوہ شاد نے مثنویاں بھی کہیں جیسے (۱) نسیم سحر (۲) عرض حال (۳) پریم درپن (۴) جلوۂ کرشن (۵) خمار شاد (۶) بزم توحید وغیرہ ان کی یادگار مثنویاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مسدس ''آشوب عظیم'' نام سے ۳۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ گوئی میں بھی مہاراجہ شاد مہارت رکھتے تھے۔ آپ حضرت امام حسینؓ سے عقیدت رکھتے تھے۔ اس لئے آپ نے ۱۲۷۶ اشعار پر مشتمل ایک طویل مرثیہ ماتم حسین کے نام سے لکھا۔ آپ نے ''نوحۂ شاد''

.ıl .ıl 43.6KB/s 3:24 81%

کے نام سے بھی ایک نوحہ لکھا جو حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے افرادِ دکن کی موت پر بھی "نوحۂ شمس الملک" کے نام سے لکھا اور اپنے فرزند کی ناگہانی موت پر بھی ایک نوحہ "آصف پرشاد" لکھا جو ۱۶۷ اشعار پر مشتمل ہے۔یہ ایک انتہائی درد انگیز نوحہ ہے۔نمونہ کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

جی میں آتا ہے خوب سر پیٹوں — مار کے دھاڑیں خوب سا روؤں
مرغ بسمل کی طرح تڑپوں خوب — خاک پہ گر کے ہائے لوٹوں خوب
جیب و دامان کو اپنے خاک کروں — خاک کو لے کے اپنے سر پہ ملوں
خود کشی کا خیال آتا ہے — غم کلیجے کو کھائے جاتا ہے
جی بہلتا نہیں ہے اب گھر میں — رہ نو روی کا ہے جنوں سر میں
رات دن اس کا ہی تصور ہے — مثل آئینہ کے تحیر ہے

مہاراجہ شاد کے دیوان میں رباعیات اور قطعات بھی ملتے ہیں جیسے (۱) صبح امید (۲) شکوہ شاد (۳) نذر سلطان ہند (۴) رباعیات شاد (۵) آئینۂ عقیدت (۶) ارمغان زیبا (۷) گلبن تاریخ (۸) نذر شاد وغیرہ۔نمونہ کے طور پر ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

دیتا ہے دعا دل سے یہ شوال کا ماہ
سر سبز رہے باغ دکن تیرا شاہ
پامال عدو ہوں تیرے سبزہ کی طرح
تو سرخ رو اور شاد رہے آصف جاہ

مہاراجہ شاد ہندی کے بھی قادر الکلام شاعر تھے۔انہوں نے عربی رسم الخط میں ٹھمریاں، کہانیاں، بھجن، خیال اور بارہ ماسے مختلف دھنوں میں لکھے ہیں۔ان کے ہندی کلام کے دو مجموعے "نغمۂ شاد" اور "ترانہ شاد" کے نام سے شائع ہوئے۔یہ شاعری برج بھاشا میں کی گئی ہے اور تمام شعری روایات بھی برج بھاشا ہی سے لی گئی ہیں۔

مہاراجہ شاد کے تصنیفات کا دوسرا حصہ نثر میں ہے جہاں شعر و شاعری میں مہاراجہ شاد کہنہ مشق شاعر تھے وہیں انہوں نے نثری میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔مہاراجہ شاد نے شعوری طور پر نظم اور نثر کی ہر صنف میں زور آزمائی کی ہے۔ان کے مضامین اور

مقالہ نگاری کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ شاد غور و فکر کرنے والے حساس انسان تھے۔ ان کے ہاں زندگی کا ایک خاص تصور تھا۔ ان کے مسلک میں بڑی وسعت بھی تھی۔ مہاراجہ شاد نے انشائیہ کا کوئی نمونہ نہیں چھوڑا۔ حالانکہ ان کے تخیل کی جولانی سے اچھی انشائیہ نگاری کی توقع کی جاسکتی تھی۔ ان کی نثری تخلیقات ''فریاد شاد'' اور ''جذبات شاد'' دو ایسی تخلیقات ہیں جن میں انشائیہ کی خصوصیات نمایاں پائی جاتی ہیں۔ جذبات شاد کے ابتدائی صفحات میں مہاراجہ شاد نے اپنی شخصیت اپنے عقیدے اور اپنے تصورات کو سمجھایا ہے۔ ان میں انشائیہ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد اولیا اللہ کے حالات اور گلبرگہ کے سفر کی روداد کی اس طرح ملایا ہے کہ ان کی یہ تحریر بھی انشائیہ کے حدود سے نکل گئی ہے۔ مجموعہ طور پر سب مقالوں میں ان کی وسیع النظری رواداری انسان دوستی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسداری ملتی ہے۔ مہاراجہ شاد کے مندرجہ ذیل مقالات موجود ہیں (۱) دسہرہ (۲) ہندو بھائیوں سے خطاب (۳) معراج ترقی (۴) کرشن کلا (۵) فریاد شاہ (۶) آزادی (۷) سوریہ پرکاش (۸) رن بیر (۹) گیان درپن (۱۰) ذہن حسین (۱۱) نور چشم (۱۲) موتیوں کی لڑی (۱۳) ارض رمل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مقالات کے علاوہ مہاراجہ شاد نے کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جیسے ارمغان وزارت، پریم بچپن، قومی لیڈر، دولت کیا چیز ہے، ماضی و حال، تفہیم رگ وید، سالگرہ مبارک، ہولی، صاحب قران، انتقال پرملال مہاراجہ نریندر پرشد (نانا) شاد کامیابی، نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد، نذر عقیدت، سری رام چندر جی کی فطرت کا مطالعہ ایک شجاع کی نظر سے، عرب کا گھوڑا، گرو گوبند سنگھ اور ہم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مہاراجہ شاد نے ترجمہ کا فریضہ بھی انجام دیا۔ انہوں نے ایک فارسی رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا اور ''لطائف بے نظیر'' تاریخی نام رکھا جس سے سنہ ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اسی سنہ میں شائع ہوا تھا۔ مہاراجہ شاد نے ''مطلع خورشید'' نام سے ایک ناول بھی لکھا یہ ایک عشقیہ ناول ہے اور ایک ناول ''بزم خیال'' کے نام سے شائع کیا جو ۳۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

ناول کے علاوہ مہاراجہ شاد کے سفرنامے بھی ملتے ہیں جن میں زبان کی سادگی اور روانی ملتی ہے۔ حسب ذیل سفرنامے مہاراجہ کی زندگی میں ہی شائع ہو کر منظر عام پر آچکے

تھے۔جیسے ''جذباتِ شادؔ''، ''جام جہاں نما''، ''سیر نا گور''، ''سیر و سفر''، ''روزنامچہ گلبرگہ''، ''سفرِ شاد''، ''تفریحِ شاد''، ''روضہ شریف''، ''سفر دو ہفتہ''، ''شکار شیر شاہی''، ''سیر پنجاب''، ''شکار شیر''، ''قدوم سلطانی'' ایک سفرنامہ وغیرہ ملتے ہیں۔

مہاراجہ شاد ایک قابل ادیب شاعر اور اڈمنسٹریٹر تھے۔انہوں نے امور مملکت کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں کافی نام کمایا۔وہ عہد محبوبیہ کے زریں روشن چراغ تھے۔ایک لائق مفکر ہمدردی مسلک کے حامی اور صاحب دل شخصیت تھے۔ان کے مراسم نہ صرف اپنے عہد کے امراء سے تھے بلکہ غریب امیر شاعر ادیب سے بھی ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے ان کے بہت گہرے مراسم تھے اور ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔آپ کے دربار سے وابستہ شعراء کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔کم از کم ڈیڑھ سو شعراء آپ کے مدح خوان تھے۔جن کی مہاراجہ شاد نے سرپرستی کی اور مالی اعانت سے نوازا۔

مہاراجہ کشن پرشاد کی علمی و ادبی خدمات پر تبصرہ فرماتے ہوئے ڈاکٹر حبیب ضیاء اپنے مقالہ میں یوں رقمطراز ہیں۔(۵)

''مہاراجہ اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں صرف کیا۔شعراء و مصنفین کی مالی امداد اور حوصلہ افزائی کے ساتھ مختلف رسائل کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔

مہاراجہ کی سرپرستی میں جو رسائل شائع ہوئے۔ان میں خاص طور پر (۱) دبدبۂ آصفی (۲) شوکت عثمان (۳) محبوب الکلام (۴) تزک عثمانیہ (۵) گلدستہ دار السلطنت (۶) گلدستہ جشن آصفیہ (۷) حیات سخن قابل ذکر ہیں۔

---

(۱) ڈاکٹر حبیب ضیاء، کشن پرشاد شاد، حیدرآباد، ۱۹۷۸ء، صفحہ (۲۵)

(۲) ڈاکٹر حبیب ضیاء، ڈاکٹر سرکشن پرشاد شاہ، حیدرآباد ۱۹۷۸ء، صفحہ (۲۹)

(۳) کشن پرشاد شاد، جذبات شاد، حیدرآباد، صفحہ (۷)

(۴) عبدالجبار ملکاپوری، محبوب الزمن، جلد اول، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، صفحہ (۵۵۶)

(۵) حبیب ضیاء ڈاکٹر، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، حیدرآباد ۱۹۷۸ء، صفحہ (۲۴۷)

صاحبزادہ میر معین الدین علی خاں۔شبابؔ

نام میر معین الدین علی خاں اور تخلص شباب تھا۔شباب خانوادہ آصفیہ کے فرد گزرے ہیں۔آپ کی ولادت ۱۷ربیع الاول ۱۲۹۶ھ م ۱۸۷۹ء کو ہوئی۔آپ کے والد صاحبزادہ میر نجم الدین علی خان نجم قادرالکلام شاعر تھے۔گویا آپ کا سلسلہ نسب آگے چل کر آصف جاہ اول سے ملتا ہے۔شباب کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ اعزہ میں ہوئی۔شاعری کا شوق ورثہ میں ملا۔ابتداء میں شباب،حبیب کنتوری کو اپنا کلام دکھلایا کرتے تھے۔ان کے انتقال کے بعد ضامن کنتوری سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔شباب صاحب اخلاق یار باش شاعر تھے۔میر اشرف علی خاں مدہوش کے زمانے میں ہم پیالہ ہم نوالہ تھے۔شباب اپنے استاد سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے(۱)اپنے اشعار میں استاد کی تعریف کرتے ہوئے ان کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔ذیل میں اشعار ملاحظہ ہوں۔

اہل سخن کا قول ہے فیضِ حبیب سے　　تو اے شباب مالک ملک سخن ہوا
مقبولِ خلق کیوں نہ ہو اس کا کلام پھر　　شاگرد ہے شباب جناب حبیب کا

شباب ایک اچھے شاعر تھے۔ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ان کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے بندشوں کی نزاکت سے ان کے اشعار میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

کسی کا جلوہ دل کے آئینہ میں دیکھ لیتا ہوں
میں کوہ طور پہ اے حضرت موسیٰ نہیں جاتا

اس کے اٹھ جانے سے برہم ہوگیا سامان عیش
شمع جل کر بجھ گئی اور خاک پروانہ ہوا

لائی ہے تیرے در پر کشش الفت صادق
اس راہ میں میرا کوئی رہبر نہ ہوا تھا

شباب کے کلام میں معاملہ بندی نمایاں ہے۔ مختلف غزلوں کے منتخب کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

وہ کہتے ہیں میں کیا جانوں کسی کی کیا تمنا ہے
نہ جب تک حرف مطلب کا لب سائل سے نکلے گا

ہم سے کیوں یہ بے رخی الفت کا رشتہ جوڑ کر
ساقیا جانا کہاں ہے ہم سے تو منہ موڑ کر
ساقیا جانا کہاں ہے میکدہ کو چھوڑ کر
ساقیا جاتا ہے کیوں جام و صراحی توڑ کر

کہتے ہیں اپنے چہرہ سے سرکا کے زلف کو
لو آج آفتاب گہن سے نکل گیا

ہم کو دونوں جہان سے کھویا
یا خدا ہو برا محبت کا
آپ اف اف جو کر رہے ہیں شباب
کیا کلیجے کے داغ جلتے ہیں(۲)

☆☆

(۱) میر محمد علی خاں میکش، مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم مرتب ڈاکٹر زور، حیدر آباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ۔(۲۵۸)(۲۵۹)

میر اعظم علی شائق

نام میر اعظم علی اور تخلص شائق تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۴۰ھ حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کا گھرانہ مذہبی تھا۔ آپ کے والد میر احمد علی پکے مذہبی تھے جس کا اثر شائق پر بھی پڑا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم سے مولوی فاضل کیا۔ عربی فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شائق کے نانا نواب عمدۃ العلماء محبوب نواز الدولہ عدالت دارالقضا کے ناظم تھے۔ آپ کی وفات ۱۳۱۵ھ میں حیدر آباد میں ہوئی (۱)

شاعری کا شوق حضرت شائق کو نوجوانی سے تھا۔ اپنے کلام پر حضرت مائل سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کا مکمل دیوان شائع ہو چکا ہے۔ حضرت شائق کو ان کے نعتیہ کلام کی بدولت بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے دیوان میں تمام اصناف ملتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ سارا کا سارا کلام نعتیہ ہے۔ آپ نے ٹھمریاں بھی کہی ہیں وہ بھی نعتیہ ہیں۔ نمونے کے طور پر اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

اک نہ اک دن ہوگا ظالم بھی خراب — آہ مظلومی نہ خالی جائے گی
حسن کی دولت پہ اتنا خوش نہ ہو — بات سچ ہے آنے والی جائے گی
شائق اتنی فکر کیوں ہے عمر کی — چیز جو ہے جانے والی جائے گی (۲)

حضرت شائق کی ایک مشہور نعت ملاحظہ ہو۔

کھیتی تری امت کی تاحشر بڑی نکلی — جو شاخ شجر پھوٹی پھولوں سے بھری نکلی
جب گلشن طیبہ سے باد سحری نکلی — خوشبو سے دلھن بنکر کیا بھاگ بھری نکلی
لو چشم محمد کی کافی یہ مسیحائی — بیماروں کی قسمت سے کیا چارہ گری نکلی
محشر میں مرے دل سے چمکی جو تری صورت — شور اٹھا فرشتوں میں شیشے سے پری نکلی

طیبہ میں پہنچ جائے یارب وہ دھواں بنکر سینے سے جو شائق کے آہ جگری نکلی (۳)

☆☆

(۱) ڈاکٹر زور، داستان ادب حیدرآباد، حیدرآباد۔۱۹۸۲ء، صفحہ۔(۲۴۷)

(۲) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی، ۱۹۸۴ء، صفحہ۔(۵۶۶)

(۳) وقار خلیل، روشنی ہی روشنی، حیدرآباد۔۱۹۸۱ء، صفحہ۔(۳۳)

.ııl .ııl 25.3KB/s 3:24 81%

سید عباس حسین خان ششدر حیدر آبادی

نام میر اسد علی عرفیت سید عباس حسین خان اور تخلص ششدر تھا۔ آپ کے والد کا نام سید نور الدین مولوی تھا۔ ۱۲۵۱ھ میں حیدر آباد میں تولد ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت بہت ناز و نخروں سے انجام پائی۔ آپ اثناء عشری میں سے تھے۔ ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر آصف جاہ سادس نے آپ کو منصب و جاگیر سے سرفراز فرمایا۔ میر عالم آپ کے رشتہ میں نانا ہوتے تھے۔ چند بد معاشوں کے ہاتھ ۱۲۹۵ھ میں زخمی ہوئے۔ ایک زمانے تک آپ بہت بیمار رہے۔ ششدر کا کافی علاج ہوا مگر اس کے باوجود دماغی توازن باقی نہیں رہا۔ پاگل پن کے عالم میں انہوں نے ۱۲۹۸ھ میں اپنی اہلیہ کو قتل کر دیا۔ دیوانگی کی وجہ سے سزا نہ ہوئی۔ ان کا انتقال ۱۳۱۴ھ میں ہوا۔ ششدر کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی صرف ایک لڑکی تھی۔ جس کی شادی ششدر کے بھتیجے میر شمشیر حسین کے ساتھ ہوئی۔ ششدر کو ابتداء ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ وہ شمس الدین فیض سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ عمر کے آخری حصہ میں ان کا دماغی توازن ٹھیک نہ رہا(۱) ششدر صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے غزل کے علاوہ سلام، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، قطعات وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ نمونے کے طور پر غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

دل پھنس کے ان کے گیسوئے پیچان میں رہ گیا
یوسف ہمارا شام کے زندان میں رہ گیا

رباعی کا نمونہ

جامۂ گل پر نہ اتنا بھولنا رے عندلیب
ملگجی اتری ہوئی تن سے قبائے یار ہے

لب بہ لب رہتا ہے ششدر دخترِ رز سے مدام
منہ لگانا منع ہے جس کو وہ یہ مردار ہے (۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزکِ محبوبیہ جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ (۸۵)
(۲) عبدالجبار ملکاپوری، محبوب الزمن، جلد اول، حیدرآباد، ۱۳۲۷ھ، صفحہ (۵۳۱)

سید عبدالرحیم شمسؔ حیدر آبادی

نام سید عبدالرحیم اور تخلص شمسؔ تھا۔ شمسؔ کی ولادت ۱۲۶۳ھ میں حیدر آباد میں ہوئی کمسنی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے حقیقی بھائی سید عبداللہ نے آپ کی پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم بھائی کی نگرانی ہی میں پائی۔ بعد میں منشی فاضل امتحان کامیاب کیا اور محکمۂ آبکاری میں ملازم ہو گئے اسی محکمہ سے وظیفہ حسن خدمات حاصل کیا۔ (۸۵) سال کی عمر میں ۷/ ذیعقدہ ۱۳۴۸ھ میں وفات پائی۔

جناب شمسؔ کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ حضرت سخنورؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ آپ نے جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ چند متفرق اشعار غزلوں کے ملاحظہ ہوں۔

ہم بھی چلے ہیں کسی طرح قتل گاہ میں
بھرتا ہے کون دیکھئے ان کی نگاہ میں

حاسدوں نے مرے اے شمسؔ بہت سر پٹکا
نہ زباں آئی مری اور نہ فصاحت آئی

شمسؔ دعوائے کمال اچھا نہیں
آدمی کو چاہئے جھک کر چلے

اب شمسؔ کا اٹھتا ہے جنازہ کوئی دم میں
ہوتی ہے اگر دید تو دو چار پہر کی

یاد آرہا ہے شمس خدا مغفرت کرے
تمھیں خوبیاں ہزار وہ اک جاں نثار تھا(۱)

☆☆

(۱) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ (۲۴۸)

نواب میر شمس الدین خاں شمس

نام میر شمس الدین خاں اور تخلص شمس تھا۔ ولادت عہد محبوبیہ میں ہوئی۔ صحیح تاریخ ولادت معلوم نہ ہوسکی۔ آپ کے جداعلیٰ میر حسین علی خاں، شاہ عالم والی مغلیہ سلطنت کے شہزادوں کے اتالیق تھے۔ اسی صلے میں میر حسین کو منصب وجاگیر عطا کی گئی تھی۔ فرخندہ یار جنگ خطاب سے بھی نوازے گئے تھے۔ جناب شمس کے دادا نے دہلی کی تباہی کے بعد (۱۸۵۷ء) میں حیدرآباد کا رخ کیا۔ شمس کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ صاحب حیدرآبادی لکھتے ہیں کہ نواب شمس کا ۱۳۲۹ فصلی میں منصفی مومن آباد پر تقرر ہوا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی ولادت ۱۳۰۰ فصلی کے لگ بھگ ہوئی۔ نواب شمس ۱۹۴۶ء وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے (۱)

شاعری کا شوق نواب شمس کو کمسنی سے تھا۔ حضرت مائل سے مشورہ سخن حاصل کرتے تھے۔ آپ کے ایک عزیز شاگرد منور علی ہیڈ ماسٹر نے آپ کا دیوان مرتب کیا اور اس کا مقدمہ بھی لکھا۔

جناب شمس قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کے استاد مائل نے (۴) سال اصلاح دینے کے بعد اصلاح دینے سے گریز کیا کیونکہ اب اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی (۲)
جناب شمس کے کلیات میں ہر صنف کا کلام ملتا ہے۔ غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں جو میری فنا کے بعد
اب کون آنے والا ہے پیکِ قضا کے بعد

اے ضبطِ عشق دیکھ ترے ہاتھ شرم ہے
آمادۂ جفا میں وہ عہدِ وفا کے بعد

جناب شمس کی دو رباعیاں بھی بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

انسان کی گھٹی میں ہیں عصیان و گناہ
ہو فضل الٰہی تو نہ ہوں گے گمراہ
بچنا ہو اگر شر سے تو کہتے رہو شمس
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

غافل نہیں کرتا ہے نصیحت کا خیال
کیا جانے وہ کیا ہوتا ہے غفلت کا مآل

سویا ہوا ہوسکتا ہے بیدار اے شمس
جز سور کے مردے کو جگانا ہے محال(۳)

☆☆

(۱)،(۲) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، صفحہ(۱۵۲)
(۳) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ(۲۳۸)

میر کاظم علی خان شعلہؔ

نام میر کاظم علی خان اور تخلص شعلہ تھا۔ شعلہ کی ولادت ۱۲۵۲ھ میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام میر احمد خان المخاطب منیر الشعرا تھا۔ شعلہ اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائے۔ بچپن میں عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

اپنے کلام پر شاعری میں حضرت شاہ نصیر دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ کے بعد شعلہ نے پھر کسی اور سے اصلاح سخن نہیں لی۔ شعلہ ایک پرگو اور قادر شاعر تھے۔ شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ جن میں تاریخ داں جناب غلام صمدانی خان گوہر آپ کے شاگرد خاص ہیں۔ شعلہ چھپن (۵۶) سال کی عمر میں ۱۳۰۸ھ میں انتقال کر گئے۔ آپ کے کلام میں سلام، رباعی، مرثیہ، قطعات وغیرہ ملتے ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں شعلہ کو کمال حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے کلام کی اشاعت کو اہمیت نہیں دی۔

آپ کے تین بیٹے (۱) سید علی نقی (۲) سید نوازش علی اور (۳) سید قادر علی تھے۔ ان میں صرف سید نوازش علی لمعہ مشہور صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ ذیل میں بطور نمونہ شعلہ کے کلام کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

دکھادیں آپ اسے اپنا اگر چمن میں دہن
چھپائے غنچۂ دہن اپنا پیرہن میں دہن
ہوس میں بوسہ لب کو اگر نہ دونگا میں
تو بعد مرگ رہے گا کھلا کفن میں دہن (۱)

جناب شعلہ کی عقیدت اہلِ بیت اطہر سے تھی۔ جس کی نمائندگی اپنی غزل کے

آخری شعر میں کرتے ہیں۔

زبان خمسہ نظامی کی ہوگئی شعلہ
ہوا جو باز مرا وصف پنجتن میں دہن

شعلہ کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

گر وصل بھی ہوجاتا اک بار تو کیا ہوتا
دامن مجھے قاتل کا دامان قضا ہوتا
وہ شوق شہادت ہے سو بار اگر مرتا
قاتل ہی کی جانب کو لاشہ بھی پھر ہوتا
اس شعلہ بھبوکا کی شب کو جو کھلیں زلفیں
سودا کو دخاں کی دم اے شعلہ کیا ہوتا(۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ، صفحہ(۹۰)
(۲) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، دلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ(۵۶۵)

سید کاظم حسین شوکتؔ بلگرامی

نام سید کاظم حسین اور تخلص شوکت تھا شوکت کی ولادت ۲۱ر رمضان ۱۲۹۳ھ م ۱۸۷۶ء میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔ آپ کا خاندان مشہور بلگرام کا ہے۔ شوکت کی تعلیم ان کے والد حاجی سید علی حسن صاحب نے عربی کی ابتدائی تعلیم دی۔ اس کے بعد انہوں نے سید نثار حسین عظیم آبادی سے اپنے فرزند کو رجوع کر دیا اور پھر مدرسہ اعزہ ملک پیٹ میں شریک ہو کر انگریزی تعلیم حاصل کی۔ محکمۂ مال سے وابستہ ہو گئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۳۴۳ھ م ۱۹۲۴ء میں وفات پائی (۱)

جناب شوکت بلگرامی خاندانی شاعر تھے۔ آپ کے والد، دادا، پردادا سب مشہور شاعر گزرے ہیں۔ شاعری کا شوق ان کو ورثہ میں ملا ہے۔ شوکت جب ابتداء میں شعر کہنے لگے تو اپنے والد کی ناراضگی سے ڈرتے تھے لیکن ان کے والد کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ شوکت پہلے فصاحت لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں جب امیر مینائی حیدر آباد آئے تو ان سے رجوع ہو گئے (۲) شوکت کے کلام میں غزل، قصائد، مسدس، نظم، رباعیات، قطعات سب ملتے ہیں۔ انہوں نے خیام کی فارسی رباعیات کا منظوم ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اس ترجمہ میں فارسی رباعی کے ساتھ انگریزی ترجمہ مسٹر جیرالڈ کو بھی شامل کیا ہے (۲) عام طور سے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ایک دقت طلب فن ہے مگر شوکت بلگرامی نے اپنی قابلیت سے انگریزی، فارسی اور اردو ادب کو یکجا کر کے شائع کروایا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

رباعی

ہے جوش بہار آبشار و لب کشت — جام مئے دوست ساقی حور سرشت
اس دور نشاط و بیخودی میں شوکت — دوزخ ہو نصیب جو یاد آئے بہشت

دیگر

ہر ایک گناہ میں جو مستی ہوتی — بدنام کبھی نہ مے پرستی ہوتی
میں نشہ سے جس طرح ہوا ہوں بیخود — مدہوش یونہی تمام ہستی ہوئی (۲)

☆☆

(۱) سلیمان اریب، حیدرآباد کے شاعر۔ حیدرآباد ۱۹۶۲ء، صفحہ۔(۶۹)
(۲) ڈاکٹر زور، عہد عثمانی اردو کی ترقی، حیدرآباد، ۱۹۳۴ء، صفحہ۔(۲۸)

جناب غلام رسول شوکتؔ حیدر آبادی

نام غلام رسول اور تخلص شوکت حیدر آبادی تھا۔شوکت کی ولادت ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔بچپن میں تعلیم و تربیت اپنے والدین کی سرپرستی میں حاصل کی۔عربی،فارسی اور اردو میں مہارت پیدا کی۔نوجوانی میں آپ کی زندگی اور نظریات میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی۔شوکت ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے ان کے باپ،دادا برہمن تھے،نوجوانی میں اسلام کی خوبیوں سے متاثر ہوکر انہوں نے اسلام قبول کیا۔اور شوکت نام رکھ لیا(۱)

شاعری میں شوکت نے فیض کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔انہوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔

شوکت کے کلام میں غزل کے علاوہ قصیدہ رباعی سلام وغیرہ ملتے ہیں نمونہ کے طور پر چند شعر غزل کے درج کیے جاتے ہیں ملاحظہ ہو۔

دوپٹا گر ملے اس گلبدن کا
تردد کیوں کریں اپنے کفن کا
یہ کہہ کر بت نے توڑا آئینہ کا
ہوا ہمسر تو میرے بانکپن کا

شوکت ہے تو کس فکر میں کر یاد الٰہی
دم بھر کا بھروسہ نہیں اس جسم میں جان کا
جھگڑا ہو ختم کیجیے اقرار وصل کا
فتنہ ہر اک طرح کا تمہاری نہیں میں ہے

شوکت امید وصل میں دیتا ہوں جان میں
لطفِ وصال یار دمِ واپسیں میں ہے

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ، صفحہ۔ (۸۷)

سید محمد کاظم حسین شیفتہؔ کنتوری

نام سید محمد کاظم حسین تخلص شیفتہ تھا۔ شیفتہ کی ولادت ۱۲۸۰ھ میں کنتور (بارہ بنکی) میں ہوئی۔ تلاش معاش کے لئے عہد محبوبیہ میں حیدرآباد آئے اور محکمۂ مالگزاری میں ملازم ہوگئے۔ یہیں سے انہوں نے وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔ بہت قابل قدر اور اہل زبان تھے حیدرآباد میں ان کی بہت آؤ بھگت کی گئی۔ آپ کے ساتھ کنتور سے حبیب کنتوری بھی تشریف لائے (۱) شیفتہ کے والد خادم حسین بھی شاعر تھے۔

شاعری میں شیفتہ کے مدمقابل بہت کم شعرا تھے۔ آپ عہد محبوبیہ کے نامور شاعر تھے۔ آپ نے اپنے کلام پر سید لطیف اللہ قدر کنتوری سے اصلاح لی۔ حیدرآباد منتقل ہونے تک شیفتہ کنتور کہنہ مشق شاعر بن چکے تھے۔ آپ کے کئی شاگرد حیدرآباد میں موجود ہیں۔ آپ کا کلام صاف شستہ ہے۔ مضامین کی بندش اور شوکت الفاظ کی نشست سے شائستگی جھلکتی ہے۔ شیفتہ کے ہر ایک شعر سے نزاکت و لطافت عیاں ہے۔ آپ کا دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے جس میں نعت، سلام، غزل، قصیدہ رباعی، مرثیہ، قطعات وغیرہ کثرت سے ملتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہوئی یہ محبت میں حالت ہماری
نہ پہچانی اس نے بھی صورت ہماری
سحر تک بری ہوگی حالت ہماری
بلا بن گئی شام فرقت ہماری

وہ آئیں گے اے شیفتہ ہم سے ملنے
رسا ہوگی جس روز قسمت ہماری

دیگر

خوشبوئے جانفزا جو تمہارے بدن میں ہے
یہ بو بھلا کہاں سمن و نسترن میں ہے

پھولوں نہیں سمائے ہیں غنچے سرور سے
آمد بہار کی جو دوبارہ چمن میں ہے

ہے رنگ روز حشر کا فرقت کی رات میں
غربت کی شام صبح دیار وطن میں ہے

اے شیفتہ نماز ہے واجب کسوف کی
رخسار زلف میں ہے کہ سورج گہن میں ہے (۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، حصہ ہفتم، دفتر شعرائے نازک خیال، ۱۳۱۹ھ، صفحہ (۹۳)
(۲) عبدالجبار ملکاپوری، محبوب الزمن، جلد اول، حیدرآباد، ۱۳۲۹ھ، صفحہ (۵۳۲)

غلام محمد عرب شوقؔ حیدر آبادی

نام غلام محمد اور تخلص شوق تھا۔شوق کا سلسلہ نسب علی محمد صاحب عرب سے تھا جو ۱۱۸۱ھ میں عرب یمن سے ہندوستان آئے تھے۔اسی مناسبت سے شوق نے اپنے نام کے ساتھ عرب بھی شامل کرلیا تھا۔شوق کی ولادت ۷/رجب المرجب ۱۲۶۲ھ کو حیدر آباد میں ہوئی۔آپ کے جداعلیٰ محمد علی صاحب عرب آصف جاہ سوم کے عہد میں فوج میں ملازم ہو گئے۔ یہ خاندانی سلسلہ شوق حیدر آبادی تک جاری رہا۔ابتدائی عمر ہی میں شوق نے اردو فارسی میں مہارت حاصل کی۔فارسی مولوی عبدالعلی مدراسی سے سیکھی۔اور اردو کی تعلیم سید محمد سلطان عاقل سے حاصل کی۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ محکمۂ کوتوالی (پولیس) میں ملازم ہو گئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ حاصل کیا۔آپ کے صرف ایک فرزند غلام غوث عرب گزرے ہیں(۱)

شوق سید محمد سلطان عاقل دہلوی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔شوق صاحب دیوان شاعر ہیں۔ان کے دیوان کو شوق کے فرزند غلام غوث عرب نے مرتب کر کے ''بوستان بے خار'' کے نام سے شائع کیا۔شوق نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ چنانچہ ان کے دیوان میں بھی حمد،قصیدہ،مرثیہ،رباعی،قطعات وغیرہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ شوق نے فارسی اشعار کو اردو زبان میں ترجمہ کیا۔بطور نمونہ ذیل میں اردو اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

مرض عشق کی شدت ہی سہی
عوض مرگ اذیت ہی سہی
ہم بھی فریاد کرینگے سر حشر
ہاں قیامت میں قیامت ہی سہی

اے فلک غم نہیں کردے برباد
شوق ناکام کی تربیت ہی سہی

رباعی

آئے تھے کچھ اور کام کرنے کے لئے
بھولے سے چلے ہیں پیٹ بھرنے کے لئے
جب آئی اجل تو ہاں یہ معلوم ہوا
جینا تھا فقط ہمارا مرنے کے لئے(۲)

غزل کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں۔

ان سے شب ملنے کا پھر پیغام ہے
صبح سے بہتر ہماری شام ہے
کیوں بگڑتے ہو سوال وصل پر
یہ بھی کیا گالی ہے کیا دشنام ہے
کیا چھپائے سے کہیں چھپتا ہے عشق
شوق تیرا حال طشت از بام ہے(۳)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ، صفحہ(۹۱)
(۲) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، صفحہ(۱۳۹)
(۳) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، ۱۹۷۸ء، صفحہ(۵۷۹)

میر عبدالرؤف شوقؔ حیدر آبادی

نام میر عبدالرؤف، کنیت ابوالمعارج اور تخلص شوق ہے۔ والد سید عبدالکریم جعفری اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ عہد محبوبیہ میں حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ شوق کی ولادت حیدر آباد میں ہوئی (۱۲۷۴ھ م ۱۸۵۷ء) بچپن میں والد کی سرپرستی میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ محکمۂ تعمیرات میں ملازم ہوئے اور وہیں سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے آپ کے دو فرزند تھے۔ (۱)

جناب شوق کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے اپنے کلام پر محمد سرفراز علی صاحب واصفی سے اصلاح لی جو الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ بیس سال تک اصلاح لینے کے بعد جب واصفی کا انتقال ہو گیا۔ تو پھر شوق نے سید محمد کاظم حبیب کنتوری کا تلمذ اختیار کیا۔ آپ کا کلام نہایت معیاری تھا۔ دیوان شائع نہیں ہوا۔ صرف ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں ملتا ہے، جس میں حمد، نعت، رباعی، غزل اور مرثیہ بھی اصناف سخن ہیں، کلام سادگی اور شوخی سے بھرا ہوا ہے۔ نمونہ کے طور پر غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں اپنے استاد حبیب کنتوری کا ذکر کیا ہے۔

ملا ہے شوق کو فیض حبیب نکتہ داں کیا کیا
کھلے ہر معرکے میں جوہر تیغ زباں کیا کیا

نہ دل کیوں چھین لیں نیچی نگاہیں مل کے محفل میں
اشارے کرتی ہیں آنکھوں سے تیری پتلیاں کیا کیا

براہِ قدر اربابِ سخن کہتے ہیں سن سن کر
کلام شوق میں ہے جلوہ حسن بتاں کیا کیا

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر ہفتم، شعرائے نازک خیال، صفحہ (۹۸)

محمد عبدالکریم خاں شمشیر

نام محمد عبدالکریم خاں اور تخلص شمشیر تھا۔ شمشیر کی ولادت ۱۲۷۰ھ میں ضلع عثمان آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ نوجوانی میں محکمۂ پولیس میں ملازم ہوگئے۔ آپ اپنی نیک سیرت اور دیانت داری کے سبب جلد جلد ترقی کرتے ہوئے ضلع عثمان آباد کے کوتوال مقرر ہوگئے۔ چند سال بعد نواب آصف جاہ سادس نے خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا۔ بعدازاں مزید ترقی کرتے ہوئے ناظم کروڑگیری ہوگئے اور اسی محکمۂ سے وظیفہ پر علحدہ ہوئے۔ (۶۴) سال کی عمر میں ۱۳۳۴ھ میں عثمان آباد میں انتقال کیا(۱)

جناب شمشیر کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ حضرت داغ سے کلام پر اصلاح لیتے تھے آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے عزیز دوست اور شاگرد کلیم محمد عاشق حسین ہاتف نے ''متاع المعرفت'' نام سے آپ کا دیوان شائع کیا۔ اس دیوان میں ہر قسم کے موضوعات و اصناف ملتے ہیں جو ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ جناب شمشیر قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کا کلام صاف ستھرا اور معیاری زبان میں ہے۔ الفاظ کا دروبست اور محاورات کا استعمال داغ کے رنگ کا ترجمان ہے۔

نمونے کے طور پر مختلف غزلوں سے متفرق اشعار درج ذیل ہیں۔

بارش مجھے شراب کی آنے لگی نظر
مستی میں میں نے نام جو الٹا شراب کا

دل بلبل بستان مدینہ ہے ازل سے
صحرا سے اسے کام نہ کہسار سے مطلب

جو یا تری رحمت کے ہیں محشر میں الٰہی
کرتے ہیں گنہ ہم تجھے غفار سمجھ کر

ہو جاؤں مست جب مری آنکھوں کو دید ہو
قامت کو دیکھ لوں تو قیامت بپا کروں

پرہیز نہ کر بادہ پرستی سے خبردار
لے جام کبھی اور کبھی دام کئے جا

ہوا ہے عالم پیری سے ہاتھ میں رعشہ
کہاں فسانۂ عہد شباب لکھتے ہیں

☆☆

(۱) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷، صفحہ (۳۴۹)

میر مہدی علی شہیدؔ

نام میر مہدی اور تخلص شہید تھا۔ شہید کی ولادت ۱۳۰۳ھ میں بمقام حیدرآباد میں ہوئی۔ جناب شہید کے دادا زین العابدین ہمدم بھی شاعر تھے۔ ہمدم عہد افضل الدولہ میں ایران سے حیدرآباد آئے اور یہیں آباد ہوگئے۔ جناب شہید کی تعلیم وتربیت اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ عہدِ محبوبیہ میں شہید آصف جاہ سادس کے دربار سے متوسل تھے۔ شاہی دربار سے وابستگی سے انہیں عہد عثمانی میں شہید یار جنگ کا خطاب عنایت ہوا۔ آپ کا وصال ۱۳۶۵ھ میں حیدرآباد کے مشہور شاعر رہے ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ دائرہ میر مومن میں مدفون ہیں۔ آپ کے ہونہار فرزند سعید شہدی حیدرآباد میں ہوا۔ دائرہ میر مومن میں مدفون ہیں۔ آپ کے ہونہار فرزند سعید شہدی حیدرآباد کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ کا دیوان حال ہی میں شائع ہو چکا ہے(۱)

جناب شہید کو شاعری ورثہ میں ملی۔ آپ کے والد اور دادا بھی پرگو شاعر تھے۔ شہید نے ابتداء میں رشید لکھنوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ بعد میں جب نظم طباطبائی حیدرآباد آگئے تو شہید نے نظم کے آگے زنوائے ادب تہہ کیا۔ شہید نے اپنی زندگی میں ''تسبیح خیال'' نام سے رباعیات کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں (۸۹) رباعیات ملتی ہیں۔ ہر رباعی مختلف عنوانات رکھتی ہے۔ ابتداء میں شہید صرف نوحہ اور سلام و مرثیہ موزوں کرتے تھے بعد میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ نمونے کے طور پر ان کی غزلوں کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں۔

بجھا گیا ستم ایجاد شمعِ تربت بھی ہمارے غم میں کوئی ایک اشکبار نہ تھا
بہت آج کل آئینہ دیکھتے ہو تمہیں ہوگی اپنی نظر دیکھ لینا(۲)

جناب شہید کی ایک اور مشہور غزل کے چند شعر یہ ہیں:

آمادۂ وفا ہوئے ترک جفا کے بعد — اب ابتداء ہوئی ہے مگر انتہا کے بعد
آساں نہیں ہے منزل الفت کا راستہ — ہر ہر قدم نزول بلا ہے بلا کے بعد
دیکھا گیا نہ حال مریض فراق کا — رونے لگے وہ منہ کو پھرا کر دعا کے بعد
طولِ شب فراق نے قصہ چکا دیا — آئے وہ اپنے وعدہ پہ لیکن قضا کے بعد

اے باغباں بہار پہ اتنا غرور کیا
صرصر بھی چلنے والی ہے باد صبا کے بعد

جناب شہید کے فرزند سعید شہیدی کی اسی ردیف کے ساتھ ایک غزل ہے۔ جس کا یہ شعر مشہور ہے۔

کعبہ کا احترام بھی میری نظر میں ہے — سر کس طرف جھاؤں تجھے دیکھنے کے بعد

جناب شہید کی چند موضوعاتی رباعیات ملاحظہ ہوں۔

قصہ عبرت

اے اہل جہاں آؤ کہانی سن لو — اس پیر سے کچھ ذکر جوانی سن لو
بس میں ہے ابھی زبان کہے دیتا ہوں — سن لو سن لو میری زبانی سن لو

کمال جلوہ

طفل کی ہے انتہا جواں ہوجانا — ہے اوج شباب ناتواں ہوجانا
پیری میں یہ موت سے عذر کیا معنی — جلوے کا کمال ہے نہاں ہوجانا

خواب جوانی

بن کر ٹوٹا حباب دیکھا تونے — کیا جلد گیا شباب دیکھا تونے
پیری میں نہ ذکر جوانی کا شہید — اب بھول بھی جا جو خواب دیکھا تونے

☆☆

(۱) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد۔ ۱۳۵۷ھ۔ صفحہ (۲۵۳)
(۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو دہلی ۱۹۸۴ء، صفحہ (۲۰۹)

میر حیات الدین صافؔ

نام میر حیات الدین اور تخلص صاف تھا۔صاف کے والد کا نام حضرت شمس الدین فیض تھا۔۱۲۶۵ھ میں ولادت ہوئی۔حیدرآباد میں۔صاف کی تعلیم وتربیت اپنے والد حضرت فیض ہی کی نگرانی میں ہوئی صاف عالم جوانی میں انتقال کر گئے۔صاف اپنے کلام پر اپنے والد ہی سے اصلاح لیتے تھے۔آپ کا ایک مختصر سا دیوان ۱۳۱۹ھ میں نواب محمد کریم الدین خاں فرزند نواب مشرف جنگ فیاض (جو جناب کے گہرے دوست تھے) نے شائع کر دیا اس کے علاوہ آپ کے کلام کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔جناب صاف کے دیوان کا قطعہ تاریخ حضرت جلیل مانک پوری نے یوں موزوں کیا تھا۔(۱)''صاف کے دیوان کا ہر لفظ جام فیض ہے۔''

صاف کے دو بڑے بھائی تھے ایک ضیاء الدین احمد اور دوسرے عماد الدین محمد وصف،صاف کے دیوان کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دیوان حضرت فیض کے رنگ کی ترجمانی کرتا ہے۔جناب صاف کو اپنے والد اور استاد سے بے حد عقیدت تھی۔صاف کی زبان اور بیان کی پاکیزگی وہی ہے جو حضرت فیض کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے اسی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام فیض کا ہے نہ کہ جناب صاف کا۔جناب صاف کے کلام

Maasreen-e-Dagh Deh
میں غزل، مرثیہ، رباعی اور قطعات وغیرہ سبھی اصناف ملتے ہیں۔ جناب صاف نے سخت سے سخت زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔

ذیل میں غزل کے دو شعر دیے جاتے ہیں۔

یہ چار دن کی ہوا ہے بہار خندۂ گل
نہیں ہے باد صبا اعتبار خندۂ گل
چمن مقام ہے رونے کا اے نسیم سحر
ہوا ہے اب کوئی دم میں بہار خندۂ گل (۲)

جناب صاف کو اپنی موت کا علم پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں وہ اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں۔

اے صاف سمجھ صحبت احباب غنیمت
سنتے ہیں جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

صاف کے کلام میں سادگی بھی صاف نمایاں نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نہ گل سے کام، نہ بلبل سے کچھ غرض مجھ کو
مری بلا سے اگر موسم بہار آیا

جناب صاف ایک آزاد خیال شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے ذہن کی وسعتوں کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ مندرجہ ذیل غزل کے اشعار اسی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جی میں ہے دیر و حرم کو ڈھایئے
تا نہ جھگڑیں پھر یہ شیخ و برہمن
کفر و ایمان کے دو آبے میں نہ ڈوبے کوئی
مان لیں کہنا اگر گبر و مسلماں میرا
عشق کے بندے ہوئے مذہب سے کچھ مطلب نہیں
بندگی کہہ دو ہماری کافر و دیندار کو

اس کے علاوہ جناب صاف کے دیوان میں مختلف اصناف اور موضوعات کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ چند شعر درج ہیں۔

ہوا ہے شرم سے پانی سحاب گوہر بار
پہن کے یار میرا موتیوں کا ہار آیا

خدا کے واسطے صیاد اب رہا کردے
چمن میں ہنستے ہیں گل موسم بہار آیا(۳)

(۱) ڈاکٹر زور، فیض سخن، حیدرآباد ۱۹۳۷ء، صفحہ(۳۹)
(۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ(۵۱۲)
(۳) سید عباس متقی، قاضی احمد علی قاضی، مقالہ ایم فل، حیدرآباد، ۱۹۸۸ء، صفحہ(۲۸)

حضرت آغا محمد داؤد صاحب صحوؔ

نام آغا محمد داؤد تھا اور تخلص صحو فرماتے تھے۔ آپ کے والد آغا محمد حیدر ضلع نظام آباد کے متوطن تھے۔ قطب شاہی عہد میں منصب سے سرفرز ہوئے اور جاگیر بھی پائی۔ آپ کا تعلق سلسلہ پیری مریدی سے تھا۔ مولانا شاہ محمد حسن کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہوئے جو آپ کے والد آغا محمد حیدر کے پیر و مرشد تھے۔ حضرت داؤد صاحب صحو اہل دل، صاحب نظر شاعر تھے (۱) وجاہت خاندانی تھی۔ شاہی منصب کے باوجود آپ ذکر وعبارت اور ریاضت کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے مرشد حضرت حسن محمود ابوالعلائی کے ہاتھ پر بیعت لی۔ دو سال تک مسلسل ذکر وعبارت میں رہنے کے بعد جذب غالب ہوگیا۔ لباس کا خیال نہ تھا نہ غذا کی فکر۔ اس کیفیت میں مقامات طریقت طے ہونے لگے۔ بالآخر حضرت پیر و مرشد نے خلافت سے سرفراز کیا۔ آپ پابند صوم وصلوۃ، تہجد گزار، ذاکر تھے۔ آپ کے کشف وکرامات کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ بھی ان کے عقید تمندوں میں شامل ہوگئے۔ شاہ آصف نے آپ سے متاثر ہوکر ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جو آپ کے ''دیوان محبوب'' میں ملتا ہے۔ حضرت صحو کو مذہبی کتب کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اکثر رسائل معرفت وحقیقت مطالعہ میں رہتے۔ جس کی بدولت انہیں فن تصوف پر کامل عبور تھا۔ (۲) اپنے پیر و مرشد کی صحبت اور فیضان نسبت نے اس چنگاری کو ہوادے کر شعلہ بنادیا۔ رفتہ رفتہ ریاضت کا غلبہ اس قدر شدید ہوا کہ دنیا اور خلائق سے بیزار ہوکر وجد و جلال میں گوشہ نشین ہوگئے۔ باوجود اس کے معتقدین کثرت سے آتے رہتے۔ جس کسی پر نگاہ لطف وکرم کی وہ فیضیاب ہوگیا۔ آپ کے فقر کا یہ حال تھا کہ مدتوں روٹی اور بے نمک

دال پر بسر کرتے۔ لیکن غربا اور مساکین کو بہتر سے بہتر کھانا کھلاتے۔

حضرت آغا داؤد صحو کا مذاق سخن بہت اعلیٰ اور معیاری تھا۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا حضرت صحو فارسی اور اردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ ۱۳۳۳ھ میں آپ کی شاعری کا دیوان ''دیوان صحو'' کے نام سے شائع ہوا۔ استاد جلیل مانکپوری نے دیوان صحو کی اشاعت پر جو اشعار موزوں کئے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخیل کی گرمی اور طبیعت کا تقدس اور عشق حقیقی کے جذبے نے ان شاعرانہ رجحانات کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیا تھا چند شعر دیوان صحو سے ملاحظہ ہوں۔

پہچانتے نہیں ہیں ابھی تک وہ آپ کو　　جھگڑا یہی تو گبرو مسلماں میں رہ گیا
وحشت کو میری دیکھ کے گھبرا گیا ہے وہ　　دست جنوں بھی چاک گریباں میں رہ گیا

حضرت صحو کے دیوان میں غزل کے علاوہ مخمس، ٹھمری، قطعات وغیرہ بھی ملتے ہیں۔

مخمس

بے وسیلوں کا وسیلہ ہے عراقی ساقی
تیرے میخانے پہ حاضر ہے شرابی ساقی
عرض کچھ کر نہیں سکتا ہے خرابی ساقی
اس بلا نوش کو تلچھٹ ہی ہے کافی ساقی
بھر دے ساغر میں جو شیشے میں ہے باقی ساقی

حضرت صحو کی ایک ٹھمری کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بن والے پپیہا پیارے
مجھے لاگی نجریا توری رے
ایک تو نینا مد مانے
دوجے نینا باندھی کٹاری رے

حضرت صحو ایک صوفی شاعر تھے اس لئے ان کے کلام میں زیادہ تر تصوف ہی ملتا ہے۔ ان کے دیوان میں جو غزلیں ہیں ان میں سے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہر گز یقیں نہ ہوگا مری بات کا اسے
کیا ہوگیا صحو کو نہیں ہاں میں رہ گیا(۳)

☆☆

(۱) امت السلام۔ مقالہ، آصفجاہی دور کے صوفی شعراء۔ صفحہ(۱۹۵)

(۲) ڈاکٹر عقیل ہاشمی امتہ الاسلام، سید افتخار علی وطن، حیدرآباد، صفحہ(۱۰)

(۳) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، نئی دہلی ۱۹۷۸ء۔ صفحہ(۵۷۰)

محمد حبیب الدین صغیر

نام محمد حبیب الدین اور تخلص صغیر تھا۔ صغیر کی پیدائش ۲۲؍رجب المرجب ۱۳۰۰ھ کو بروز جمعہ محلہ مغل پورہ، حیدر آباد میں ہوئی۔ والد محمد فیاض الدین شہر قندھار ضلع نانڈیڑ کے قاضی تھے، آپ کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔ صغیر کے والد نے اپنے فرزند کی پیدائش کی تاریخ سنہ ابجد سے نکالی (۱) اور نام صغیر رکھا اس کے اعداد جمع کرنے پر تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ صغیر کے جدامجد تین سو سال قبل قندھار سے دکن منتقل ہو گئے تھے۔ صغیر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی بعد میں جامعہ نظامیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ نواب محمد انوار اللہ خاں فضیلت جنگ آپ کے چچازاد بھائی تھے۔

صغیر نے دس سال کی عمر سے شاعری شروع کی اور اپنا کلام حضرت صوفی شمس الحق سجاد علی میکش تھانوی کو دکھلانے لگے۔ حضرت میکش صوفی منش شاعر تھے سلسلۂ بیعت سے بھی وابستگی تھی اس لئے صغیر نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ جب میکش کا وصال ہوگیا تو صغیر میر امداد علی علوی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد علوی کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح صغیر کو دو صوفی شاعروں سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے صرف صوفیانہ اور عارفانہ کلام پر توجہ دی۔ اس کے سوا دوسری تمام اصناف ہمیشہ کے لئے ترک کردیں۔ ویسے تو صغیر کے دیوان میں ہر صنف سخن کے چند نمونے ملتے ہیں لیکن ان سب پر صوفیانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ صغیر کے کلام میں جا بجا اپنے استاد میکش اور علوی کا ذکر ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

صغیر اشعار میں تیرے عجب کچھ لطف آتا ہے
یہ ہے احسان علوی کا اثر میکش کی صحبت کا

حضرت علوی و میکش کا تو میں ذکر کروں
یہ غلط ہے کہ صغیر ان کو مری یاد نہیں(۲)

صغیر اپنے کلام کی اشاعت سے کتراتے تھے۔انہوں نے شہرت سے پرہیز کیا۔ اس وجہ سے ان کا دیوان شائع نہیں ہوا۔شعروسخن کے علاوہ صغیر ہر سال حضرت علوی اور حضرت میکش کے عرس کے موقع پر مشاعرے کا اہتمام کرتے تھے۔جناب صغیر کی غزلوں کے انتخاب کا ایک مجموعہ ''گلدستہ بزم رندان'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔جواب دستیاب نہیں ہے۔

صغیر کی نوجوانی کے کلام پر عشق حقیقی کا رنگ بھی نمایاں ہے۔صغیر کے عنفوان شباب کا کلام اپنے ماحول کے تقاضے اور عام رجحانات کا عکاس ہے۔

صغیر کی نوجوانی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تقدیر کا مٹے گا نہ ہر گز لکھا ہوا
رکتا نہیں ہے تیر کماں سے چلا ہوا

زاہد نے خوب لطف اٹھایا شباب میں
آئے جو دن قریب تو اب پارسا ہوا

جب صغیر عمر رسیدہ ہوگئے تو موت کو یاد کرنے لگے۔چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

مجھ ناتواں کو دیکھ کے یہ کہہ رہی ہے موت
چلئے صغیر کیجئے نقل مکاں کہیں

☆☆

(۱) ابوالخیر سید شاہ ابراہیم حسینی، مضمون از مرقع سخن، جلد اول، حیدرآباد، ۱۹۳۵ء......(۳۲۳)

(۲) ابوالخیر سید شاہ ابراہیم حسین، مضمون مرقع سخن، جلد اول، حیدرآباد ۱۹۳۵ء......(۳۲۷)

مرزا بہادر علی صفؔی حیدرآبادی

نام مرزا بہادر علی اور تخلص صفی تھا۔ ولادت حیدرآباد میں ہوئی۔ عہدِ محبوبیہ کے نوجوان شاعر تھے۔ آپ کا ایک دیوان ۱۳۳۰ھ میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ تلاش بسیار کے باوجود ہمدست نہ ہوسکا۔ صاحب حیدرآبادی اپنی تالیف جنوبی ہند میں رباعی گوئی میں لکھتے ہیں کہ صفی کا ایک مجموعہ زیرِ نظر ہے۔ جس میں ۱۳۴ رباعیات ہیں۔ اس کا مقدمہ نظم طباطبائی نے لکھا ہے جناب صفی اردو اور فارسی کے کامیاب شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں تمام اصناف ملتے ہیں (۱)

رباعیات ملاحظہ ہوں۔

کر سکتے ہیں کب وصف رقم ہم تیرا بیجاں بھی جو ہیں بھرتے ہیں وہ دم تیرا
آنکھوں میں ہیں پوشیدہ نظر کی صورت اللہ اللہ کیا ہے عالم تیرا

بندے کو کسی غنی کا محتاج نہ کر دنیا میں کسی ولی کا محتاج نہ کر
حاجت ہے صفی کی یہی اے میرے کریم تو اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کر

اولاد اگر کسی کی قسمت میں نہیں جینے کا مزہ اسے حقیقت میں نہیں
رنگین ہے اس پھول سے دنیا کا چمن یہ پھل وہ ہے جو باغ جنت میں نہیں

☆☆

(۱) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۱۶۴، ۱۶۵)

محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری

نام محمد عبدالجبار خاں اور صوفی تخلص تھا۔ ولادت ۱۲۵۰ھ میں ملکاپور ضلع برار میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں ملکاپور میں ہوئی۔ ملازمت کے لئے عہد محبوبیہ میں حیدرآباد آئے۔ ان کی علمی قابلیت کے مدنظر حکومت نے انہیں مدرسہ اعزہ میں عربی اور فارسی کا معلم بنادیا۔ جناب صوفی ملکاپوری نے اپنی نوکری کے ساتھ ساتھ علمی وادبی خدمات کیں جن کو اہل دکن کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ عبدالجبار خاں صوفی نے مدرسہ اعزہ ہی سے وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد دکن کی تاریخ لکھ کر عہد محبوبیہ میں گراں قدر کارنامہ انجام دیا جس کی تفصیلات بعد میں آئے گی۔ عبدالجبار خاں کی وفات ۱۳۴۴ھ م ۱۹۲۵ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔(۱)

عبدالجبار خاں صوفی ادبی دنیا میں نامور مورخ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی تاریخ دکن کی تحقیق و تدوین کے لئے وقف کردی تھی اور برسوں کی عرق ریزی کے بعد ''محبوب التواریخ'' کا سلسلہ مرتب کیا جو پانچ جلدوں پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''محبوب الوطن'' تاریخ سلاطین بہمنی، محبوب الزمن (تذکرہ شعرائے دکن) اور اسی کے ساتھ محبوب ذی المنن (تذکرہ اولیائے دکن) لکھ کر اردو کی بڑی خدمت انجام دی۔

جناب تمکین کاظمی رسالہ نقوش لاہور میں رقمطراز ہیں مولوی صاحب کا اصل کارنامہ تاریخ دکن ہے۔ دکن کا تاریخی مواد نہایت مبہم اور منتشر تھا مگر مولوی صاحب نے بڑی عمدگی سے اسے فراہم کیا اور ترتیب دیا۔(۲) آگے لکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے بڑے بڑے لوگ مثلاً نواب تلاوت جنگ صدرالمہام مال نواب رستم جنگ ناظم کروڑ گیری، نواب غازی یار جنگ وغیرہ مولوی صاحب کے شاگرد تھے جن کی شاگردی پر مولوی صاحب بہت ناز فرمایا

کرتے تھے۔

تمکین کاظمی کے والد منتخب الدین تجلی بھی صوفی صاحب کے شاگرد تھے۔ مولوی صاحب کے پاس نایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو طغیانی میں تلف ہو گیا۔ مختصر یہ کہ صوفی صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ عالم تھے اور اپنے زمانے کے قابل لوگوں میں سے تھے۔ بیس پچیس کتابوں کے مسودے یادگار چھوڑے ہیں۔ بعض نقادوں نے جناب صوفی کو دکن کا آزاد کہا ہے۔ انہوں نے دکن کے بیسیوں شاعروں کو گمنامی سے بچایا اور ان کے حالات اور کلام کو اپنی تصانیف میں محفوظ کر دیا۔ اگر چہ شاعری میں خود انہوں نے بڑا نام پیدا نہیں کیا لیکن تحقیق و تلاش سے حیدر آباد کے شاعروں پر جو مواد جمع کیا ہے وہ اتنا وافر ہے کہ اس سے ماخذ کا کام لیا جاتا ہے۔

☆☆

(۱) زینت ساجد، حیدر آباد کے ادیب، جلد دوم حیدر آباد، ۱۹۶۲ء، صفحہ (۹۰)

(۲) رسالہ نقوش، شخصیات نمبر، جلد دوم، مضمون تمکین کاظمی، لاہور، ۱۹۵۶ء، صفحہ (۱۲۶۶)

سید محمد ضامن، ضامنؔ کنتوری

نام سید محمد ضامن اور تخلص ضامن تھا۔ ضامن کی ولادت ۶؍ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ م ۱۸۷۳ء (بمقام کنتور، بارہ بنکی) میں ہوئی، اپنے والد سید محمد کاظم حبیب کنتوری کے ہمراہ حیدرآباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ضامن کی تعلیم وتربیت اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ انہوں نے عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور عہد محبوبیہ میں محکمہ بگی خانہ سرکار آصفیہ میں ملازم ہوگئے اور وہیں سے وظیفۂ حسن خدمت حاصل کیا۔ آپ کی وفات ۱۳۳۰ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔

ضامن کنتوری کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے والد حبیب کنتوری قادرالکلام شاعر تھے۔ ضامن اپنے کلام پر اپنے والد ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں اپنا کلام چھوڑا ہے۔ ضامن کا اردو دیوان شائع ہوگیا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے لارڈ ٹینی سن (Lord Tenyson) کی مشہور نظم ''اینک آرڈن'' کا ترجمہ ''شہید وفا'' کے نام سے بہت عمدہ کیا ہے(۱)۔ مثنوی کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

دل کو ہر طرح سے سنبھالا — امید پہ غم کو اس نے ٹالا
لیکن جب اور ذکر آیا — پلٹا کچھ گفتگو نے کھایا
ان یک کرنے لگا نصیحت — جیسی ہے سپاہیوں کی عادت
اللہ کا آسرا بتایا — تعلیم و رضا کا ذکر لایا

ضامن کا کلام بہت پرمغز اور معنی آفریں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی غزل میں معاملہ بندی کو بڑی خوبی سے رقم کیا۔ غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

عمر بھر اپنے کہے پر آپ ہی رونا پڑا
داغ بدنامی کو آب اشک سے دھونا پڑا
ہو برا اغراض کا لینا پڑا احسان خلق
بھاگتے تھے جس سے آخر بوجھ وہ ڈھونا پڑا
عید کا دن ہے عداوت ہی سے کہہ دے واعظ
کہ ہوا آج یہ ہے خون جگر جام شراب
ساتھ دل کے گئیں سب دل کی امنگیں ضامن
ہوس سیر گل اب ہے نہ سر جام شراب

شاعری کے علاوہ جناب ضامن نے بریلی سے ایک رسالہ ''لسان الملک'' بھی جاری کیا اس کے ایڈیٹر بھی ضامن ہی تھے۔ حیدرآباد میں آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔

جناب ضامن کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) فارسی کلیات کا ترجمہ نیرنگ مقال (۲) ارتنگ خیال (فارسی کلام کا دیوان) (۳) طریق سعادت (نثر) (۴) بالک پھلواری (چھوٹے بچوں کے لئے نظمیں تحریر کی ہیں) (۵) قواعد کنتوری (۶) عبرت کدہ سندھ (تاریخ سندھ) (۷) ارمغاں فرہنگ یہ انگریزی کے مشہور شعراء کا تذکرہ ہے جس کو اردو زبان میں منظوم کیا گیا ہے۔ (۸) شہید وفا یہ ٹینی سن کی نظم انیک آرڈن کا منظوم ترجمہ ہے۔

ذیل میں ضامن کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تم لاکھ چھپو حسن چھپایا نہیں جاتا
رسوائے جہاں ہوگئے پردا نہیں جاتا
ہم سمجھے تھے اے دوست یہ دوگھر ہیں خدا کے
کیا بتکدے سے کعبہ کو رستا نہیں جاتا
آہنگ طرب چھیڑ یہ ہے شاد کی محفل
کیا بات ہے ضامن ترا رونا نہیں جاتا

ضامن کی ایک رباعی جو رسالہ ''لسان الملک'' جنوری ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی ملاحظہ ہو۔

آنکھیں کہتی ہیں حسن فطرت دیکھو — ہر رنگ میں نیرنگیٔ قدرت دیکھو
حیرت کا اشارہ ہے ادھر تو آؤ — لو آئینہ میں اپنی ہی صورت دیکھو

جناب ضامن کنتوری نے ایک مشاعرے میں بڑی اچھی غزل پڑھی تھی اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

یہ اندیشہ ہے حق کہہ کر نہ جائے مفت جاں میری
کرو اقرار جاں بخشی تو گویا ہو زباں میری
عجب کیا گر بنے وہ بزم عشرت حلقہ ماتم
زبان تیری ہوائے افسانہ گو اور داستان میری (۳)

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی، ۱۹۸۷ء، صفحہ (۶۳۲)
(۲) صاحب حیدرآبادی، دکن میں رباعی گوئی، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۱۷۲)
(۳) عبدالحق، رسالہ اردو، جلد سوم، اپریل ۱۹۲۳ء، صفحہ (۳۰۷)

حافظ مرزا امیر الدین ضیاءؔ دہلوی

نام مرزا امیر الدین اور تخلص ضیاء ہے۔ضیاء کی ولادت ۵/ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ م ۱۸۵۶ء میں ہوئی۔ بچپن میں قرآن شریف حفظ کیا۔ضیاء دہلوی کا سلسلہ سات پشتوں سے اورنگ زیب عالمگیر تک پہنچتا ہے(۱) اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔نو جوانی میں اپنے والد شہزادہ مرزا رحیم الدین کے ساتھ حیدرآباد منتقل ہوگئے۔محکمہ صدر محاسبی میں ملازمت اختیار کی۔شاہی خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے فن سپا ہگری میں مہارت رکھتے تھے۔

ضیاء دہلوی کو شاعری وراثت میں ملی۔آپ کے والد اور خاندان کے دیگر افراد بھی شاعری میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔انہوں نے بھی اس فن میں بہت شہرت حاصل کی۔ ضیاء اپنا کلام استاد فن حضرت حیا دہلوی کو دکھاتے تھے۔آپ کے کلام میں اردو اور فارسی کے اشعار ملتے ہیں۔ضیاء کے کلام میں دہلی کی زبان کا اثر نمایاں ہے۔آپ کا ایک دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔جس میں حمد،نعت،مرثیہ،قصیدہ،رباعی اور غزلیات غرض تمام اصناف ملتے ہیں۔جس سے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

جمع ہوں اشک جو گریاں کے ترے پل بھر کے
سارے عالم کو ڈبودیں وہیں جل تھل بھر کے
کھینچ لی میں نے تری زلف پریشاں کی شبیہ
آہ پر آہ شب ہجر مسلسل بھر کے
دھجیاں دست جنوں سے یہ اڑیں دامن کی
جتنے ٹکڑے ہیں وہ پورے نہیں انگل بھر کے

غزل

روٹھ کر وہ جو شبِ وصل اٹھے پہلو سے
پاؤں پر گر کے منانے لگی حسرت میری
شرمِ عصیاں مجھے دامن میں چھپالے جلدی
جستجو کرنے کو اٹھی ہے قیامت میری
بدگمانی سے یقین تھا جو نہ مرنے کا مرے
دیکھ لی اس نے کفن کھول کے صورت تیری
اے ضیاء مرکے بھی میں کام ہر اک کے آیا
وجہ عبرت پے عالم ہوئی تربت میری(۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، شعرائے نازک خیال، صفحہ(۱۰۳)
(۲) صاحب حیدر آبادی، دکن کی رباعی گوئی، تذکرہ شعراء، صفحہ(۳۶۲)

سید مہدی ضیاء لکھنوی

آپ کا نام سید مہدی اور تخلص ضیاء تھا۔ ولادت ۱۲۴۰ھ م ۱۸۲۶ھ میں بمقام مفتی گنج لکھنو ہوئی۔ جناب ضیاء ملازمت کے سلسلے میں ''عہد محبوبیہ'' میں حیدر آباد تشریف لائے۔ آپ کا بچپن اپنے والدین کی سرپرستی میں لکھنو میں گزرا۔ عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل تھی۔ فرقہ اثنا عشری سے آپ کا تعلق تھا۔ نواب مختار الملک سرسالار جنگ اول نے آپ کی قابلیت ولیاقت سے متاثر ہوکر پچاس روپے منصب مقرر فرمائی۔ آپ تا حیات یہ منصب حاصل کرتے رہے۔ ضیا لکھنوی اسی (۸۰) سال کی عمر میں ۱۳۲۰ھ میں انتقال کر گئے۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند سید قطب جعفر کو اپنے والد کی منصب پچاس روپیہ برابر ملتی رہی (۱)

جناب ضیاء لکھنوی کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور جناب ضیاء نے حضرت مہر علی انس لکھنوی سے اصلاح لی ہے۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں زور قلم آزمایا ہے۔ آپ کا کلام نہایت صاف سلیس اور شگفتہ ہے ضیاء لکھنوی کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت سعدی شیرازی کے کلیات کا بہت غور سے مطالعہ کیا ہے جس سے متاثر ہوکر انہوں نے اردو اشعار میں ان کے خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ ضیاء کے کلام میں طویل غزلیں ملتی ہیں۔ ایک طویل غزل کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

سوال وصل کب میں نے کیا انصاف کچھ کیجیے
عبث آپ اے صنم جامہ سے باہر ہوتے جاتے ہیں

پسینہ سیر گلشن میں جون کے رخ پر آتا ہے
خجالت سے عرق آگیں گل تر ہوتے جاتے ہیں

تمنائیں بہلتی ہیں مراد دل بر آتی ہے
مرے ارمان کیا بخت سکندر ہوتے جاتے ہیں

ضیاء اہل سخن کے فیض سے یہ مرتبہ پایا
مرے اشعار سعدی کے برابر ہوتے جاتے ہیں(۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر طبقۂ شعراء حیدرآباد ۱۳۱۹ھ صفحہ (۱۰۷)

(۲) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر طبقۂ شعراء حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ صفحہ (۱۰۸)

میر بادشاہ علی ضیاء لکھنوی

نام میر بادشاہ علی اور تخلص ضیاء تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۷۷ھ لکھنؤ میں ہوئی۔ ضیاء کے والد سید کاظم حسین تنویر نے اسے فرزند کی تعلیم اپنے زیر نگرانی دلوائی اور وکالت کا امتحان کامیاب کیا۔ لکھنو کے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ چند عرصہ بعد آپ کا عقد حیدر آباد کے امیر الامرا نواب الدولہ انیس الملک کی دختر سے ہوا۔ اس کے باوجود ضیاء لکھنوی لکھنو ہی میں مقیم رہے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ اپنے خسر نواب الدولہ انیس الملک کے ایک کیس کے سلسلے میں حیدر آباد آئے تو پھر لکھنو نہیں گئے۔ آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ آپ اثنا عشری سے تعلق رکھتے تھے۔

جناب ضیاء لکھنوی کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ وہ اپنے کلام پر حبیب کنتوری سے اصلاح لیتے رہے۔ شروع میں ضیاء لکھنوی اپنے والد سید کاظم حسین تنویر کو کلام دکھا لیتے تھے۔ پھر جب حیدر آباد منتقل ہو گئے تو حبیب کنتوری سے رجوع ہو گئے۔ ضیاء لکھنوی کا کلام صاف، شیریں اور پر معنی ہے۔ آپ کے کلام میں مرثیہ، نوحہ، رباعی، قصیدہ ز، غزل وغیرہ ملتے ہیں۔ ایک قلمی دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے ایک رسالہ "میزان شائع کیا" جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔

جناب ضیاء کے دیوان سے چند شعر غزل کے درج کئے جاتے ہیں۔

جمع ہوں اشک جو گریاں کے ترے پل بھر کے
سارے عالم کو ڈبو دین وہیں جل تھل بھر کے

دل پر خون میں دکھادی تجھے ساقی آتو
بادہ ناب سے رکھ چھوڑی ہے بوتل بھر کے

مجھ کو وحشت نے بنایا ہے بڑا عالی ظرف
ایک چھالے میں مرے خار ہیں جنگل بھر کے

دیگر

میں فدا اس کے یہ اس کی ہے محبت میری
غیر کے گھر نہیں جاتی شب فرقت میری

بدگمانی سے یقین تھا جو نہ مرنے کا مرے
دیکھ لی اوس نے کفن کھول کے صورت میری

روٹھ کر وہ شب وصل اٹھے پہلو سے
پاؤں پر گر کے منانے لگی حسرت میری

☆☆

محمد عبداللہ خان ضیغم لکھنوی

آپ کا نام محمد عبداللہ خاں اور تخلص ضیغم تھا۔ ولادت ۱۲۵۸ھ/۱۸۶۱ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ بچپن میں اپنے والد کی سرپرستی میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ نوجوانی میں ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد آئے اور سررشتہ راجہ رایاں امانت ونت کی پیشی میں ملازم ہو گئے۔ (۸۸) روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ ایک کرایہ کا مکان کولسہ واڑی میں حاصل کیا اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ ضیغم کے دو فرزند تھے ایک غلام قمرالدین صفی اسد خان دوسرے غلام حسن نعیم اللہ خان۔ ضیغم کی وفات ۱۳۲۵ھ میں حیدرآباد میں ہوئی (۱)۔

ضیغم کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انھوں نے اپنے کلام پر حکیم نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی سے اصلاح لی۔ ضیغم ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کا کلام ہر صنف سخن میں موجود ہے جیسے غزل، مرثیہ، رباعی، قطعات، نعت اور حمد وغیرہ۔ انھوں نے اپنا ایک قلمی دیوان یادگار چھوڑا ہے جو کتب خانہ ادارہ ادبیات میں محفوظ ہے۔ جب ہم ضیغم کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے کلام کے مقابلہ میں ان کی گمنام زندگی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور یہ احساس شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ حیدرآباد آ کر ضیغم لکھنوی نام و نمود کی خواہش سے دور اردو ادب کی خاموش خدمت انجام دیتے رہے۔ جو بجائے خود ان کا اپنا انجام تھیں۔

ضیغم کلیات کے مطالعہ سے ایک اور پہلو سامنے آتا ہے کہ انھوں نے غزل میں میں اپنے بزرگوں کے کلام کا رنگ بھر دیا ہے۔ ان کے طرز سخن کی تقلید شاعری کا صحیح معیار سمجھی جاتی تھی۔ ان کی غزل کے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

پنہاں کرے منہ زیست کا کشتہ ترا ہو کر — حسرت ہے یہ اے دامن شمشیر کسی کی
کس ناز سے کہتے ہیں وہ آ کر شب وعدہ — اچھی تھی گھڑی لڑ گئی تقدیر کسی کی

دل تھام کے ہاتھوں سے جو تم ہو گئے مضطر　　یاد آ گئی کیا ضیغم دلگیر کسی کی (۲)

ضیغم نے شعرائے محبوبیہ کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا جو ''یادگار ضیغم'' کے نام سے ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوا۔ اس میں تقریباً ۲۵۰ شعرا کا مختصر کلام ملتا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، شعرائے نازک خیال، ۱۳۱۹ھ

(۲) عبداللہ خان ضیغم گلدستہ جشن آصفیہ حیدر آباد ۱۳۲۹ھ، صفحہ (۱۷)

ظفر علی خاں ظفر

نام ظفر علی خاں اور تخلص ظفر تھا۔ظفر کی ولادت ۱۸۷۰ء میں سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم وزیرآباد کے مشن اسکول میں ہوئی۔میٹرک کا امتحان پٹیالہ اسکول سے کامیاب کیا اور ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کامیاب کرنے کے بعد تلاش معاش میں تھے۔حیدرآباد میں محسن الملک کو ایک خانگی مددگار کی ضرورت تھی۔ظفر علی خاں نے درخواست دی اور سفارشی خط لے کر حیدرآباد آ گئے۔یہاں انھوں نے آصفجاہ سابع کی اتالیقی کے فرائض بھی انجام دئے۔ظفر علی خاں عہد محبوبیہ کے ایک قابل ترین ادیب وشاعر انشاپرواز محقق مانے جاتے ہیں۔ان کی جتنی خوبیاں بیان کی جائیں کم ہیں (۱) ظفر علی خاں کو حیدرآباد سے شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ہوا یہ کہ ایک یوروپین تھیٹر نے ایک ڈرامے کا شو حیدرآباد میں کیا جس میں نیم عریاں عورتوں کا رقص پیش کیا گیا تھا۔ریاست کی طرف سے ظفر علی خاں کو شکریہ ادا کرنا تھا انھوں نے شکریے میں شکریہ کے بجائے شروع سے آخر تک ڈرامہ کی مذمت کر دی۔ڈرامہ کے چیف گسٹ ریزیڈنٹ تھے۔انھیں سخت ناگوار گزرا۔ان کی ایما پر آصفجاہ سادس نے ظفر علی خاں کو شہر بدر کر دیا۔وظیفہ بھی ضبط ہو گیا۔الزام لگایا گیا کہ آصفجاہ سادس کو انگریزوں کے خلاف اکساتے ہیں (۲)۔

ظفر علی خاں حیدرآباد سے وزیرآباد چلے گئے اور اپنے اخبار زمیندار کو وہاں سے لاہور منتقل کر دیا۔اس رسالہ میں مسلمانان ہند کو آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے پر اکسایا جانے لگا۔انگریزی حکومت نے رسالہ زمیندار کو بند کروا دیا۔ظفر علی خاں کو نظر بند کر دیا گیا۔دو سال بعد رہائی عمل میں آئی۔انھوں نے نام بدل کر "ستارہ صبح" رسالہ جاری کیا۔اس رسالہ کو بھی انگریز حکومت نے بند کروا دیا۔پھر جیل ہوئی اور پھر رہا ہوئے۔یہ سلسلہ ۱۹۳۶ء تک

چلتا رہا۔ مجموعی طور پر ظفر علی خاں نے (۱۲) سال جیل کی چار دیواریں گزارے۔ بالآخر ۱۹۵۷ء تک زندہ رہ کر (۸۷) برس کی عمر میں وفات پائی۔

مولانا ظفر علی خاں ادیب بھی تھے، شاعر بھی اور صحافی بھی سیاست داں بھی، وہ مترجم بھی تھے اور اعلیٰ درجہ کے ایڈمنسٹریٹر بھی وہ اپنے کلام پر استادِ سخن داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ شروع میں مولانا نے لارڈ کرزن وائسرے ہند کی تصنیف کا ترجمہ "خیابان فارس" کے نام سے اردو میں کیا۔ اس سے انہیں سارے ہندوستان میں شہرت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد انہوں نے سیر ظلمات، "فسانہ نسواں" اور "سنہری گھونگا" کا ترجمہ بھی اردو میں کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کی موسیٰ ندی کی طغیانی سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم لکھی جو "دکن ریویو" میں شائع ہوئی۔ اس سے انہیں دکن میں بھی بڑی شہرت ملی۔ علامہ اقبال نے انہیں لکھا:

"ظفر علی خاں کے قلم میں مصطفیٰ کمال کی تلوار کا بانکپن ہے"

خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں کہ ظفر علی خاں قیامت کے دن اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔ شاعروں کے علاوہ انہوں نے بیسیوں نثری تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ شاعری میں ان کی تین تصانیف ہیں جن میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے پچاس سالہ دور کا نقشہ منظوم کیا ہے۔ یہ تصنیفات "بہارستان" اور "چمنستان" کے نام سے موسوم ہیں۔ مولانا کی موضوعاتی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

الٰہی برق غیرت کی تڑپ مجکو عطا کردے
مجھ آتش زیرپا کو ساتھ ہی آتش نوا کردے
بتاؤں گا کہ شاخ ہندیوں اکسیر بنتی ہے
مری پلکوں کو جاروب حریم مصطفےٰ کردے

جنگ آزادی کے موضوع پر بھی چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

کام جلسوں سے چلے گا نہ ریزولیشن سے — ہمنشین کاٹ ہے آہن کی فقط آہن سے
ہم نے آندھی کبھی چلتی نہیں دیکھی اب تک — خواہ کتنی ہی ہوا دی گئی ہو دامن سے
جارج پنجم کی دہائی ہے کہ ڈائر نہ رہے — آپ بے وجہ بگڑتے ہیں مرے شیون سے
آپ کو اپنی حکومت کی بقا ہے مطلوب — ہم ہیں وابستہ خلافت کے مگر دامن سے

اس کے علاوہ انھوں نے موضوعاتی شاعری میں کمال حاصل کرلیا تھا جیسے مدارج ارتقا صدر جمہوریہ امریکہ۔ گوکل کی بانسری کی گونج۔ گاندھی۔ سخنوران عہد سے خطاب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کی غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

مانا کہ اگر چھیڑ حسینوں سے چلی جائے
کٹ جائے گا اس مشغلہ میں عہد جوانی
گرمائے گا یہ ہم ہمہ افسردہ دلوں کو
بڑھ جائے گی دریائے طبیعت کی روانی
معشوق نئے، بزم نئی، رنگ نیا ہے
پیدا نئے خامے ہوئے ہیں اور نئے مانی

مولانا ظفر علی خاں کی حیدر آباد سے طویل وابستگی تھی۔ مولانا کا شمار برصغیر کے ان چند مشاہیر اردو شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے عہد محبوبیہ میں طویل عرصہ تک ملازمت کی۔ ڈاکٹر داؤد اشرف ''بیرونی مشاہیر ادب حیدر آباد'' میں رقمطراز ہیں:

''آصفجاہ سادس کے بعہد میں مولانا ظفر علی خان پہلی بار ۱۸۹۶ء میں ریاست حیدر آباد کی سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے تھے اور ۱۹۰۹ء میں ریاست بدر کئے گئے تھے۔ وہ اپنی ایک درخواست مورخہ ۲۰/۱۹۴۱ء میں لکھتے ہیں کہ مولانا نے عہد آصف سادس میں (۱۳) سال سرکاری ملازمت کی تھی۔ (۳)

مولانا ظفر علی خان ایک بے مثال مترجم بھی تھے۔ انہوں نے ''خیابان فارسی'' کے نام سے لارڈ کرزن کی کتاب Persian and the persian Quotation کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب دراصل دولت ایران کے آغاز زمانہ تاریخ سے لے کر آج تک کی سیاسی، جغرافی طبعی اور تمدنی سرگزشت ہے اور اسی بے نظیر کتاب سے ایران کے حالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ یہ کتاب مولانا ظفر علی خان نے عہد محبوبیہ میں لکھنا شروع کی تھی اور مکمل ترجمہ کیا تھا۔ اس کی اشاعت کے لئے آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں سے مالی امداد

منظور فرمائی تھی۔ یہ کتاب اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

☆☆

---

(۱) سلیمان اریب، حیدرآباد کے شاعر، جلد دوم، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء، صفحہ (۴۹)

(۲) سلیمان اریب، حیدرآباد کے شاعر، جلد دوم، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء، صفحہ (۵۰)

(۳) سید داؤد اشرف ڈاکٹر، بیرونی مشاہیرِ ادب اور حیدرآباد، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء، صفحہ (۵۱)

سید ظہیر الدین حسین ظہیرؔ دہلوی

نام سید ظہیر الدین حسین اور تخلص ظہیر تھا۔ ظہیر کی ولادت ۵؍جنوری ۱۸۳۵ء میں دہلی میں ہوئی۔ والد سید جلال الدین حیدر شاہ دہلوی بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے۔ جناب ظہیر کی بسم اللہ ساڑھے چار سال کی عمر میں ہوئی اور تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس زمانے کے مشہور استاد شیخ صفدر علی اتالیق مقرر کئے گئے۔ قرآن مجید سے شروعات ہوئی۔ اس کے بعد فارسی کی کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔ گلستاں بوستان بہار دانش اور یوسف زلیخا یہ سب کتابیں اس زمانے میں نصاب میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ ظہیر نے قصائد، عرفی وخاقانی اور وقائع نعمت خاں عالی کا مطالعہ بھی کیا۔ یہ تمام تعلیمی مرحلہ ظہیر کے سن شعور یعنی بارہ سال کی عمر تک مکمل ہو گیا۔ ظہیر خوشنویسی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ظہیر کے دادا خط نسخ میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ ظہیر کے والد بھی اس فن میں ماہر تھے۔ ظہیر کے دادا کے انتقال کے بعد ظہیر کے والد سید جلال الدین حیدر شاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کے فن خطاطی کے استاد مقرر ہو گئے۔ اسی بہانے ظہیر بھی لال قلعہ میں جایا کرتے تھے۔ جب ظہیر آٹھ سال کے ہوئے تبھی ان کے والد نے خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کا شاگرد کروایا (۱) بہادر شاہ ظفر نہایت توجہ سے اصلاح دیتے تھے۔ ظہیر کو یہ فن ورثہ میں ملا تھا۔

ظہیر سید جلال الدین حیدر کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ ان کے ایک اور بھائی مرزا انور کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی تین بہنیں تھیں۔ ابھی ظہیر کی عمر نو سال کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ظہیر کے والد نے دوسری شادی نہیں کی۔ والد اور والدہ کا پیار انہوں نے خود دیا۔ اسی لئے ظہیر کے تمام شوق پورے ہوئے۔ باپ کا لاڈ پیار ان پر کچھ زیادہ ہی تھا۔ گھوڑ سواری کا شوق پیدا ہوا تو ایک استاد چابک سوار کا شاگرد کرا دیا جس نے ظہیر کو

شہسواری کی تربیت دی۔ غرض ظہیر کا بچپن انتہائی عیش و عشرت میں گزرا۔ ظہیر جب (۱۳) برس کے ہوئے انہیں لال قلعہ میں ملازمت مل گئی۔ داروغہ ماہی مراتب کی خدمت ان کے ذمے کی گئی (۲) بائیس سال کی عمر تک یہ ملازمت چلتی رہی۔ پھر ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہوا۔ خود بادشاہ اوران کے ملازمین کو لال قلعہ سے باہر نکل جانا پڑا۔ جناب ظہیر نے اس طرح ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۷ء تک تقریباً (۹) برس کا عرصہ قلعہ میں گزارا۔ اس عرصہ میں راقم الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ اسی سال (۲۲) سال کی عمر میں ۱۸۵۷ء میں ان کی شادی ہوگئی۔

غدر کے بعد ظہیر بھی در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے رہے۔ ایک شعر حسب حال ملاحظہ ہو۔

کہیں آرام سے دو دن فلک رہنے نہیں دیتا
ہمیشہ اک نہ اک سر پر مصیبت آہی جاتی ہے (۳)

دہلی کی بربادی کے بعد انہوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ پانی پت میں پانچ ماہ قیام کیا۔ پھر وہاں سے رام پور گئے وہاں چار سال تک رہے۔ یہاں بھی ظہیر کو اطمینان قلبی حاصل نہیں ہوا۔ آخر پھر دہلی لوٹ آئے۔ اس وقت تک دہلی میں سکون ہو گیا تھا۔ دہلی میں چند روز گھوڑوں کی تجارت شروع کی اور اپنے بھائی انور کو بھی ساتھ لے لیا لیکن یہ کاروبار انہیں پسند نہیں آیا۔ ایسے وقت جے پور کے راجہ رام سنگھ جو نہایت ادب دوست واقع ہوئے تھے انہوں نے ظہیر کو دہلی سے طلب کر لیا اور اپنے یہاں پولیس میں ملازمت دلوائی۔ ظہیر اپنی فراست و محنت سے والی ریاست جے پور کی توجہ کا مرکز بن گئے اور ان کے عہدہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ (۱۴) برس تک مہاراجہ رام سنگھ کی نوکری میں رہے۔ پھر وظیفہ پر علیحدہ ہو کر اپنے فرزند سجاد مرزا کو تھانیداری دلوا دی (۴)

رام سنگھ کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ ظہیر جے پور سے بھوپال روانہ ہو گئے۔ وہاں سے ظہیر ٹونک گئے۔ ٹونک آنے سے پہلے وہاں ظہیر کی شاعری کی خوب شہرت ہو چکی تھی۔ یہاں ان کی گزر بسر اچھی طرح ہونے لگی۔ ان کی لڑکی کی شادی بھی ہوگئی۔

جناب ظہیر حیدر آباد میں "عہد محبوبیہ" میں وارد ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ تھا۔ داستان غدر میں ظہیر دہلوی حیدر آباد میں آنے کا سنہ ۱۹۱۰ء بتاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ تقریباً

(۸) ماہ زندہ رہے۔ دربار آصف جاہ سادس میں باریابی نہیں ہوئی۔ اسی غم میں ۷ اربیع الاول ۱۳۲۹ھ مارچ ۱۹۱۱ء کو وفات پائی اور دائرہ میر مومن میں مدفون ہوئے۔

جناب ظہیر کو شاعری کا شوق آٹھ سال کی عمر سے ہوا۔ لال قلعہ میں آنا جانا تھا۔ (۱۳) سال کی عمر میں لال قلعہ میں ملازمت مل گئی۔ اسی مناسبت سے حضرت ذوق کے شاگرد رشید ہوگئے۔ جناب ظہیر اور حضرت داغ کم و بیش ہم عمر اور ایک ہی استاد سخن کے شاگرد تھے۔ دونوں کے کلام میں معاملات نمایاں ہے۔ ظہیر کے کلام میں مومن کا رنگ اور زبان صاف نظر آتی ہے۔ ظہیر کا شعری سرمایہ تین مطبوعہ دیوان ہیں۔ پہلا دیوان ''گلستان سخن'' کے نام سے شائع کیا جس میں غزلیات قصائد اور رباعیات ہیں۔ دوسرے دیوان ''شبستان عبرت'' اور تیسرے ''دفتر خیال'' بھی غزلیات کے مجموعے ہیں۔

ظہیر بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلوں ہی پر مشتمل ہے۔ ان کی شہرت کا سبب ان کی غزلگوئی ہی ہے۔ نمونے کے طور پر غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی (۴)

ظہیر کے شاگرد ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ غربت افلاس اور بیروزگاری میں گزرا لیکن ان کی شاعری کی شہرت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ ظہیر نے خود اپنے شاگردوں کے درجے متعین کئے تھے اول درجے میں نادر علی برتر، ثاقب بدایونی، صاحبزادہ محمد سعید خاں عاشق، ٹونکی قابل ذکر ہیں۔ دوسرے درجے میں منشی رمضان علی خاں، اختر اجمیری، دبیر میاں انیس، سلطان احمد کلکتہ، اثیم ڈھاکہ، اسد علی دہلوی، سید حسن سید اور محمود خاں محمود حیدرآبادی کو شمار کیا ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً پچاس ایسے شاگرد ہیں جن کے نام نہیں گنائے ہیں، تیسرے درجہ میں رکھا ہے (۵)

ظہیر داغ کے ہمعصر تھے۔ داغ سے کم ان کی شہرت نہ تھی۔ داغ عیش پسند اور

خوش باش تھے، ظہیر سنجیدہ اور متین، دونوں ہم عمر تھے اور استاد ذوق کے آگے دونوں نے زانوئے ادب تہہ کیا۔

ظہیر کی شاعری کے ابتدائی دور میں ذوق کی زباندانی، غالب کی جدت اور مومن کے رنگ سخن کی دھوم تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ مومن کے کلام کو اس عہد میں عوام وخواص کی مقبولیت حاصل تھی۔ حتی کہ غالب وذوق کے شاگردوں میں بھی مومن کو گونج سنائی دیتی ہے۔

ظہیر دبستان دہلی کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں سوز وگداز، درد واثر اور حسن و عشق کی کیفیتوں کی فراوانی ہے۔ ظہیر کی شاعری میں اپنے دور کے انتشار کی داستان بھی ہے۔ ظہیر بڑی آس لے کر حیدرآباد آئے تھے مگر آصفجاہ سادس کے دربار میں ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اے بے حجاب یار فراموش نقش پا — کیا کہہ رہے ہیں یہ لب خاموش نقش پا
میری نمود و بو ہے تصویر نقش پا — نقش فنا ہوں صورت تحریر نقش پا

ظہیر کے کلام میں تصوف کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کی داستان اپنے ایک شعر میں یوں بیان کی ہے۔

دیدہ حق ہیں چراغ راہ عرفاں ہوگئے — بت پرستی کرتے کرتے ہم مسلماں ہوگئے
اے ظہیر اب کچھ نہیں خواہش مگر اللہ سے — چشم بینا مانگنا یا کنج حیرت مانگنا

ظہیر نے بعض قصیدوں میں داستان عذر کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے حمد، نعت، منقبت اور دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اپنے نوجوان فرزند سجاد مرزا کی موت پر اپنے غم کا اظہار یوں کیا ہے۔

عیش دنیا اب نظر میں خاک ہے — عیش دنیا کا مزہ جاتا رہا
دل اگر باقی رہا کس کام کا — چین دل کا اے خدا جاتا رہا

جناب ظہیر نے آصفجاہ سادس کی سالگرہ کے موقع پر (۱۹۲) اشعار کا ایک قصیدہ بطور تہنیت موزوں کیا تھا جس میں قصیدے کے تمام لوازمات کو نہایت فنکارانہ انداز میں برتا ہے زبان وبیان کے اعتبار سے رواں دواں اور فنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اس قصیدہ کی تشبب کے عاشقانہ اشعار یہ ہیں۔

یار عاشق کش و بے باک حسین و طرار
مست مغرور و جفا پیشہ و شوخ و بیتاب
داد سے پاس مروت نہ طبیعت میں لگاؤ
نہ ملائے وہ نگاہیں نہ وہ دے منہ سے جواب
نہ عنایت، نہ مروت نہ محبت نہ وفا
نہ اشارہ نہ تبسم و تکلم نہ خطاب
ناز و انداز سے ہو جلوہ نما وہ عیار
شوق دیدار میں ہیں اہل نظارہ بیتاب(۶)

جناب ظہیر اور استاد داغ حیدرآباد میں ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ ''بزم داغ'' میں رفیق مارہروی داغ کے الفاظ میں رقمطراز ہیں:

''مجھے اپنے ساتھیوں میں جس قدر عزت ظہیر کی مدنظر ہے کسی کی نہیں مگر افسوس زمانہ ایسے جوہر قابل کا قدرداں نہیں (۷)

ظہیر نے اپنے دواوین کی ابتدا ''حمد'' سے کی ہے اور اس کے بعد نعتیہ کلام درج کیا ہے ''گلستان سخن'' میں حمد کے بعد مسلسل نعتیہ کلام ردیف الف میں ہے اور ردیف ب کے تحت (۱۳) اشعار پر مشتمل ایک نعت ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

کیا کام کیا حسن ملیح عربی نے
لوٹائے دو عالم کو اسی دل طلبی نے

اکثر موقع پر غزل کے پیرایہ ہی کو نعت نگاری کے لئے منتخب کیا ہے۔ اور عاشقانہ انداز پیدا کیا ہے۔

تھا حضرت یوسف کو زلیخا سے تعشق
غوغا ہے ملائک میں تری دل طلبی کا

شاعری کے علاوہ ظہیر کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی نثر نگاری ہے۔ وہ اپنے معاصرین میں اس حیثیت سے ممتاز مقام کے مالک ہیں کہ انہوں نے خودنوشت سوانح حیات کے ذریعہ سادہ پرکار اسلوب کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ ظہیر کی نثری تصانیف

میں ''قصہ ممتاز'' ہے جو دراصل فارسی داستان کا اردو ترجمہ ہے۔ تخلیقی عنصر کو داخل کرنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔

ظہیر کے طرزِ تحریر کا نمونہ ان کی تقریظیں بھی ہیں لیکن ''داستان غدر''، باطراز ظہیری سے ان کی نظر نگاری کی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں ''داستان غدر'' کا شمار اردو ادب کی اولین خود نوشت سوانح حیات میں ہوتا ہے۔ اسی کتاب میں کہیں ظہیر کی جسامت کی خوبصورت لمحے جھلملاتے نظر آتے ہیں تو کہیں دلی کے گلی کوچے اور لال قلعہ کے در و بام کو جگمگاتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ ظہیر ۱۸۵۷ء کے واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔

الغرض یہ کہ انیسویں صدی کے اواخر میں اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے ان میں ظہیر دہلوی کا نام منفرد شاعر اور باکمال نثر نگار کی حیثیت سے اپنی علیحدہ شناخت رکھتا ہے۔

☆☆

---

(۱) نواب صدیق حسن خاں، تذکرہ بزم سخن، ۱۲۹۷ھ، مترجم عطا کاکوری، صفحہ (۲۸)

(۲) سید ظہیر الدین حسین، داستان غدر، طبع دوم، صفحہ (۲۰)

(۳)(۴) مختار شمیم، ظہیر دہلوی، حیات اور فن، دہلی۔ ۱۹۹۰ء صفحہ (۳۳) صفحہ (۴۶)

مہاراجہ رام سنگھ کے انتقال کے بعد جے پور ریاستی باگ ڈور مادھو (۴) مختار شمیم، ظہیر دہلوی، حیات وفن لکھنو ۱۹۹۰ء، صفحہ (۱۷۲)

(۵) ظہیر دہلوی، داستان غدر، صفحہ (۳۱۲)

(۶) مختار شمیم، ظہیر دہلوی، حیات لکھنو، ۱۹۹۰ء، صفحہ (۲۲۶)

(۷) رفیق مارہروی۔ بزم داغ۔ ۱۹۵۴ء، صفحہ (۹۵)

میر عابد علی خاں عابدؔ

نام میر عابد علی خاں اور تخلص عابد تھا۔ عابد کی ولادت ۱۲۶۰ھ میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھریلو ماحول میں ہوئی۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد "عہد محبوبیہ" میں صولت جنگ بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ محکمۂ مال میں ملازمت کی اور وہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔ حیدر آباد کے امراء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ خاندانی رئیس تھے۔ طبیعت میں انکساری اور شرافت خاندانی نمایاں تھی۔ ۵ر رمضان ۱۳۳۷ھ کو وفات پائی (۱)

جناب عابد کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا۔ داغ دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ اپنی زندگی میں کئی کتابیں شائع کیں۔

(۱) مذاق عابد، (۲) یادگار عابد (۳) نغمۂ روح نامہ عشق (۴) کلیات عابد (۵) چمنستان وحدت (۶) آئینہ ارشاد وغیرہ۔ قابل ذکر ہیں۔

عابد نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جیسے غزل، مرثیہ، رباعی، قطعات، نوحہ، قصیدہ اور ہجو وغیرہ۔

نمونہ کے طور پر چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

تجکو کوثر ہو مبارک ناصح
مجھ کو ہے شربت انگور پسند

شیفتہ ہیں جو تمہارے رخ کے
کیونکر آئے گی انہیں حور پسند

تیر پر تیر چلاؤ، تمہیں ڈر کس کا ہے
دل یہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

جناب عابد حضرت فیض کے مشاعرے میں جو عرس کے موقع پر ہوتا تھا پابندی سے شریک ہوتے تھے۔اس مشاعرہ میں پڑھی جانے والی غزلیات ''گلدستہ فیض'' میں شائع ہوتی تھیں۔ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

غرض ہے کس کو فردوس بریں سے
امیدیں خواہشیں سب ہیں تمہیں سے

پسا جاتا ہے در پردہ مرا دل
لڑی ہے آنکھ اک پردہ نشیں سے

کھڑے ہیں بام پر وہ بے تکلف
میں ان کو دیکھتا ہوں دور بیں سے

ترے انکار میں ہے طرز اقرار
نہیں ہے مجھ کو اندیشہ نہیں سے

بنایا خوبصورت زشت خو کو
گلا مجھ کو ہے صورت آفریں سے

حرم خالی ہے بالکل، دیر ویراں
نکالو ڈھونڈ کر اس کو کہیں سے

بنا عابد سے عاشق اللہ اللہ
رہا اب کام کیا دنیا و دیں سے

☆☆

(۱) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ (۲۸۳)

(۲) رسالہ گلدستہ فیض۔مرتبہ مشرف جنگ فیاض، حیدرآباد، ۱۳۲۴ھ، صفحہ (۴۲،۴۳)

محمد امداد حسین عازمؔ

نام محمد امداد حسین اور تخلص عازم تھا۔ عازم کی ولادت ۱۲۸۱ھ م ۱۸۶۵ء اورنگ آباد میں ہوئی۔ جد اعلیٰ محمد اکبر حسین شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمرکاب تھے۔ جب اورنگ زیب اورنگ آباد تشریف لائے اس وقت عازم کے جد اعلیٰ دہلی سے اورنگ آباد منتقل ہوگئے پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ جناب عازم کے والد محمد شریف الحسن، سلطنت آصفیہ میں فوج کے ملازم تھے۔ جناب عازم کی پرورش والد بزرگوار ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ جناب عازم کے والد عہد محبوبیہ میں جب حیدرآباد منتقل ہوگئے۔ اس وقت عازم کی بھی سکونت مستقل طور پر حیدرآباد میں ہوگئی۔

جناب عازم کو ان کے والد نے بچپن ہی سے اچھی تعلیم دلوائی اور قابل سپوت بنا کر حیدرآباد منتقل کیا تھا۔ یہاں عازم نے محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کی اور اسی محکمہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ والد کی وجاہت کی وجہ سے عازم کا بھی امرا میں شمار ہونے لگا۔ چنانچہ امرا کے بچوں کی طرح اپنے لڑکے امداد حسین کو مدرسہ اعزہ میں تعلیم دلوائی۔ اس زمانے میں صرف امراء کے بچوں ہی کو مدرسہ اعزہ میں تعلیم حاصل کرنے کا حق تھا۔ عازم نے (۶۰) سال کی عمر میں ۱۳۳۹ھ میں وفات پائی (۱)

عازم کو شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد باضابطہ شاعری شروع کی۔ وہ اپنا کلام مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی کو بغرض اصلاح دکھاتے تھے عازم نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام نہایت معیاری ہوتا ہے۔ زبان کی بندش، جملوں کا استعمال اور اشعار کی ترتیب کوئی ان سے سیکھے۔ ان کے کلام کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ جس میں تمام اصناف ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور

پر چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ناصح تو ہم سے باعث خودرفتگی نہ پوچھ
کیا جانے دیکھ آئے ہیں اس انجمن میں کیا

اللہ بخشے پوچھ نہ عازم کی لاغری
احباب کہہ رہے ہیں دھرا ہے کفن میں کیا

غش آگیا کبھی، کبھی سنبھلا کبھی گرا
حالات کچھ عجیب ترے خستہ جان کے ہیں

سر پر کفن ہے، ہاتھ میں محضر ہے خون کا
عازم کہو تو آج ارادے کدھر کے ہیں

☆☆

(۱) غلام صمدانی گوہر، تزکِ محبوبیہ، جلد دوم، شعرائے نازکخیال، صفحہ (۱۱۵)

سید شاہ عبدالوہاب حسینی عاصم

نام سید شاہ عبدالوہاب اور تخلص عاصم تھا۔ ولادت یکم ذلحجہ ۱۲۹۳ھ میں نلگنڈہ میں ہوئی۔ آپ سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جداعلیٰ شاہ میراں حسن قدس سرہ اپنے وطن خاص بغداد سے ہندوستان آئے۔ رشد وہدایت کی تعلیم دیتے ہوئے عمر گزاری۔ بعہد آصف جاہ اول ۱۷۲۴ء میں حیدرآباد وارد ہوئے۔ سرکار آصف جاہ اول کی طرف سے آپ کو انعام واکرام اور منصب جاری ہوا۔ کچھ اراضی بھی آپ کو نذر کی گئی۔ جناب عاصم کی ولادت نلگنڈہ اپنے آبائی ضلع میں ہوئی۔ کمسنی ہی میں آپ کے والد کا وصال ہوگیا۔ آپ کے بہنوئی سید احمد حسین نے آپ کی پرورش کی۔ عاصم ۱۳۶۸ میں انتقال فرماگئے۔ آپ کے شاگرد خواجہ عبدالعلی صدیقی نے تاریخی قطعہ تاریخ وفات کہا۔ ملاحظہ ہو۔

عبدالوہاب بود نامِ عاصم نعت خیر البشر کلامِ عاصم
نسبت جو قادری قیادت نسبی ملک خلدایں مقام عاصم
۱۳۶۸ھ

شاعری کا شوق عاصم کو کمسنی سے تھا۔انہوں نے سب سے پہلے اپنا کلام ۱۳۰۵ھ میں ڈاکٹر احمد حسین مائل کو بغرض اصلاح دکھایا۔ایک سال بعد فارغ الاصلاح ہوگئے۔اور دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔آپ کے شاگردوں میں عبدالرحمٰن افسوس، شمس الدین عازم، ضیاءالدین نرخی، خواجہ عبدالعلی صدیقی، غلام حسین رفیق، محمد اسحاق ارمان، سید شاہ محی الدین جید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ادارۂ ادبیات اردو میں آپ کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔آپ کے شاگرد عبدالعلی صدیقی نے ''انوار عاصم'' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا۔چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

پہلا یہ غضب دیدۂ مشتاق سے دور
پھر اس پہ ستم رکھا ہے اشفاق سے دور
خود آئے نہ بلوایا، نہ قاصد بھیجا
ہے یہ تو حضور آپ کے اخلاق سے دور

جناب عاصم کو اپنے پیرومرشد سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کی مدح میں بھی رباعیاں کہی ہیں۔

بے شر ہیں وہ بشر غلام احمد
ذی بخشش دھر ہیں غلام احمد
حامی و کریم ہیں میرے دوجگ میں
احمد ہیں ادھر، ادھر غلام احمد

اللہ کا ارشاد کہ غفار ہوں میں
حضرت کہیں بخشوانے کو تیار ہوں میں
سن کے کہا دل نے کہ اب بھی عاصم
مجھ سے جو گنہ ہو تو گنہگار ہوں میں(۲)

☆☆

(۱) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۱۷۸)
(۲) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۱۸۰)

صاحبزادہ عالمگیر محمد خاں عالمؔ

آپ کا نام عالمگیر محمد خاں اور تخلص عالم تھا۔ خاندان کا سلسلہ نسب نواب صاحب آف جاورہ سے ملتا ہے۔ اس لئے اپنے نام سے پہلے صاحبزادہ لکھا کرتے تھے۔ عالم کی پیدائش ۱۳۸۵ھ میں جاورہ میں ہوئی۔ والد نیاز محمد خاں ریاست جاورہ میں فوج کے کپتان تھے، جاورہ، ریاست مالوہ کا مشہور شہر ہے۔ جناب عالم کی تعلیم شہر جاورہ میں ہوئی۔ نو جوانی کی عمر میں تلاشِ معاش کے لئے حیدرآباد منتقل ہوئے ''عہد محبوبیہ'' میں محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کی اور وہیں سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ آپ کی وفات ۱۳۲۰ھ میں ہوئی (۱)

جناب عالم کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں مہارت رکھنے کے سبب بہت جلد ایک قادرالکلام شاعر بن گئے۔ اپنے کلام پر جناب حبیب کنتوری سے اصلاح لیتے تھے۔ عالم نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں قصیدہ، غزل، رباعی، قطعات، مرثیہ اور حمد و نعت ملتے ہیں۔

جناب عالم ایک پرگو شاعر اور محقق تھے انہوں نے اپنی زندگی میں ایک دیوان مرتب کیا۔ جو ''مذاقِ عشق'' کے نام سے شائع ہوا تھا مگر اب دستیاب نہیں ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے شعراء میں بہت بلند مقام حاصل کیا تھا۔ جناب عالم نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ شاہی ٹھاٹ باٹ کا زمانہ تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں یہ اثر نمایاں ملتا ہے۔

نمونہ کے طور پر غزل کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:

ڈوب کر دل مرا کہاں نکلا
ابھی یاں تھا ابھی وہاں نکلا

انگلیاں دور سے اٹھنے لگیں وہ آتے ہیں
میں جو عالم طرف کوچہ دلبر نکلا

صاحبزادہ عالم کے کلام میں شوکت الفاظ اور دروبست کا بڑا اہتمام ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے اشعار کا مطلب صاف صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔

اس بیان کی تائید میں چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

دیکھئے جان ابھی دیدوں گا
اٹھ کے پہلو سے اگر جایئے گا

قتل میں میرے اگر کی جلدی
ملئے گا ہاتھوں کو پچھتایئے گا

جناب عالم کے کلام میں شوخی و معاملت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جو عضو تجکو دیا بس وہ بے مثال دیا
خدا نے نور کے سانچے میں جسم ڈھال دیا

خدا نے یار کو کیا حسن، کیا جمال دیا
وہاں غنچہ دیا، دیدۂ غزال دیا

علیؑ کا نام لیا وقت بد میں جب عالم
خدا کے ہاتھ نے کوہِ بلا کو ٹال دیا

☆☆

صمدانی گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، طبقہ شعراء حیدر آباد، ۱۳۱۹ھ

حکیم محمد وحید الدین عالی حیدر آبادی

نام محمد وحید الدین اور تخلص عالی تھا۔ عالی کی ولادت ۱۲۸۸ھ میں مغلپورہ حیدر آباد میں ہوئی۔ کمسنی میں اپنے والد محمد کلاں صاحب کے سایے سے محروم ہو گئے۔ عالی نے ابتدائی تعلیم جامعہ نظامیہ شبلی گنج سے حاصل کی۔ نوجوانی میں طب کی سند حاصل کی اور محکمہ طبابت میں ملازم ہو گئے۔ عالی حکمت میں کامل قدرت رکھتے تھے اس کے علاوہ آپ عربی کے جید عالم تھے۔ ادبی حلقوں میں آپ کی کافی شہرت تھی۔ آپ کے ہم عمروں میں آغا شوستری اور عبدالحق قابل ذکر ہیں جن کی صحبت انھیں حاصل رہی۔ (۵۶) سال کی عمر میں ۱۹ر شعبان ۱۳۴۴ھ میں وفات پائی۔ (۱)

شاعری کا شوق جناب عالی کو نوجوانی سے تھا۔ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی میں طبع آزمائی کی۔ عالی استاد جلیل سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ آپ کے فرزند حکیم محمد نظام الدین نے ایک مختصر رسالہ بنام ''عقد المعانی'' شائع کیا تھا۔ عالی نے ایک عربی قصیدے کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ جناب تمکین کاظمی نے رسالہ نقوش میں عالی کا مقام متعین کیا ہے۔

> ''استاد الملک آغا شوستری ایک بڑے عالم اور محبوب علی خاں آصف کے استاد تھے اور واقعہ یہ ہے کہ عربی و فارسی میں اپنی آپ نظیر تھے مگر حکیم وحید الدین عالی کے سامنے ان کا چراغ ہی نہ جلتا تھا۔ آغا شوستری نے عراق میں عربی کی تکمیل اہل زبان اساتذہ سے کی تھی بخلاف اس کے عالی نے نہ تو اہل زبان اساتذہ سے کی تھی بخلاف اس کے عالی نے نہ تو اہل زبان عرب سے تحصیل کی تھی اور نہ عراق و

عرب کی صورت دیکھی تھی مگر طبعی مناسبت ذاتی کوشش اور فطری لگاؤ کی وجہ سے عربی ادب اور عربی شاعری پر اتنے حاوی تھے کہ طوبی شوستری تک ان کے معترف تھے"(۲)

نمونے کے طور پر عالی کے کلام سے چند رباعیاں یہاں درج کی جاتی ہیں:

اسلام میں اتفاق اب ہے ہی نہیں
جس شے پہ مدار کل ہے وہ شے ہی نہیں
کیا فائدہ سب دین کے ہیں رکن اگر
جام و خم و مینا ہے، مگر مے ہی نہیں

جیتے ہیں ہم اپنی جان کھونے کے لئے
ہر تیغ بلا سے قتل ہونے کے لئے
اس گلشن عالم کا مزہ کیا ہم کو
شبنم کی طرح آئے ہیں رونے کے لئے

جوں جوں ہونے لگی خدا سے قربت
ووں ووں مٹتی چلی سیاہی اپنی
پیری آئی، گئی تباہی اپنی
حامی ہوئی رحمتِ الٰہی اپنی

☆☆

(۱) صاحب حیدر آبادی۔ جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔ ص ۱۹۲
(۲) تمکین کاظمی۔ حکیم وحید الدین عالی رسالہ نقوش لاہور جلد سوم ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۶۷ء

راجہ نرسنگ راج عالیؔ

نام نرسنگ راج اور تخلص عالی تھا۔ ولادت ۲۵ نومبر ۱۸۹۴ء کو حیدرآباد میں ہوئی آپ کے والد راجہ گردھاری پرشاد بنسی راجہ کے پانچوں فرزند ہیں۔ صغیر سنی میں والد کی وفات کی وجہ سے آپ کی زندگی میں خلا پیدا ہوا۔ عالی تین برس کے تھے کہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کے بڑے بھائی راجہ شیام راج نے آپ کا علاج کروایا اور موت و زیست کی کشمکش کے بعد عالی صحت یاب ہو گئے۔ انہیں دنوں عالی کے افراد خاندان نے حیدرآباد چھوڑ کر بنارس میں سکونت اختیار کر لی۔ عالی کی پرورش بنارس ہی میں ہوئی اور وہیں جوان ہوئے۔ بنارس ہی میں آپ کی شادی ہوئی آپ کے خسر رائے کنہیالال بھوپال کے رہنے والے تھے۔ عالی کے والد نواب آصف جاہ سادس کے امرا میں تھے۔ جب آصفجاہ کو اس بات کا علم ہوا کہ راجہ گردھاری پرشاد چل بسے تو انہوں نے نرسنگ راج عالی کو حیدرآباد طلب فرمایا اور ان کو راجہ بہادر کا خطاب عطا کیا۔ عالی کی شادی بہت کم عمری میں کی گئی تھی۔ اور ان کی شریک حیات زیادہ دن عالی کے ساتھ نہ رہ سکیں۔ ۱۳۳۲ھ میں فوت ہو گئیں۔ عالی کو اس کا سخت ملال ہوا۔ (۱)

اس زمانے میں انہوں نے دو کتابیں تالیف کیں (۱) درد باقی (۲) ''درد ساقی'' جن میں ان کے والد راجہ گردھاری پرشاد باقی کی رباعیات اور تراجم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک مختصر تصنیف ''غم احباب شادؔ'' کے نام سے لکھی جو صرف (۲۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کشن پرشاد شاد کی مدح میں رباعیات اور قصیدے ہیں (۲)

بیوی کے فوت ہو جانے کے بعد عالی نے دوسری شادی نہیں کی۔ ۱۳۲۶ف میں دفتر محکمہ فوج میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے مددگار محلات پر فائز ہو گئے اور

وہیں سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔

شاعری کا شوق عالی کو بچپن ہی سے تھا۔ کیونکہ عالی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ محبوبیہ دور تھا۔ ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے عام تھے۔ بڑے بڑے امرا اور راجاؤں کے پاس مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ شعرا کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ عالی ایسے ماحول سے بچ نہیں سکے۔ عالی کے کلام میں ہم کو زیادہ تر غزلیں اور رباعیات ملتی ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ہر مشاعرہ میں عالی مہمان خصوصی کے طور پر شریک رہتے تھے۔ ان کے بغیر مشاعرہ شروع نہیں کیا جاتا تھا۔ شاعری میں عالی نے حضرت جلیل سے تلمذ حاصل کیا۔ ذیل میں نمونے کے طور پر غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔

نہیں بھاتی ہیں دور کی باتیں
سنو موسیٰ سے طور کی باتیں
زاہد خشک، کچھ سناپی کر
ہم سنیں گے سرور کی باتیں
سنتے سب کچھ ہیں واعظوں سے مگر
کون جانے قبور کی باتیں
رند مدہوش ہیں مگر کیسی
کر رہے ہیں شعور کی باتیں
بت خدا بن گئے معاذ اللہ
نہیں اچھی غرور کی باتیں

جناب عالی نے اپنے مربی مہاراجہ شاد کی مدح میں "غم احباب شاد" کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی۔ اس میں سے ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

سچ ہے کہ جہاں میں شادمانی کب تک
سچ ہے کہ جہاں میں زندگانی کب تک

سونی محفل ہے عالی اک شاد بغیر
بے صاحبِ خانہ مہمانی کب تک

☆☆

(۱) ڈاکٹر زور، مرقع سخن، جلد دوم، حیدرآباد ۱۹۳۷ء۔ صفحہ (۲۱۹)

(۲) نرسنگ راج عالی، غم احباب شاد، حیدرآباد، ۱۳۵۰ھ۔ صفحہ (۱)

(۳) نرسنگ راج عالی، یادگار حضرت شاد، حیدرآباد ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ (۳۳)

نواب میر عثمان علی خاں عثمان آصف جاہ سابع

والی ریاست حیدر آباد آخری تاجدار دکن نواب میر عثمان علی خاں نام تخلص عثمانؔ تھا آپ کی ولادت ۲۹/جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ مطابق ۵/اپریل ۱۸۸۶ء بروز سہ شنبہ رات کے ۹ بجے زہرہ بی کے بطن سے ہوئی۔ آپ کی تعلیم وتربیت شاہی محلات میں ہوئی۔ نواب میر محبوب علی خان آصفِ جاہ سادس نے آپ کی تعلیم وتربیت میں کوئی کمی نہیں فرمائی۔ آپ کے ایک اور بڑے بھائی ولی عہد ریاست حیدر آباد میر فاروق علی خان تھے۔ جو کمسنی میں انتقال کر گئے اور ولی عہد ریاست حیدر آباد میر عثمان ہی ہوگئے۔ آپ کی تعلیم کے لئے مولوی انوار اللہ خان وعلامہ سید علی شوستری نواب عماد الملک اور مولوی سید حسین بلگرامی وغیرہ مقرر ہوئے۔ عثمان نہایت ذہین اور ہونہار واقع ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں تعلیمی مراحل آسانی سے اور خوشی کے ساتھ طے کیے۔ شاہ آصف جاہ سادس نے اپنے ہونہار ولی عہد کو حنفی عقیدہ کی تعلیم مولوی انوار اللہ خان صاحب کے ذریعہ دلوائی۔ تاہم حضرت عثمان اہل بیت عقیدے کے اثر سے متاثر رہے۔ انگریزی تعلیم کے لئے مسٹر بی ایجرٹن کو مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت عثمان چودہ سال کی عمر میں فارسی، انگریزی زبان کے اچھے اسکالر ہوگئے۔ آپ روانی سے انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ عربی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ فارسی نظم اور نثر پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ فنون لطیفہ سے فطری لگاؤ تھا۔ مصوری میں آپ ماہر تھے۔ فوجی تعلیم نواب افسر الملک سابق کمانڈران چیف حکومت آصفیہ کی نگرانی میں حاصل کی۔ ولی عہدی کے زمانے ہی میں آپ نے آصف سابع نے یکم صفر ۱۳۱۸ھ کو اپنا قیام کنگ کوٹھی میں منتقل کرلیا۔ (۲) اب تک اپنے والد اور دادا کی طرح پرانی حویلی میں قیام پذیر تھے۔ نواب آصف جاہ سادس ۴/رمضان ۱۳۲۹ھ م ۱۰/اگست ۱۹۱۱ء کو انتقال کر گئے اور آصف جاہ سابع

نے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ آپ کی مسند نشینی کا دربار والد کی زیارت کے دوسرے دن ۷ر رمضان ۱۳۲۹ھ م ۱۴ر اگست ۱۹۱۱ء بروز جمعہ دن کے چار بجے کنگ کوٹھی میں ہوا۔

عہد عثمانی میں جو ترقیاں ہوئیں ان کی تفصیلات میں جانے کے لئے ایک مکمل دفتر کی ضرورت ہے۔ اس لئے اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جولائی ۱۹۱۲ء کو مہاراجہ کشن پرشاد مدارالمہامی سے سبکدوش ہوئے۔ آپ کی جگہ میر یوسف علی خان سالار جنگ سوم مدارالمہام مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ جامعہ عثمانیہ دنیا بھر کی مشہور جامعات میں سے ایک ہے۔

۱۹۲۱ء میں فرمان شاہی کے ذریعہ اصلاحات کا قانون مدون ہوا۔ اور دیہی ترقیات کی ابتدا کی گئی۔ طبقات وارضیات کا محکمہ قائم ہوا اور اس کی جدید تنظیم کی گئی۔ اس کے علاوہ سلطنت کی ہمہ جہتی کے لئے جو قدم اٹھائے گئے اس نے دور عثمانی کو تاریخ کا سنہرا دور بنادیا۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سے برطانوی حکومت ختم ہوگئی اور ہندوستان آزاد ملک بن گیا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو حکومت ہند کی طرف سے حیدرآباد پر پولیس ایکشن ہوا اور آصف جاہ سابع نے اپنی حکومت کی باگ ڈور ہندوستان کی مرکزی حکومت کے حوالہ کردی (۳)

۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو آصف سابع کو حکومت ہند نے خود ان کی ریاست کا راج پرمکھ بنادیا۔

۳۱ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو حیدرآباد ریاست کی تین لسانی تقسیم پر احتجاج کرتے ہوئے آصف جاہ سابع نے راج پرمکھی سے استعفیٰ دے دیا۔

آصف جاہ سابع تقریباً ۱۹۱۱ء سے ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۸ء تک ریاست حیدرآباد کے مطلق العنان حکمران رہے۔ ۱۴ر ذیقعدہ ۱۳۸۶ م ۲۴ر فروری ۱۹۶۷ء بروز جمعہ انتقال کرگئے۔ آپ کی وفات کی اطلاع شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ وصیت کے مطابق تدفین مسجد جودی کنگ کوٹھی میں عمل میں آئی۔

شاہ کو اردو شاعری کے اس پس منظر میں بھی دیکھنا ضروری ہے جو تقریباً ۴۰۰ سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ سلطنت آصفی کا قیام دکن میں اٹھارویں صدی کے ربع اول

میں ہوا۔اس زمانہ میں ولی اردو شاعری کی شمع جلاتے ہوئے دہلی پہنچے تھے۔آصف جاہ سابع سلطان العلوم کا عہد اس اعتبار سے مشہور ترین دور قرار پاتا ہے کہ آپ کے دور میں حیدرآباد اردو شاعروں اور ادیبوں کا ماویٰ و ملجا اور اہم مرکز بن گیا۔ہندوستان بھر کے شاعر ادیب اہل کمال نے جوق در جوق حیدرآباد کا رخ کیا اور شاہ دکن کی سرپرستی سے فیضیاب ہوئے۔

آصف جاہ سادس کو شاعری کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔آپ کے والد آصف جاہ سادس قادر الکلام شاعر تھے۔آصف جاہ سابع نے اردو اور فارسی میں شاعری کی۔اپنے والد کے استاد حضرت فصاحت جنگ جلیل سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔آپ کے کلام کا انتخاب ''کلام آصف سابع'' کے نام سے نظام اردو ٹرسٹ لائبریری سے شائع ہوا۔جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس دیوان میں فارسی اور اردو کا انتخاب ہے۔اس دیوان میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں حمد کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

دل کو خدا نے اپنی محبت سے بھر دیا
تسبیح کو زبان دی سجدہ کو سر دیا
عثماں یہ اس کا فضل ہے تجھ پر کہ بے سوال
نعمت سے اپنی دامن مقصود بھر دیا(۴)

نعت شریف کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ حاجت رہبر نہیں طیبہ کے سفر میں — دل آگے چلا جاتا ہے رہبر سے نکل کر
اڑ جائے وہ عثمان طرف گلشن طیبہ — جس وقت قفس ٹوٹے مرے طائر جان کا
آستانہ مصطفیٰ پر میں نے جب سر رکھ دیا — رحمت باری نے اپنا ہاتھ سر پر رکھ دیا

غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب تک وہ فاتحہ کو بلایا نہ جائے گا — ہرگز مرا مزار بنایا نہ جائے گا
سو بار میرے دل کو نگاہوں سے تو گرا — یہ اشک تو نہیں جو اٹھایا نہ جائے گا
پامال کر نہ حسرت و ارمان کہ دل میرا — جس دم اجڑ گیا تو بسایا نہ جائے گا
عثماں کو اب بہت نہ جلا یاد رکھ فلک — شعلہ بھڑک اٹھا تو بجھایا نہ جائے گا(۵)

ٹھمری

پنیا بھرن کیسے جاؤں گرد باڑی
سوگ کو تونے آج مٹایا رنگ عشرت خوب جمایا
زینو پیا تورے بل بل جاؤں

قطعہ

غمکدہ میرا جو خانہ ہوگیا موت کا دیکھو بہانا ہوگیا
زندگی کچھ بھی نہیں انسان کی مرگ کا بھی اک فسانہ ہوگیا

زندہ بیمار کو تاثیر دوا نے رکھا
نبض ساقط کو رواں دست شفا نے رکھا
شکر صد شکر کہ دنیائے دنی میں عثمان
ہم کو محفوظ بلاؤں سے خدا نے دیکھا

راقم کے دادا رحمت حیدر آبادی نے آصف جاہ سابع کی تلوار کی تعریف میں ایک قلعہ رقم کیا تھا۔ ملاحظہ ہوں۔

کیا نرالا وصف ہے شمشیر آصف جاہ کا
جوہر اسلام ہے اور خم ہے بسم اللہ کا
پہل علی عثمانؓ قبضہ رخ ہیں ابوبکرؓ و عمر
دار احمد مصطفیؐ کا وار ہے اللہ کا

☆☆

(۱) شیخ یعقوب علی عرفانی، حیات عثمانی، جلد اول، حیدر آباد ۱۹۳۶ء۔ صفحہ (۱۵۰)
(۲) شیخ یعقوب علی عرفانی، حیات عثمانی، جلد اول، حیدر آباد ۱۹۳۶ء۔ صفحہ (۱۶۰)
(۳) عبدالحئی، مملکت آصفیہ، جلد اول، پاکستان، ۱۹۷۸ء۔ صفحہ (۲۰۳)
(۴) نظام ٹرسٹ، انتخاب کلام آصف رابع، حیدر آباد، ۱۹۷۵ء۔ صفحہ (۱۹)
(۵) نظام ٹرسٹ لائبریری، انتخاب کلام آصفیہ سابع حیدرا

سید محمد عسکری عدیؔل کنتوری

نام سید محمد عسکری اور تخلص عدیل تھا۔ عدیل کی ولادت ۱۸ر جمادی الاول ۱۳۷۳ھ م یکم مئی ۱۸۵۶ء میں کنتور بارہ بنکی میں ہوئی۔ آپ جیب کنتوری کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔ جناب عدیل اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ ۱۲۹۹ھ میں تلاش معاش کے لئے عہد محبوبیہ میں حیدر آباد آئے (۱)

عدیل محکمۂ پولیس میں ملازم ہوگئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے ۱۳۴۳ ہجری میں (۷۰) سال کی عمر میں وفات پائی۔

عدیل کنتوری اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے آپ کا کلام کلام شیریں معاملہ بندی سے آراستہ تھا۔ شاعری میں عدیل اپنے بڑے بھائی سے اصلاح سخن حاصل کرتے رہے۔ آپ کے کلام میں تمام اصناف سخن اپنی پوری پابندیوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کلام مرتب نہیں کیا۔ چند قدیم تصانیف اور تذکروں میں آپ کے کلام کا نمونہ ملتا ہے۔

عدیل کی غزلیات کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

فصل گل آئی پھر آباد ہوا میخانہ ساقیا دیکھ وہ غول آتا ہے مے خواروں کا

شرط الفت اسے کہتے ہیں رہی یاد عدیل جان ہونٹوں پہ ہوا اور دھیان رہے یاروں کا

دیگر غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

نہیں ہیں جوہر اصلی نمایاں تیغ قاتل میں ہماری سخت ہمانی نقش ہے فولاد کے دل میں

ہمارے خون کا دھبہ بھلا دھونے سے چھوٹے گا گرہ ہے زخم و دامن دار کی دامان قاتل میں

جناب عدیل کی رباعیات میں سے ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

طوفانِ الم صبح و مسا رہتا ہے　　دل رنج و مصیبت سے بھرا رہتا ہے
کیا ہوگا ہمیں خوف قیامت کا عدیل　　یاں روز نیا حشر بپا رہتا ہے(۲)

☆☆

(۱) صاحب حیدر آبادی، جنوبی ہند کی رباعی گوئی، حیدر آباد ۱۹۸۴ء۔ صفحہ(۲۹۰)
(۲) صاحب حیدر آبادی، جنوبی ہند کی رباعی گوئی، حیدر آباد ۱۹۸۴ء۔ صفحہ(۲۹۰)

حضرت خواجہ الٰہی بخش شاہ عرفانؔ

نام خواجہ الٰہی بخش اور تخلص عرفان تھا۔ عرفان کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ بجن چشتی قدس سرہ سے ملتا ہے۔ والد نور محمد بھی ایک پیرو مرشد گزرے ہیں۔ عرفان نور محمد کے گھر ۱۲۸۲ھ میں تولد ہوئے۔ الٰہی بخش کی تعلیم و تربیت ابتداء میں گھر پر ہوئی اس کے بعد آپ کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کیا۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ سخاوت العلوم شاہ جہاں آباد میں مددگار مدرس مقرر ہوئے۔ حضرت عرفان کو تعلیم کے زمانے ہی علوم روحانی کی تحصیل کا بے حد شوق تھا۔ آپ نے ایک بزرگ حضرت شاہ نصیر حسینی سے بیعت حاصل کی مگر شاہ نصیر کی عمر نے وفا نہ کی۔ مرشد کے انتقال کے بعد عرفان بمبئی چلے گئے وہاں حضرت گلزار شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ بیعت کی۔ اس کے بعد حضرت عرفان نے کئی برس ریاضت و گوشہ نشینی کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کیا اپنے مرشد کی اجازت سے حیدرآباد دکن تشریف لائے اور مسجد ساجدہ بیگم محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی (۱) آپ کی آمد کی خبر سن کر طالبان علم دیں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب وکیل ہائیکورٹ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہ عرفان کو حضرت آغا داؤد صاحب کے ہاں لے گئے۔ انہوں نے اپنے مدرسہ کی صدر مدرسی پر شاہ عرفاں کو مامور کر دیا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ آپ کے مرشد گلزار شاہ نے بمبئی سے آپ کو ایک خط تحریر فرمایا۔

"اب ظاہری تعلیم ہو چکی، توکل اختیار کیا جائے"

حسب ہدایت آپ نے صدر مدرسی سے استعفیٰ دیگر مسجد چوک میں اقامت اختیار کی۔ محلہ شاہ گنج میں کرایہ کا مکان حاصل فرمایا اور مقیم ہو گئے۔ نواب فضیلت جنگ کی

.ıl .ıl 0.39KB/s 3:37 78%

خواہش پر آپ نے جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے طلبہ کو مسجد چوک میں حاضر ہو کر فیض حاصل کرنے کی اجازت دی۔ طلبا اس موقع کو غنیمت جان کر صبح و شام عرفان کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے فیوض روحانی اور علوم عرفانی سے مستفید ہوتے رہے۔

حضرت شاہ عرفان باوجود عارف عہد اور پیر طریقت کے علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ آپ اپنے عقیدت مندوں سے اکثر ارشاد فرماتے۔ خوش اخلاقی زندگی کو خوشگوار بناتی ہے اور مسرت کو بڑھاتی ہے۔ خموشی سے ہیبت و جلال بڑھتا ہے۔ فخر کا نتیجہ ذلت ہے۔ عجلت کا نتیجہ ملال، ناشکری نعمتوں کو زائل کر دیتی ہے۔ نااہل کی دوستی سوہان روح ہو جاتی ہے وغیرہ۔ حضرت عرفان نے ۱۳ر محرم الحرام ۱۳۳۰ء میں (۴۸) برس کی عمر میں عالم جوانی میں رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار شریف محلہ نام پلی میں عقب درگاہ یوسفین موجود ہے۔

حضرت عرفاں ایک اچھے اور خوشگو شاعر تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو میں شعر کہے ہیں۔ شاعری پر عرفاں کو کافی عبور تھا۔ آپ کا شمار دکن کے صوفی شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا کلام کئی رسائل میں طبع ہوتا تھا۔ شاہ عرفاں کے کلام کے بارے میں لئیق احمد فائق بندہ نوازی نے ایک مختصر رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ اس رسالہ میں بعنوان ''مکتوبات عرفاں'' بنام ''شاہ عرفاں تصوف پر گہری روشنی ڈالی ہے اور اس کے اسرار کو واضح کیا ہے۔ نثری تحریر کے درمیان فائق صاحب نے خود اپنے اشعار درج کیے ہیں (۲) عرفاں کی ایک اردو غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

پتہ چلتا نہیں حیرت ہے کیسے وصل کی ٹھہرے	مکاں بتلا کے اپنا ہر جگہ پھر لامکاں کیوں ہو
ہمیشہ مجھ سے پردہ ہے عجب گھونگھٹ نکالا ہے	ذرا چلمن کو سرکاؤ بتاں جانِ جہاں کیوں ہو
حقیقت ایک ہے سب کی بظاہر تو حقیقت ہے	حقیقت پر نظر رکھو تخالف کا بیاں کیوں ہو

ہر اک کہتا ہے اے عرفاں کہ تم عاشق خدا کے ہو
یہ کیسا رمز ہے پھر محو حسنِ دلبراں کیوں ہو

☆☆

(۱) امتہ السلام عالمہ، آصفجاہی عہد کے صوفی شاعر، حیدرآباد، صفحہ (۲۷۰)

(۲) لئیق احمد فائق نعمانی، مضمون شاہ عرفاں، صفحہ (۱۵)

نواب محمد عزیز الدین خان عزیز

نام محمد عزیز الدین خاں اور تخلص عزیز تھا۔ نواب مشرف یار جنگ فیاض کے فرزند تھے۔ خاندانی امیر تھے۔ عزیز ۱۲۹۰ھ میں تولد ہوئے زندگی امراء کی ڈیوڑھی میں گزری۔ تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی نوجوانی میں شاہی خطاب عزیز یار جنگ سے نوازے گئے۔ شاعری کا شوق ورثہ میں ملا۔ آپ کے والد بھی شاعر تھے۔ فیاض تخلص فرماتے تھے۔ شروع میں اپنے والد ہی سے اصلاح لی بعد میں مظہر الدین خاں مزاج سے رجوع ہوئے۔ جب داغ حیدرآباد آئے عزیز ان سے بھی اصلاح لینے لگے۔ داغ کی صحبت میں عزیز ایسے گھل مل گئے کہ عزیز کا کلام استاد داغ کے رنگ میں ڈھلنے لگا۔ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں۔

داغ کے شاگردوں میں شاید ہی کوئی اس مقام پر پہنچا ہو۔ عزیز کا کلام بالکل داغ کا کلام معلوم ہوتا ہے(۱)

عزیز ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا کلام جذبات و تاثرات سے بھرا ہوا اور تصنع سے پاک تھا۔ عزیز شیریں زبان میں شعر کہتے تھے۔

کہاں کا حشر کہاں کی، سزا کہا کا حساب　　عذاب میں ہوں الٰہی عذاب سے پہلے
جھوٹے وعدوں پر تھی اپنی زندگی　　اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا(۲)

عزیز کے دو ضخیم دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک کتاب ''باغ شباب'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے تاریخی قطعات بھی لکھیں جن میں سے ایک مشہور تاریخ حضرت آصف جاہ سادس کی وفات کی تاریخ ''چراغ بہشت'' ۱۹۱۱ عیسوی سے نکالی ہے۔ عزیز نے اپنی زندگی میں تقریباً دس ہزار اشعار لکھے ہیں۔ جس میں تقریباً آٹھ ہزار اشعار غزلیات پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ عزیز نے داغ، امیر، مومن کے کلام کا

انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ وہ شاعروں اور ادبی انجمنوں کی مالی اعانت کرتے رہتے تھے۔ غزل کے ایک شعر میں اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔

منتظر ہیں بادہ کش باران رحمت کے عزیزؔ
سامنے شیشہ دھرا ہے ہاتھ میں پیمانہ ہے

عزیز ۸۷ برس زندہ رہے ۱۳۶۸ میں انتقال کیا۔

جناب عزیز کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

وصل سے کم نہیں امید وصال
ناامیدی فراق ہے گویا
رہوگے حسن پر مغرور کب تک
نہ بدلے گی زمانے کی ہوا کیا
داد ملتی ہے کہاں فریاد کی
اس سے بڑھ کر اور ہو بیداد کی(۳)

☆☆

---

(۱) ڈاکٹر زور داستان ادب، حیدرآباد ۱۹۳۷ء، صفحہ (۳۳)

(۲) عقیل ہاشمی ڈاکٹر، سید محمد افتخار علی شاہ وطن اور حیات اور کارنامے حیدرآباد، ۱۹۸۰ء صفحہ۔ (۸۴)

(۳) ڈاکٹر زور مرقع سخن، جلد اول، حیدرآباد ۱۹۳۵ء، صفحہ (۲۹۲)

میر احمد علی عصرؔ

نام میر احمد علی اور تخلص عصرؔ ہے۔ ولادت کا صحیح سنہ معلوم نہ ہو سکا۔ اس تعلق سے مرقع سخن جلد اول میں پروفیسر اکبر الدین صدیقی یوں رقمطراز ہیں۔

''عصر کی پیدائش تقریباً ۱۲۴۵ھ کی ہے''

عصرؔ کے اجداد آصف جاہ اول کے دربار سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اس صلہ میں جناب میر بندہ علی والد عصر کو تا حیات ۵۲ روپیہ سکہ عثمانیہ ماہانہ منصب ملتی تھی۔ عصر کا بچپن بہت اچھا گزرا۔ والد کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کی۔ فارسی اور عربی پر کاری عبور حاصل تھا۔ اردو تو گھر کی زبان تھی۔ نوجوانی سے شعر و شاعری میں غرق تھے۔ طبیعت میں جولانی، مزاج میں قنوطیت مایوسی، دنیا سے بیزارگی تھی۔ عصر لاولد تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ دنیا سے بیزار تھے۔ عصر تقریباً (۸۰) سال زندہ رہے اور ۱۳۲۳ھ میں انتقال کر گئے (۱)

ان کی باقیات میں چار دیوان غزلیات کے اور ایک دیوان رباعیات کا موجود ہے۔ یہ سب قلمی ہیں۔ ۱۳۰۹ھ میں ضلع رائچور سے ایک نعتیہ کلام کا مجموعہ شائع ہوا۔ دیگر قلمی دیوان نواب خود جناب عصرؔ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں اور کتب خانہ آصفیہ (اورینٹل مین اسکرپٹ) میں موجود ہیں۔ رباعیات کا دیوان نواب عزیز یار جنگ عزیز کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ایک رباعی جو اولاد کے غم میں کہی تھی درج کی جاتی ہے۔

روتا ہوں لب پہ آہ و نالہ بھی نہیں   اندھیارے مکان کا اجالا بھی نہیں
اولاد سے ہے نام و نشاں دنیا میں   اپنا کوئی عصرؔ رونے والا بھی نہیں (۲)

عصر اپنا کلام حضرت فیض کو دکھایا کرتے تھے۔ انہوں نے آپ ہی کی رہبری میں طریقت و معرفت کی منزلیں بھی طے کیں۔ عصر کے فیض کی مدح میں جو قصائد لکھے ان کا

ایک شعر یہ ہے۔

فیضِ جناب فیض ہے دریائے فیض حق
ہم عصرؔ فیضیاب اسی آستاں سے ہیں

عصر کی رباعیات ضرب الامثال سے بھی مملو ہیں۔ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

بوسہ مانگوں تو کہتے ہیں آج اور کل
کچھ عرض کروں تو صاف وہ جاتے ہیں بدل
فرماتے ہیں یوں ناز سے جھلا کے شب وصل
دشمن ہوے نہ ہونے دے سچ ہے یہ مثل (۳)

عصر کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔مشہور شاگردوں میں جناب وزیر، عزیز، اسد، سیف، فقیر، نظام، ساجد، تحمل، قیس، کریم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

☆☆

(۱) اکبرالدین صدیقی مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد اول حیدرآباد ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۷۹

(۲) اکبرالدین صدیقی مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد اول حیدرآباد ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۹۲

بسم اللہ بیگم عصمتؔ

نام بسم اللہ بیگم اور عصمتؔ تخلص تھا۔ ولادت ۱۳۱۲ ہجری میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔
آپ کے والد جناب ترک علی شاہ ترکی حیدرآباد کے قادرالکلام شاعر اور صوفی گزرے ہیں۔
عصمت کی ابتدائی تعلیم گھریلو ماحول میں ہوئی۔ عربی، فارسی، اردو اور علم عروض پر کافی عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے والد ترکی ہی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔

شاعری کا شوق انہیں نوجوانی سے شروع ہوا۔ حیدرآباد کے اخبارات اور رسائل میں اپنا کلام شائع کرواتی تھیں۔ خاص کر گلدستۂ فیض میں اکثر آپ کا کلام شائع ہوتا تھا۔ نظم کے علاوہ عصمتؔ کو نثر میں بھی کمال حاصل تھا۔ حیدرآباد کے ''رسالہ النساء'' میں آپ کے ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں جیسے غزل، رباعی، قطعات، مرثیہ، نوحہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

ہم اپنے دل میں آپ کا جو گھر بنائیں گے　　کعبہ کو توڑ دیر مقرر بنائیں گے
قوس قزح تو آپ کی بن جائے گی کمان　　کیا اب ہلال عید کو خنجر بنائیں گے
قصر بہشت آپ کے لائق ہے واعظو　　ہم اپنا کوئے یار ہی میں گھر بنائیں گے (۱)

عصمت نے دیگر اصناف کے مقابل میں صنف غزل ہی پر زیادہ توجہ دی۔ ان کی غزل کے اشعار اپنے عہد میں خواتین کے حلقۂ احباب میں بہت مشہور تھے۔ ایک دوسری غزل کے بھی چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

صدمے فراق یار کے سہتا ہوں روز و شب　　جینا حرام ہے مجھے مرنا حلال ہے
کہتا ہوں درد دل کو کبھی ان کے سامنے　　اس شوخ زود رنج کو ہونا ملال ہے

گو پوچھتے ہیں غیر سے وہ میرے دل کا حال — یہ بھی ہے جائے شکر کہ اتنا خیال ہے
کچھ حال بھی دکھایئے اے شیخ پاکباز — ورنہ سنا ہوا تو یہ سب قیل و قال ہے

ہے آرزو کہ روضۂ اقدس پہ ہو نثار
عصمت یہ عزم خاص مجھے اب کے سال ہے

☆☆

(۱) نصیرالدین ہاشمی، خواتین دکن کی اردو خدمات، حیدر آباد، ۱۳۵۹ھ، صفحہ (۳۷)

.ııl .ııl 14.1KB/s 3:38 78%

عظمت اللہ خاں عظمتؔ

نام عظمت اللہ خاں اور تخلص عظمتؔ تھا۔ عظمت کی ولادت ۱۸۸۲ء میں دہلی میں ہوئی۔ ابھی آپ پانچ سال کے تھے کہ آپ کے والد نعمت اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔ جناب عظمت اللہ اپنی والدہ کے ساتھ ۱۸۸۷ء میں حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم والدہ کی نگرانی میں حاصل کی بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کامیاب کیا اور "عہد محبوبیہ" میں حیدر آباد آکر مددگار ناظم تعلیمات کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ عین عالم جوانی میں عظمت مرض دق میں مبتلا ہو گئے اور ماہ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۷ء میں انتقال کر گئے (۱)

جناب عظمت اپنی کم عمری ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنی مختصر زندگی میں انہوں نے جو بھی لکھا ہے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری میں قدیم ہندی بحروں کا استعمال کیا ہے۔

انہوں نے اردو ہندی بحروں کے تعلق سے ایک کتاب "سریلے بول" کے نام سے لکھی جس میں اردو اور ہندی بحروں کے امتزاج سے لکھی ہوئی نظمیں ملتی ہیں۔

نمونے کے طور ان کی ایک مشہور نظم کا ایک بند درج کیا جاتا ہے۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا
مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش کا یاں کوئی پل نہ ملا
مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

عظمت عالم نوجوانی میں اس دنیا سے گزر گئے۔ ذیل کے اشعار ان کی زندگی کے ابتدائی دور کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مرے تایا بڑے تھے زمانہ شناس
بڑے اونچے گھرانے میں ٹھہرا پیام
گیا ٹوٹ ساجی گئی ٹوٹ سی آس
مری چاہ کا ہوگیا کام تمام

مرحوم کی نظمیں گو تعداد میں مختصر ہیں مگر اپنی خوبیوں کے لحاظ سے گراں قدر ہیں۔

سند صورت سند رہی ہے رنگ گور یا کالی

آندھرا دیس کی سند رپتری کالی کوئل ہی کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور اداہٹ میں لالی
دانت وہ اجلے موتی کی جلا(۲)

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۶۱۳)
(۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۶۱۵)

حضرت میر امداد علی علوؔی

نام میر امداد علی اور تخلص علوؔی تھا۔ آپ ۱۲۵۵ھ م ۱۸۳۹ء بمقام بھون ضلع مظفر نگر اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اس گاؤں کے مولانا اشرف علی تھانوی بھی مشہور عالم دین گزرے ہیں۔ حضرت علوی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مکمل ہوئی۔ چونکہ ان کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا اس لئے قرآن شریف ختم کرنے کے بعد آپ کے والد میر نجات علی علوی نے اپنے فرزند کو پری طریقت کی تعلیم دی۔ بچپن ہی سے حضرت علوی کی عادات واطوار میں بزرگی کے آثار نمایاں تھے۔ روایت ہے کہ ایام طفلی ہی میں فرق عادات اور کرامات آپ سے سرزد ہوتی رہیں(۱)

علوؔی نے دیگر علوم کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی کماحقہ قابلیت پیدا کی۔ ۱۸۵۷ء کی غدر کی آگ تھانہ بھون میں آ پہنچی۔ علوی بھی اس سے متاثر ہوئے اور تھانہ بھون چھوڑ کر یہاں سے چودہ میل دور تحصیل کے صدر مقام پر رہائش اختیار کی۔ اس دوران آپ کی ملاقات بزرگ کامل مولانا ظہور الحق صاحب سے ہوئی۔ علوی آپ کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوگئے اور ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ مگر یہاں سے آپ کو تلاش معاش کے سلسلہ میں شہر میرٹھ جانا پڑا، اور وہاں انہیں ایک فوجی ٹھیکہ دار کے یہاں حسابات لکھنے کی نوکری ملی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو محکمہ سرکاری ورکشاپ میں سررشتہ داری کی ملازمت مل گئی۔ علوی نے پانچ سال بعد سرکاری ملازمت ترک کردی اور اپنے ایک دوست کے ساتھ حیدرآباد کا قصد کیا حیدرآباد میں محلّہ تکیہ خاں میں سکونت اختیار کی۔ آپ حیدرآباد میں حضرت مرزا سردار بیگ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان ہی کی ایما پر حافظ مولوی شجاع الدین صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور ذکر و اشغال میں مصروف ہوگئے۔ اسی دوران علوی کی

4

سر سالار جنگ اول سے ملاقات ہوئی۔ سالار جنگ نے ان کو دارالعلوم میں ملازمت دلوائی جو اس وقت کی سب سے بڑی علمی درسگاہ تھی۔ مگر یہ سلسلہ بھی ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ علوی نے کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر دی اور دوبارہ ذکر و اشغال میں مصروف ہو گئے اور آخر دم تک کہیں بھی ملازمت نہیں کی۔

علوی ایک نیک دل پرہیزگار پابند صوم وصلوۃ صوفی تھے۔ ۱۱ر محرم الحرام ۱۳۱۹ھ میں حقیقت وعرفان کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔ احاطہ گنبد سردار بیگ صاحب قبلہ جنوب مغربی سمت آپ کا مزار ہے۔

علوی نہ صرف مرشد تھے۔ بلکہ شاعر وادیب بھی تھے۔ آپ کے کئی نثری تصنیفات ملتی ہیں جو زیادہ تر قومی موضوعات پر مبنی ہیں۔ جیسے انوار محمد، سر السلوک، عقائد صوفیہ، معیار السماع، ختم وحدت وغیرہ۔ آپ کی تصانیف کے کئی قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔

دیوان علوی، کنز علوی، عقد لالی، دیوان سوز علوی، دیوان رنگ، رنگیلا، مسدسات و مخمسات، واسوخت، دیوان عمل علوی، دیوان حقایق علوی وغیرہ (قلمی) موجود ہیں۔ علوی کی شاعری کو ہم دو ادوار میں آسانی سے تقسیم کر سکتے ہیں جب آپ عالم شباب میں تھے اس وقت کی شاعری میں ظاہری عشق اور غزل کا رنگ ملتا ہے اور بعد کے کلام میں صرف عشق بازی سے زیادہ عشق حقیقی نمایاں نظر آتا ہے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

جبکہ رت اب شباب کی آئی
آتش شوق خود بخود بھڑکی
حق نے بخشا تھا جو کہ ذہن رسا
اور عنایت کیا تھا فہم رسا

حضرت علوی کی شاعری میں مثنویات کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے۔ جیسے مثنوی، عبرت، مثنوی نعت الدویا، مثنوی برزخ حقیقت، مثنوی وہ بزم ماتم، مثنوی مجموعہ، انواع غم وغیرہ۔ ان مثنویوں کے قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ علوی کی شاعری میں مسدس کی بھی کثیر تعداد ملتی ہے۔ جیسے مسدس شغلی العجوز، مسدس۔

حضرت علوی کا یہ عظیم الشان ذخیرہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر محیط ہے جو

سات جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ حضرت علوی نے ہر صنف سخن پر زور قلم آزمایا ہے۔آپ کے دواوین میں ہم کو حمد وثنا،نعت شریف،مسقبت،غزلیات،ترجیع بند،مسدسات،مخمسات،مستزاد،مثنویات،رباعیات،قطعات،دوہے،مرثیہ،ٹھمریاں وغیرہ ملتی ہے(۲)

اس عشق نے کیا کیا نہ مجھے ناچ نچایا　　مجبور سمجھ کر
اور بوجھہ امانت کا میرے سر پہ اٹھایا　　مزدور سمجھ کر
سوتا تھا میں آرام سے اک شور مچایا　　سوتے کو جگایا
اس ہستی موہوم میں پھر لاکے بٹھایا　　معذور سمجھ کر
کہہ دوں کہ خلافت میرا اعزاز بڑھایا　　گھر خلد بنایا(۳)

حضرت علوی کا،ہندی کلام رسم الخط اردو میں ہندی ملاحظہ۔

جوں درپن میں چھایا رے داتا بن کے بیچ سمایا رے۔داتا بن کے بیچ سمایا رے

(۴)بطور نمونہ غزل کے کچھ اور شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

من کے بیچ سمایا رے واتاریں کے بیچ سمایا رے
جوں درپن میں چھایا رے داتا بن کے بیچ سمایا رے

گرچہ ہے ذوالجلال کا بندہ　　آدمی ہے خیال کا بندہ
کیسا ماضی کہاں کا استقبال　　بندہ رہتا ہے حال کا بندہ

☆☆

(۱) غلام صمدانی گوہر،تزک محبوبیہ،جلد دوم،صفحہ (۴۳)
(۲) م۔ع۔علوی،میر امداد علی علوی،حیدرآباد صفحہ (۴۳)
(۳) از دیوان حقایق علیو (قلمی نسخہ) کتب خانہ آصفیہ محفوظ
(۴) از دیوان رنگ رنگیلا (قلمی نسخہ) کتب خانہ آصفیہ محفوظ

محمد حسام الدین فاضلؔ

نام محمد حسام الدین اور تخلص فاضل تھا۔ ولادت ۱۹ر شعبان ۱۳۱۲ء بمقام بیدر ہوئی۔ آپ کے والد محمد جعفر صاحب اپنے اہل وعیال کے ساتھ عہد محبوبیہ میں حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ اس وقت جناب فاضل کی عمر صرف تین سال تھی۔ جناب فاضل نے اپنی بیوہ والدہ کے زیر سایہ دینی تعلیم مدرسہ منصب داراں سے شروع کی۔ قرآن ختم کرنے کے بعد اُردو فارسی کی ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ یتیمی اور غربت کی وجہ سے آٹھ سال کی عمر میں فاضل بچوں کی فوج علاقہ نظم جمعیت میں ملازم ہو گئے۔ آپ کی والدہ بڑی محنت ومشقت سے آپ کی تربیت کرتی رہیں۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ جناب فاضل کو علمی شوق دامنگیر تھا۔ وہ دن میں ملازمت اور رات میں علمی وادبی شوق سے وابستہ رہتے۔ خانگی طور پر منشی عالم، منشی فاضل کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں والدہ نے آپ کو ازدواجی زندگی سے منسلک کر دیا۔ محمد حنیف صاحب بیدری کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ۲۱ر ربیع الاول ۱۳۲۷ھ میں ہو گیا۔ جناب فاضل کو شروع ہی سے گھر کا ماحول مذہبی ملا جس کے اثرات ان کی زندگی میں تاحیات نظر آتے ہیں۔ آپ کا شمار حیدرآباد کے علماؤ عارفین میں ہوتا تھا۔ آپ پہلے شعبہ امتحانات علوم مشرقیہ میں کام کرتے رہے پھر جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں لکچرر ہو گئے۔ اسی شعبہ سے ۱۳۴۹ھ میں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔ اس کے بعد انھیں تین سال کے لئے بلدیہ کا رکن نامزد کیا گیا۔ ۱۳۵۰ھ میں آپ حج بیت اللہ تشریف لے گئے وہاں پر آپ نے حضرت شیخ عبدالقادر مدنی کے ہاتھ پر بیعت کی (۱)۔

پہلی زوجہ کے انتقال کے بعد آپ نے دوسری شادی کی۔ اس طرح ان کی تین

زوجہات کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوا۔ جناب فاضل کے دو صاحبزادے اور چھ صاحبزادیاں تھیں۔ آپ کے جانشین اور صاحب عرفاں فرزند اکبر جناب مولانا جلال الدین حسامی ہیں۔ آپ کے دوسرے فرزند مولانا مولوی حمید الدین عاقل حسامی حیدرآباد کے مشہور واعظ ہیں۔ جناب فاضل کا وصال ۲۱؍ربیع الاول ۱۳۷۷ھ م ۱۷؍اکتوبر ۱۹۵۷ء بروز چہار شنبہ بعد عصر بمقام حیدرآباد ہوا۔ مادنا پیٹھ میں تدفین عمل میں آئی۔

جناب فاضل ایک مذہبی عالم اور ممتاز عالم دین تھے۔ یہ سب پر عیاں ہے اس کے ساتھ آپ ایک کامیاب شاعر کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ''عہد محبوبیہ'' میں انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ جب آپ بارہ سال کی عمر میں تھے اس وقت یہ شعر موزوں کیا تھا۔

خدا کا شکر کہ شاعر ہوں عہد طفلی سے
بغیر علم بھی تھا شوق شاعری مجھ کو(۲)

پندرہ سال کی عمر میں جناب فاضل احمد حسین مائل سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ شروع میں انھوں نے اپنا تخلص خنجر رکھا۔ ان کا یہ تخلص ڈاکٹر مائل کا انتخاب کردہ تھا۔ جناب فاضل ایک مذہبی آدمی تھے اس لئے انھوں نے اپنا تخلص بدل کر فاضل رکھ لیا۔ آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جیسے مسدس، ترجیع بند، غزل، منقبت، رباعی، مخمس، ٹھمری وغیرہ حمد اور نعت تو آپ کی زندگی کا مقصد تھا۔ آپ کے کلام میں جابجا تصوف وعرفاں نمایاں نظر آتا ہے جناب فاضل کی نعت فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے پر مغز بھی ہوتی تھی۔

جناب اکبر (مدیر صحیفہ) کے گھر ماہانہ نعتیہ محفل منعقد ہوتی تھی۔ اس محفل میں عہد محبوبیہ کے نامور شعرا کو مدعو کیا جاتا تھا۔ ان میں حضرت فاضل بھی بطور خاص مدعو کئے جاتے تھے۔ آپ کی صدارت میں نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ نعتیہ کلام کے چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

بالیں پہ مرے نزع میں آنا سرکار　　مرقد میں مجھے جلوہ دکھانا سرکار
محشر میں ہر آفت سے بچانا سرکار　　فردوس میں ساتھ اپنے لے جانا سرکار

ان کی رباعیات بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ ایک رباعی یہ ہے۔

کی تم نے کئی بار گندگی سے توبہ پھر ہوگئے مرتکب خطا کے توبہ
مالک سے خلاف عہد کب تک غافل توبہ شکنی سے کر لو پہلے توبہ

نعت کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں۔

آرہی ہے عنبر سارا کی بو عرشیوں سے ہورہی ہے گفتگو
انبیا آتے نظر ہیں چار سو جلوہ اللہ کا ہے مرے روبرو

حضرت فاضل پیری مریدی کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی زمانہ طالب علمی ہی سے بڑا شوق رکھتے تھے۔ ۱۳۳۰ھ میں انھوں نے ''سعید و پردہ نشین'' نام سے ایک ناولٹ شائع کی تھی۔ ''تاریخی بیاض حسنات'' کے عنوان سے ایک تین سو اشعار پر مشتمل مناجات ۱۳۳۲ھ منظوم کی اس مناجات پر حاشیہ بھی لکھا تھا۔ جس میں قرآن حکیم اور احادیث سے مدلل حوالہ جات درج کیے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ۱۳۵۲ میں ''تحفہ فاضل'' کے نام سے نعتیہ کلام کا حصہ اول شائع کیا تھا۔ ''جواہر فیض بانی'' نعتیہ کلام کی دوسرے جلد تھی۔

راقم الحروف کے نانا محمد قیام الدین گتہ دار سرکار آصفیہ کے گھر ہر ربیع الاول کے ماہ میں واعظ مقرر ہوتا تھا مولانا فاضل صاحب پابندی سے آتے تھے سرکارِ دوعالم کی شان رسالت کے عنوان سے واعظ کرتے تھے۔

☆☆

---

(۱) رسالہ حسامی فاضل نمبر۔ نومبر ۱۹۵۷ء حیدر آباد، ص ۲۹

(۲) رسالہ حسامی فاضل نمبر۔ نومبر ۱۹۵۷ء حیدر آباد، ص ۲۹

(۳) حسام الدین فاضل۔ دیوان نعتیہ جواہر فیض۔ حیدر آباد ۱۳۶۸، ص ۳۲۰

(۴) تسکین عابدی سخنوران دکن عہد عثمانی حیدر آباد ۱۳۵۷ھ، ص ۳۰۱

میر محمد حسین خاں فاضلؔ

نام میر محمد حسین خاں اور تخلص فاضلؔ تھا۔ آپ کی ولادت ۲۵/ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ م، ۱۰/سمرا ۱۸۷اء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ والد میر محمد حسین امرائے آصفجاہ میں تھے۔ میر محمد حسین میر عالم کے چچازاد بھائی تھے۔ میر عالم کی مدارالمہامی کے زمانے میں شیراز سے حیدر آباد منتقل ہوئے۔ چھتیس واسطوں سے میر محمد حسین فاضل کا نسب حضرت امام حسین علیہ اسلام سے ملتا ہے۔ زمانے کے دستور کے ساتھ ساتھ جناب فاضل نے بھی فارسی، عربی اور اردو کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کا امتحان کامیاب کیا۔ عہد محبوبیہ میں جناب فاضل منصف مجسٹریٹ بنائے گئے اور اطراف بلدہ کے تمام حدود میں بحسن وخوبی فیصلے کرتے رہے اور اسی محکمہ میں ترقی کرتے ہوئے ۱۳۱۷ھ میں ضلع محبوب نگر کے ناظم عدالت مقرر ہو گئے اور اسی خدمت سے وظیفہ حاصل کیا۔ آپ کے چار صاحبزادون کے نام میر مصطفے علی، میر اسد علی، میر محمد حسن اور سید عبدالحسین ہیں (۱)۔

جناب فاضل کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے کلام پر میر بادشاہ علی ضیا سے اصلاح لی۔ کلام نہایت صاف سلیس اور شیریں تھا۔ انھوں نے اپنے پیشرو اساتذہ سخن کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کی ان کے کلام پر گہری چھاپ ملتی ہے۔ انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں قصیدہ، رباعی غزل، مرثیہ اور نوحہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کی غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

دشت گردی سے بچایا ان کو زلف یار نے
پاؤں دیوانے کے دیتے ہیں دعا زنجیر کو

اٹھ سکے فرقت کے صدمے کب دل فاضل سے آہ
مرگیا سینے سے لپٹا کر تری تصویر کو

دیگر غزل کے چند اشعار ملاحظہ

فکر تحصیل رضائے دوست کے قابل نہیں
جس کو دل کہتے ہیں اہل دل وہ میرا دل نہیں
درد دل سننے کے تم، کہنے کے ہم قائل نہیں
جاؤ اب وہ تم نہیں وہ ہم نہیں وہ دل نہیں
مانگ دل کی ہے الگ اور وقت کی دھمکی الگ
وہ کھڑے ہیں سامنے اور میرے دل میں دل نہیں (۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ جلد دوم۔ طبقہ امرا۔ حیدرآباد ۱۳۱۹ص ۳۲۷
(۲) تسکین عابدی۔ سخنوران دکن حیدرآباد ۱۳۵۸، ص ۳۰۱

قطب الدین محمود علی فاضلؔ حیدر آبادی

نام قطب الدین محمود علی اور تخلص فاضلؔ تھا۔ فاضل کی ولادت حیدر آباد میں ہوئی
ابتدائی تعلیم والد غیاث الدین علی خاں کی نگرانی میں دارالعلوم حیدر آباد میں حاصل کی۔ بعد
میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کامیاب کیا۔ پھر طب کی سند حاصل کی
اس کے ساتھ انھوں نے قانون کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ علم حاصل کرنے کا شوق انھیں
جنون کی حد تک تھا۔ آپ کی علمی قابلیت کا ذکر تمکین کاظمی رسالہ نقوش میں یوں کرتے ہیں۔

> "عہد محبوبیہ میں طب کا امتحان عربی اور فارسی زبان میں ہوتا تھا۔
> فاضل نے ایک پرچہ ایسا نفیس حل کیا کہ ممتحن نے درجہ اعلیٰ کے نمبر
> دیتے ہوئے اس پر رائے لکھی کہ فنی حد تک جہاں تک تعلق تھا۔ پرچہ
> اعلیٰ ترین ہے جس کے پورے نمبر دیے ہیں لیکن یہ پرچہ کسی ایسے
> امیدوار نے حل کیا ہے جو عربی فارسی کا فاضل اور زبان پر ادیبانہ اور
> انشا پردازانہ عبور رکھتا ہے۔ عربی اتنی فصیح با محاورہ اور نفیس لکھی ہے کہ
> میں نے کسی ہندوستانی کو ایسی عربی لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔(۱)

جناب فاضل کی علمی قابلیت نثر ہی میں نہیں نظم میں بھی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو
میں شاعری کرتے تھے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد آپ کے والد جو پائیگاہ نواب لطف الدولہ
میں تعلقدار تھے اپنی جگہ اپنے ہونہار فرزند کو دلوادی۔ آپ کا وصال آپ کے والد کی زندگی
میں ۱۳۴۰ھ میں ہوگیا۔ آپ کے قابل ترین فرزندوں میں ڈاکٹر ولی الدین پروفیسر شعبہ
قانون، دوسرے میر سعادت علی خاں اور تیسرے قادر علی خاں تھے۔

شاعری میں جناب فاضل نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ آپ خود ہندوستان کی

قابل ترین شخصیت تھے۔ فاضل نے عربی، فارسی اور اردو میں جو اشعار یادگار چھوڑے ہیں وہ ان کی قادر الکلامی کا آئینہ ہے۔

فاضل کے حافظ کا واقعہ تمکین کاظمی کی زبان سے ملاحظہ ہو:

> حضرت فاضل کو بچپن کی پڑھی ہوئی کتابیں تک از بر تھیں اور بے تکلف سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا کیا پڑھ رہے ہو میں نے جواب دیا سکندر نامہ۔ پوچھا بحری یا بری مجھے معلوم نہ تھا کہ دو سکندر نامے بحری اور بری الگ الگ ہیں۔ میں نے کہا کہ وہی جو نظم میں ہے۔ تو کہاں میاں یہ دونوں ہی نظم میں ہیں۔ تم جس سکندر نامے کو پڑھ رہے ہو اس کا کوئی شعر سنا دو۔ میں نے دو شعر سنائے۔ شعر سن کر کہا یہ سکندر نامہ بری ہے۔ پھر آپ نے سکندر نامے کے شعر سنانے شروع کئے اور تقریباً تین سو شعر ایک سانس میں سنا دیے (۲)

جناب فاضل نے کئی کتابیں لکھیں جن میں شعری بھی ہیں اور قانونی بھی۔ ان کی قانونی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی گئیں اور خلاصے بھی۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کی سیکڑوں کتابیں ہیں۔ ان کی تمام کتابوں میں شرح شرع محمدی بہت مشہور ہوئی۔ آخر میں بطور نمونہ ان کی غزلوں کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

محبت تیری زلفوں سے بت بے پیر رکھتے ہیں
جنون عشق کی ہم پاؤں میں زنجیر رکھتے ہیں

زباں ہی بند ہوجاتی ہے ان کے سامنے اپنی
اگرچہ ہم بہت کچھ دعوی تقریر رکھتے ہیں

دیگر غزل

ان کی زلفوں سے بپا حشر کا طوفاں دیکھا
جسے دیکھا اسے سودا سے پریشاں دیکھا

عرش سے فرش تک ایسی نہیں ہرگز کوئی شے
موجزن جس میں نہ کچھ جلوۂ جاناں دیکھا(۲)

☆☆

(۱) تمکین کاظمی۔ رسالہ نقوش لاہور۔۱۹۵۶ء، ص ۱۲۶۸

(۲) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدر آباد، ۱۳۵۷، ص ۳۰۰

نواب احمد نواز جنگ فانی

نام احمد خاں اور تخلص فانی تھا فانی کی ولادت ۱۲۷۶ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم امرا کے فرزندوں کی طرح شان وشوکت سے ہوئی۔ نوجوانی میں سیول سروس کا امتحان کامیاب کیا اور ۱۸۹۳ء میں تعلقدار کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوگیا۔ مختلف اضلاع میں اول تعلقدار رہے۔ جناب فانی بہترین ایڈمنسٹریٹر تھے۔ بہت جلد ترقی کرکے فانی موید الملک سرسید علی امام کی وزارت عظمیٰ میں معتمد ترقیات کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے (۱)۔ آپ کے ہونہار فرزند عبدالقیوم خان باقی تھے۔ آپ کا انتقال ۱۳۷۲ھ میں حیدر آباد میں ہوا۔
فانی کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ شاعری سے دلچسپی لی۔ حضرت امداد علی علوی سے کلام پر اصلاح لی۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جینا تو محبت میں ہے دشوار، ولیکن
مرنا بھی کچھ اس راہ میں آسان نہیں ہے
کیوں تم پہ فدا ہوتے جو نادان نہ ہوتے
سچ کہتے ہو تجھ سا کوئی نادان نہیں ہے(۲)

☆☆

(۱) رحیم علی الہاشمی۔ اسٹار ڈائرکٹری۔ الہ آباد ۱۳۲۹ھ۔ ص ۴۳۶
(۲) تسکین عابدی۔ سخنوران دکن۔ حیدر آباد۔ ۱۳۸۷ھ۔ ص ۳۰۳

میر قادر حسین فرقؔ حیدر آبادی

نام میر قادر حسین اور تخلص فرق تھا۔فرق سادات نجیب الطرفین ہیں۔ جناب فرق کی ولادت ۱۲۵۲ھ م ۱۸۳۵ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔فرق کی ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں ہوئی۔اس کے بعد صرف خاص میں ملازمت کی۔انھوں نے حکیم مسیح الدولہ کی صاحبزادی سے نکاح کیا جن کے بطن سے تین صاحبزادے اور ایک دختر تولد ہوئی۔پہلی بیوی کے انتقال کے بعد جناب فرق نے دوسری شادی کی۔قاضی شریعت اللہ کی نواسی آپ کے عقد میں آئیں جن کے بطن سے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔جناب فرق نے (۶۱) سال کی عمر پائی اور ۱۳۱۳ھ میں ان کا انتقال ہو گیا(۱)

شاعری کا جناب فرق حیدر آبادی کو بچپن سے شوق تھا۔اپنا کلام حضرت شمس الدین فیض کو بغرض اصلاح دکھایا تھا۔فرق کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طویل غزلیں زیادہ لکھیں ہیں۔حضرت فیض کے خاص شاگردوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جیسے غزل، رباعی ،قطعات،نظم اور قصیدہ وغیرہ۔آپ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ان سے ملنے کی کروں کیا تدبیر　　نہیں ملتا کوئی قابو مجھ کو
بے قراری ہے شب فرقت میں　　نہیں وقفہ کسی پہلو مجھ کو
شعر سب بھول گئے ہیں اے فرق　　یاد ہے مطلع ابرو مجھ کو

ایک اور غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں:

کیا شگفتہ آئی گلشن میں بہار اب کے برس　　کیا ترانہ سنج ہے صوت ہزار اب کے برس

وصل جاناں میں کبھی ایسا مہینہ بھی نہ تھا ہجر میں رو رہا ہوں زار زار اب کے برس

فکر ہے اے فرق ہم کو شعر گوئی کی بہت چھوڑ کر بیٹھے ہیں سارے کاروبار اب کے برس (۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ جلد دوم۔ دفتر ہفتم۔ حیدر آباد ۱۹۰۲ء ۱۳۱۹ھ،ص ۱۳۹

(۲) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ جلد دوم۔ دفتر ہفتم۔ حیدر آباد ۱۹۰۲ء ۱۳۱۹ھ،ص ۱۴۰

محمد باقر فکرؔ کانپوری

نام محمد باقر اور عرف عام سید علی تھا۔فکر تخلص کرتے تھے۔فکر کی ولادت ۱۲۵۷ھ م ۱۸۴۰ء میں کانپور میں ہوئی۔انھوں نے (۹) برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ عہد محبوبیہ میں سرزمین دکن پر قدم رکھا۔حیدرآباد آنے کے بعد فکر نے اپنے نانا میر مہدی علی اور ابوتراب جعفری سے فارسی، عربی کا علم حاصل کیا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کی جستجو کی اور بڑی تلاش کے بعد محکمہ عدالت میں ملازم ہو گئے اور اسی محکمہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ایک فرزند آپ کے محمد جعفر تھے۔فکر کانپوری ۵۵ سال زندہ رہے۔۱۳۱۲ھ میں وفات پائی (۱)۔

جناب فکر کانپوری کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔انھوں نے اپنا کلام جناب سید حسن علی اشک کو دکھایا تھا اور اصلاح حاصل کی تھی۔فکر کانپوری اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔انھوں نے مثنوی "معراج الآثار" تذکرہ شعرائے فارسی اور روضہ و رضواں جو فارسی میں ہیں شائع کروایا۔ان کے علاوہ اردو میں ایک قلمی دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے۔آپ کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے آپ کا کلام نہایت پاکیزہ اور شوکت الفاظ سے مزین ہے۔فکر کانپوری ایک قادرالکلام شاعر تھے ان کا اردو دیوان کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔نمونے کے طور پر غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

سرخ پوشاک پہن کر ستم ایجاد آیا — آج مریخ کے جامہ میں وہ جلاد آیا

کبھی گلزار میں گلچیں، کبھی صیاد آیا — ایک جلاد گیا، دوسرا جلاد آیا

فکر کانپوری کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی نسبت نعت شریف میں زیادہ شوکتِ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہاں آدم، کہاں ختم رسالت — شرف میں بڑھ گیا بیٹا پدر سے
ملی آدم کو احمد سے نبوت — پدر نے مرتبہ پایا پسر سے
بزور اس نے لیا قاصد سے نامہ — رسالت چھین لی پیغمبر سے
نہ آئے قاف پر دل یا الٰہی — بچالے میری کشتی کو بھنور سے(۲)

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ جلد دوم۔ طبقۂ شعرا حیدرآباد ۱۳۱۹ھ۔ ص ۱۳۱

(۲) غلام علی صمدانی گوہر۔ تزک محبوبیہ۔ جلد دوم۔ طبقۂ شعرا حیدرآباد ۱۳۱۹۔ ص ۱۳۱

فیاض الدین خاں فیاضؔ

نام فیاض الدین خاں تخلص فیاض اور خطاب مشرف جنگ تھا۔فیاض ۱۲۵۰ھ میں بمقام حیدرآباد تولد ہوئے۔والد نواب محمد عزیز الدین خاں کے جد امجد سلطان الدین خاں پیشوا پونا تھے۔آصف جاہ اول کے ہمرکاب تھے(۱) فیاض نے تعلیم و تربیت اپنے والد کی سرپرستی میں حاصل کی۔اپنے وقت کے مشہور اساتذہ سے استفادہ حاصل کیا عربی فارسی اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔فیاض کا خاندان والد کی طرف سے دربار پونا کی پیشوا (وزیراعظم) تک جاتا ہے اور والدہ کی طرف سے ٹیپو سلطان سے ملتا ہے۔اسی وجہ سے آپ کی رگوں میں ایک طرف حکمران خون ہے اور دوسری طرف فوجی افسر کا دل رکھنے والے خاندان کا سلسلہ ہے۔نواب فیاض علم پرور،حق گو،آزاد منش اور علم و ادب کے شیدا تھے۔انھوں نے شعروشاعری میں مہارت حاصل کی۔ابتدا میں انھوں نے اول مددگار معتمد صرفخاص پیشی میں ملازمت کی(۲) نواب آصفجاہ سادس نے انھیں ۱۳۱۶ھ میں مشرف جنگ بہادر کے خطاب سے نوازا۔آپ کی اولاد میں نواب عزیز یار جنگ عزیز،محمد کریم الدین خاں اور محمد رحیم الدین خاں ہیں۔فیاض ۱۳۲۸ میں (۷۸) برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

فیاض حضرت فیض کے شاگرد تھے۔وہ حضرت فیض کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حضرت فیض کے خاص شاگردوں میں فیاض کا مقام بلند تھا۔فیاض ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔حضرت فیض کے تلامذہ میں مزاج،عصر اور پاس کے بعد فیاض ہیں جن کے ساتھ ہمیشہ محفل شعر منعقد ہوا کرتی تھی۔

فیاض کی زندگی تکلفات سے مبرا تھی۔وہ سیدھی سادی زندگی پسند کرتے تھے۔ بزرگانِ دین سے بے حد لگاؤ تھا۔وضعداری کی جو شان انھوں نے ابتدا سے اختیار کی تھی

اسے آخر وقت تک باقی رکھا۔ فیاض کے دل میں ہمیشہ سچی لگن اور اخلاص ومحبت کا دریا موجزن تھا ان کی عنایات ونوازشات اک سلسلہ طبقہ شعرا تک محدود نہیں تھا بلکہ سرکاری، خانگی اور اپنے ماتحت عہدہ داروں سے لے کر ملازمین تک کی سرپرستی کرتے تھے۔ فیاض نے اپنے ہمعصر شعرا کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنے اشعار میں ان کا ذکر کیا ہے جیسے میر احمد علی قاضی، مطلب، میر قاسم علی بیگ اور اخگر وغیرہ کہتے ہیں (۳)

عصر و مزاج و قاضی و مطلب کہاں ہیں اب
تھے بزم فیض میں یہی دوچار خاص خاص

حضرت فیض کے انتقال کے بعد جناب فیاض نے ان کی تقاریب عرس کی ذمہ داری قبول کی۔ وہ ہر سال پابندی سے عرس کے موقع پر مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔

شاعری کے علاوہ فیاض نے نثر نگاری میں بھی زور قلم آزمایا ہے۔ وہ علم حساب کے زبردست ماہر تھے۔ چنانچہ طالب علموں کی سہولت کے لئے انھوں نے چار کتابیں علم ریاضی سے متعلق تحریر فرمائیں:

(۱) قواعد کلیہ (۲) غرائب حسابی (۳) قطاع (۴) تشریح المساحت

یہ کتابیں شائع ہوئیں۔ ہر کتاب تقریباً اسی صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے کنز الظر ائف نام کی ایک کتاب بچوں کے لئے بھی لکھی۔

اس کے علاوہ انھوں نے عمر خیال کی رباعیات کو اردو میں منتقل کر کے ۱۳۱۱ھ میں شائع کیا فیاض نے نعت ومنقبت بھی لکھی۔ حضرت فیض کے دیوان کو سب سے پہلے فیاض نے شائع کیا۔ ان کے اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ (۳۲۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے فرزند نواب عزیز یار جنگ عزیز کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مخمسات، قطعات اور موقتی نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔

فیاض کا کلام بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

بات رہ جاتی ہے دن رہتے نہیں
تم نہ آؤ گے تو کیا ہوجائے گا

اگر رفعت پذیر اپنا غبار ناتواں ہوتا
زمیں ہوتی فلک پر اور نیچے آسماں ہوتا

جناب فیاض کے کلام میں میخانہ کا ذکر کس خوبی سے ملتا ہے۔

دور مسجد ہے تو میخانہ ہے پاس اپنے فیاض
شغل کچھ تو سہی خالی نہیں رہنا بہتر

رعایت لفظی کی مثالیں بھی ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔

اے بتو ایسی عمارت ہے کہاں
کعبہ دل کو نہ ڈھایا ہوتا

حال دل کا کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہو سکے جس سے مسیحا کا علاج
دردِ فرقت نہیں ایسا ہوتا

حضرت داغ کے انتقال پر جناب فیاض نے تاریخ لکھی جو اس زمانے میں عام و خاص میں بہت مشہور ہوئی تھی۔

ہائے لطف شاعری جاتا رہا(۴)
۱۳۲۲ھ

☆☆

(۱) سید ابوالفضل۔ مضمون شرف جنگ فیاض از مرقع سخن۔ جلد اول ۱۹۳۵ء۔ ص ۲۰۰
(۲) غلام صمدانی خان گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر اول حیدر آباد ۱۳۱۹۔ ص ۴۴۷
(۳) سید عباس متقی قاضی احمد علی قاضی مقالہ ایم فل حیدر آباد ۱۹۸۸ء۔ ص ۵۴
(۴) سید ابوالفضل مضمون مشمولہ مرقع سخن جلد اول حیدر آباد ۱۹۳۵ء۔ ص ۲۱۴

جناب قادر حسین قادرؔ

نام قادر حسین تھا اور قادر تخلص کرتے تھے۔ آپ ۱۰ر ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ کو بیگن پلی میں پیدا ہوئے اپنے والد محمد غوث صدیقی کے ہمراہ بچپن میں حیدر آباد تشریف لائے۔ مغل پورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اپنے والد کی نگرانی میں فارسی اور علم طب کی تعلیم حاصل کی۔ والدین کی غربت سے آپ تعلیم خاطرہ خواہ حاصل نہ کر سکے۔ مگر اردو مادری زبان ہونے کی وجہ سے ابتدا ہی سے شعروشاعری کا شوق طبیعت میں بسا ہوا تھا۔ ہر بات میں شعریت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ شروع میں احمد سہارنپوری اور پھر نیاز احمد خان ہوش بریلوی کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ جب حضرت داغ حیدر آباد تشریف لائے۔ قادر بھی انہیں کے شاگرد ہوئے۔ داغ نے دو سال تک ان کے کلام پر اصلاح دینے کے بعد انہیں اپنا کلام مشاعروں میں سنانے اور رسائل میں چھپانے کی اجازت دی۔ قادر ایک مرتبہ استاد داغ کی خدمت میں حاضر ہوئے استاد داغ لیٹے ہوئے تھے۔ قادر نے ایک شعر سنایا۔

بات بھی نازک ہے ان کی کس قدر
جیسا ان کا منہ ہے ویسی بات ہے(۱)

شعر سنتے ہی داغ اٹھ بیٹھے اور بے حد تعریف کی اور کہنے لگے میاں قادر تم ہونہار نظر آتے ہو اس زمین میں بیسیوں غزلیں ہوئی ہیں مگر تم نے کیا خوب شعر سب سے الگ لکھا ہے(۲)

استاد داغ کی وفات کے بعد قادر نے اپنے کلام پر استاد ظہیر دہلوی سے اصلاح لینے لگے قادر صرف خاص کی داروغہ گیری پر مامور تھے۔ ۱۲۹۸ھ سے ان کی ملازمت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

قادر قناعت کے ساتھ بالکل سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ قادر یار باش رند مشرب شاعر تھے۔ بڑی سے بڑی پریشانیوں میں خوش رہتے تھے۔ قادر کا انتقال ۶۶ سال کی عمر میں ۱۷ جمادی الاول ۱۳۵۱ھ کو ہوا (۳) آپ کے ورثا میں اکلوتے فرزند جناب محمد غوث صدیقی تھے وہ بھی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی وفات کی تاریخ اس طرح نکالی۔

قادر حسین قادر جنت نصیب باوا

۱۳۵۱ھ

قادر صاحب دیوان شاعر تھے۔ مگر ان کا دیوان ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ ان کے دیوان میں غزل کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار پانچ سو سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کئی نظمیں اور رباعیات بھی ملتی ہیں۔ قادر نے اردو کے علاوہ فارسی میں طبع آزمائی کی تھی چند غزلیں فارسی کی بھی ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔

جناب قادر کے اردو کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ استاد داغ کی اتباع میں کلام لکھا کرتے تھے۔ جس سے داغ کے کلام ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ قادر دکن کے رہنے والے تھے مگر ان کے کلام میں دہلی کے روزمرہ کا رنگ نمایاں نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہیں دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ آپ ظہیر دہلوی کے ساتھ دہلی میں مشاعرہ پڑھنے لگے اس مشاعرہ میں بڑے بڑے استاد موجود تھے۔ جب قادر نے اپنی غزل سنائی تو بہت تعریف ہوئی وہ اتنی سلیس اور سادہ زبان استعمال کر کے بڑے بڑے مضامین باندھ دیتے تھے اور ساتھ ساتھ شوخی بھی نمایاں ہوتی۔ چھوٹی بحروں میں بڑے بڑے مضامین ادا کرتے تھے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہو۔

آئی پیری گئے شباب کے دن
مست ہیں میکدہ میں سب ساقی

ٹمٹماتا چراغ ہے اپنا
ایک خالی ایاغ ہے اپنا

قادر کے کلام میں معاملہ بندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دو شعر اسی موضوع

پر ملاحظہ ہوں۔

مکر جانا بگڑنا روٹھنا بے وجہہ تن جانا
اسی کو آپ نے جان جہاں کیا بانکپن جانا
بلایا ہے تمھیں مقتل میں قادر آج قاتل نے
اگر جانا تو سر پر باندھ کر اپنے کفن جانا

☆☆

(۱) ڈاکٹر زور، مرقع سخن جلد دوم، مضمون نگار عبدالقادر دبیر، حیدرآباد ۱۹۳۷ء، صفحہ ۲۲۷
(۲) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد ۱۳۵۸ھ، صفحہ (۳۱۲)
(۳) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد ۱۳۵۸ھ، صفحہ (۳۱۲)

میر عبدالقادر قانعؔ حیدر آبادی

سید عبدالقادر نام اور تخلص قانع تھا۔ قانع کی ولادت ۱۲۷۶ھ م ۱۸۵۹ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ سلسلۂ نسب حضرت سید نا غوث اعظم دستگیر سے ملتا ہے۔ جناب قانع کے پردادا حضرت شاہ عظمت اللہ قادری، جناب ناصر جنگ شہید کے نواسے ہوتے تھے۔ آپ کی درگاہ گنبد مبارک اور مسجد مع خانقاہ قلعہ ارک اورنگ آباد میں آج بھی موجود ہے۔ جناب قانع کے اجداد کو سلطنت آصفیہ سے جاگیرات مقرر تھیں۔ جناب قانع کے والد سید حسین بادشاہ قادری بعہد محبوبیہ اورنگ آباد سے حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے فرزند قانع کی تعلیم و تربیت کا بہتر انتظام کیا وکالت کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد قانع نے عہد محبوبیہ میں ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد جناب قانع نواب غالب الملک کے کارخانوں اور جاگیرات وغیرہ کے معتمد مقرر ہو گئے اور تاحیات وہیں سے وابستہ رہے۔ بالآخر (۵۸) سال کی عمر میں ۱۳۳۴ھ میں وفات پائی۔ آپ کے ایک فرزند سید عظمت اللہ خاں قادری تھے (۱)

جناب قانع کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے اپنے کلام پر شمس الدین فیض سے اصلاح لی تھی۔ آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔

نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہیں پردے سے تمہارے رخ زیبا نکلا
دامن ابر سے اک چاند کا ٹکڑا نکلا

ہوگیا محو تماشا تجھے دیکھا جس نے
چشم بددور ترا حسن بلا کا نکلا

دیکھ کر قانع کو چپکے سے وہ یہ کہتے ہیں
چاہنے والوں میں چلتا ہوا پرزا نکلا

جناب قانع کی دیگر غزل کے چند اشعار مزید درج کیے جاتے ہیں۔

ہے ابھی خشک ابھی آنکھ مری دریا ہے
سخت حیرت ہے کہ پوشیدہ کہاں آنسو ہیں

یادِ محبوب میں رونا مجھے خوش آتا ہے
ہوں وہ غم کش کہ مرا دل مری جاں آنسو ہیں

شوق نظارہ ہے قانع پس پردہ کیا کیا
دونوں آنکھیں ہیں کھلی اور رواں آنسو ہیں

ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا جلوہ گر رقیب کی وہ انجمن میں ہے　　بجلی سی اک چمک مرے بیت الحزن میں ہے
کیا جانے کون ہوگیا گھائل نگاہ سے　　اک سادگی غضب کی ترے بانکپن میں ہے

سید معین الدین صاحب ساکن چنچل گوڑہ نے اپنے ایک انٹرویو میں قانع کا ایک قطعہ نوٹ کروایا۔ یہ تاریخی قطعہ مسلم جنگ پل تیار ہونے پر لکھا گیا تھا ملاحظہ ہو۔

عہد میں حضرت آصف کے بنا　　غالب الملک کا پل موسیٰ پر
اس کی تاریخ لکھی قانع نے　　واہ کیا خوب عمارت بہتر(۲)

۱۳۱۸ھ

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم، دفتر طبقہ شعرا حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ، صفحہ ۱۴۳،۱۴۴

(۲) انٹرویو سید معین الدین۔ اہل چنچل گوڑہ حیدرا

شیخ احمد علی شاہ صدیقی قاضیؔ

نام شیخ احمد علی شاہ اور تخلص قاضی تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۵۷ھ میں پاکٹور تعلقہ ضلع رائچور (دکن) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اسی گاؤں میں ہوئی۔ آپ کی شہرت قاضی احمد علی نام سے ہونے لگی۔ آپ کے والد غلام نبی شاہ المعروف کمبل پوش نے نوجوانی میں اپنے فرزند احمد علی قاضی کو حضرت شمس الدین فیض کے سپرد کر دیا۔ حضرت فیض غلام نبی شاہ کے پیرومرشد تھے۔ جب قاضی علوم وفنون سے فارغ ہو گئے تو حضرت فیض کو خیال ہوا کہ قاضی کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ کا عقد نکاح حافظ غلام محمود کی صاحبزادی عظیم النساء سے ۱۲۷۹ھ میں ہوگیا۔ حضرت فیض نے شادی کے موقع پر یہ قطعہ تاریخ موزوں کیا۔

قاضی احمد خدا کے فضل سے دلہا بنا
جو مقدر میں نہاں تھا وقت پر پیدا ہوا
سال تاریخ اس کا میں نے یہ سنا ہے فیض سے
ساعت محمود میں شادی رچی اچھا ہوا(۱)

۱۲۷۹ ہجری

قاضی صاحب کو عظیم النساء کے بطن سے پانچ اولادیں ہوئی (۱) غوث النساء (۲) محمد اشرف علی (۳) حاجی بیگم (۴) فیض الدین (۵) محمد رزاق حسین۔ جناب قاضی نے ۱۲۸۷ھ میں دوسرا عقد ظہور النساء سے کیا جن کے بطن سے صرف دو صاحبزادیاں فاطمہ بیگم اور صمدانی بیگم تولد ہوئیں۔ جناب قاضی کا وصال ۱۳۲۷ھ میں حیدرآباد میں ہوا۔ آپ کا مزار شاد نگر میں موجود ہے۔

شاعری میں قاضی کو اپنے استاد کُل حضرت فیض شمس الدین سے تلمذ حاصل تھا۔

آپ کے کلام میں حمد، نعت، منقبت، غزل، مثنوی اور مرثیہ ملتے ہیں۔ قاضی کا ایک قلمی دیوان گلشن قاضی کے نام سے منسوب ہے۔ اس دیوان کا سن تصنیف ۱۳۱۱ھ بتایا گیا ہے۔ دیوان کی پہلی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رقم مضمون ہوا ہے بسملہ میں سارے قرآں کا — بنا دیباچہ بسم اللہ قاضی اپنے دیواں کا
قناعت، زہد و تقویٰ حلقہ بیروں در ہیں سب — کفیل کار یزداں کا بنا ہے فضل یزداں کا
ہمارے دم قدم پر ہم کو قاضی ناز ہوجائے
یہ دم عیسیٰ کا ہے اور وہ قدم موسیٰ عمران کا

اس قلمی دیوان میں جملہ (۲۱۶) غزلیات ہیں اور دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ قاضی کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد کے رنگ میں ڈوب کر نکھارا ہے قاضی کا ایک اور بھی قلمی دیوان موجود ہے اس دیوان میں (۱۴۴) غزلیات ہیں۔ قاضی کو تاریخ گوئی سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ اپنے استاد سخن حضرت فیض کی تاریخ وفات یوں نکالی ہے۔

مولوی مولانا شمس الدین فیض — عالم بے مثل و عامل ہوگیا
اس کا قاضی نے لکھا سال وفات — فیض ابراہیم کامل ہوگیا
۱۲۸۳ھ

قاضی کا ایک دیوان صرف رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس میں (۴۹۵) رباعیات ملتی ہیں ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

بندے کرتے ہیں سب خدا کی چوری — نیز یہ غضب خدا کا ہے سرزوری
چوری سرزوری اس کا گو خوف نہیں — ہے باعث رو سیاہی دل کی کوری

اس کے علاوہ قاضی کے قصائد کا بھی ایک دیوان موجود ہے جس میں (۳۶۳) صفحات ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جھکا مسجد میں سر اول قلم کا — ستارہ بن کے ہر اک لفظ چمکا
مرا جو حرف بسم اللہ خواں ہے — ہر اک مرکز کا عالم ہے علم کا
فلک کی بن گیا صورت زمیں سے — اڑا جس دم غبار ان کے قلم کا

ذرا ہمت پہ فرما کام قاضی
تو خادم ہے کسی صاحب پیہم کا(۲)

☆☆

(۱) عباس متقی مقالہ، قاضی احمد علی قاضی، حیدرآباد۔۱۹۸۸ء صفحہ(۴۷)
(۲) عباس متقی، مقالہ، قاضی احمد علی قاضی، حیدرآباد، ۱۹۸۸ء صفحہ(۱۱۰)

سید ابراہیم قمر

نام سید ابراہیم اور تخلص قمر تھا۔ قمر کے والد سید زین العابدین فرقہ مہدویہ کے بزرگ مرشد تھے۔ جناب قمر تعلیم کی تکمیل کے بعد پولیس میں ملازم ہوگئے اور وہیں سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ جناب قمر حضرت توفیق حیدرآبادی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ رسالہ المصدق میں آپ کی شعری تخلیقات اور نثری مضامین شائع ہوتے تھے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ثانی مہدی کے موضوع پر ملاحظہ ہوں۔

ہیں وجد میں افغانی اور غش میں خراسانی ۔۔۔ مہدی کے دل و جانی آئینہ سبحانی
صورت تری نورانی ہے دیکھ کے حیرانی ۔۔۔ فرزند برابر کا بھائی کے برابر تھا
ہو کس سے بیاں رتبہ اللہ رے ترا درجہ ۔۔۔ آیا جو قمر مضطر امید لئے در پر
محتاج ترا ہوکر اے ابن شہ کوثر(۱)

"ہجوم تمنا" کے نام سے ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کسی کے عشق میں رسوا رہے ہم کو بہ کو برسوں
کسی ظالم نے دنیا میں رکھا بے آبرو برسوں
میں ہوں وہ رنگ چھوٹے گا نہ مرکر میکدہ مجھ سے
بنیں گے خاکِ تربت سے مرے جام وسبو برسوں
غزل رنگین ہونے کا سبب یہ ہے قمر ہم نے
درختِ شعر میں سینچا ہے سیروں سے لہو برسوں (۲)

تسکین عابدی نے "سخنوران دکن" میں جناب قمر کی مختلف غزلوں سے جو اشعار منتخب کر کے درج کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

دیکھنے والے پہ اس نے عام جلوہ کردیا
چشم مجنوں کے لیے ہر شے کو لیلیٰ کردیا

بھلے کو میں بے ہوش میخانے میں دنیا کے
ہوئیں نازل بلائیں ورنہ ہر ہشیار پر کیا کیا

پرے باندھے ہوئے ہر سمت ان کے چاہنے والے
کوئی کہتا ہے رخ اچھا کوئی کہتا ہے خال اچھا

رفتار سے کھلائے ہوئے گل جہاں چلے
رستے کو وہ بناتے ہوئے گلستاں چلے(۳)

☆☆

(۱) رسالہ المصدق، جلد اول شمارہ ۹، رمضان، ۱۳۵۰ھ، صفحہ (۲۱)
(۲) رسالہ المصدق، جلد اول شمارہ ۷، رجب، ۱۳۵۰ھ، صفحہ (۲۴)
(۳) تسکین عابدی، سخنوران دکن، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ، صفحہ (۳۱۷)

راجہ بھگوان سہائے کرم

نام بھگوان سہائے اور تخلص کرم تھا۔ کرم کا تعلق راجہ گھرانے سے تھا اس لئے انہیں راجہ بھگوان سہائے کہا جاتا تھا۔ جناب کرم کے جد اعلیٰ راجہ ساگر مل (۱۱۵۰ھ م ۱۸۳۵ء) آصفجاہ اول کے ہمراہ اورنگ آباد آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ راجہ بھگوان کے والد راجہ پرشاد کیرت راجہ دھرم ونت کے بھائی تھے۔ راجہ بھگوان سہائے ۱۲۸۵ھ میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سٹی ہائی اسکول میں حاصل کی۔ اس زمانے میں انٹر تک تعلیم حاصل کی جبکہ اس زمانے میں عام آدمی پنجم کے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ راجہ بھگوان انگریزی، اردو اور فارسی سے اچھی طرح واقف تھے۔ علم ریاضی میں ماہر تھے۔ عہد محبوبیہ میں انہیں ۱۳۱۱ھ میں راجہ بہادر اور منصب دو ہزاری سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں ایک ہزار سوار و علم کی ذمہ داری بھی عطا ہوئی (۱)

راجہ بھگوان کا شمار عہد محبوبیہ کے امرا میں ہوتا تھا۔ آپ کے گھر میں اکثر شعرو شاعری کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ آپ کی اولاد میں ایک جانکی راج اور دوسرے بھاسکر آنند پرشاد تھے۔ راجہ بھگوان ستر سال کی عمر میں ۱۳۵۵ھ فوت ہوئے۔

شاعری میں سہائے کرم، استاد ظہیر دہلوی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ آپ کے کلام میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ انہوں نے غزل، رباعی، قطعات اور ٹھمریاں بھی لکھی ہیں۔ آپ کا ایک مکمل قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات میں ہے۔ غزل کے چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں (۲)

نہ غم اپنا نہ اپنی بے بسی کا
اگر ہے دھیان ہے تیری ہنسی کا

کچھ ایسے وصل میں روٹھے نہیں بنتی نہیں بنتی
نکالی وقت پر بے وقت کی یہ دل لگی اچھی

مختلف غزلیات کے کچھ اور اشعار:

نہ رہا کوئی مجاور مرے بالین مزار
بیکسی تو ہی رہی میری نگہباں ابتک

تصویر خیالی تری کھچوائیں گے دل میں
اس خانہ ویراں کو ہم آباد کریں گے

آئینہ کس نے ان کو دکھلایا
آج وہ منہ بنائے بیٹھے ہیں

کشتہ ناز تھا ہر ایک خریدار نہ تھا
عرصۂ قتل تھا وہ حسن کا بازار نہ تھا(۳)

☆☆

(۱) نصیرالدین ہاشمی، دکنی ہندو اور اردو، حیدرآباد ۱۹۵۸ء، صفحہ (۷۸)

(۲)(۳) نصیرالدین ہاشمی، دکھنی ہندو اور اردو، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۷۸

سید رضی الدین حسن کیفی

نام سید رضی الدین اور تخلص کیفی تھا۔ کیفی کی ولادت ۱۲۹۷ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جناب کیفی کے والد سید نظام الدین حسن ایک صاحب دل صوفی تھے۔ آپ کے نانا ڈاکٹر حکیم سید محمد کا خاندان سادات بادسہ سے تعلق رکھتا تھا کیفی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی سید نظام الدین حسن سے حاصل کی۔ اس کے بعد دار العلوم میں داخلہ لیا پھر پنجاب یونیورسٹی سے منشی کا امتحان کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے حضرت الٰہی بخش اور مولوی قادر الدین اور علامہ ابو بکر ابن شہاب اور مولانا عبد القدیر صدیقی حسرت سے بھی علوم وفنون متداولہ عرفان کی تعلیم حاصل کی۔ ان اساتذہ کے بعد کیفی نے کسی سے مشورہ سخن نہیں کیا۔ طبیعت میں تلون مزاجی تھی لیکن شاعرانہ صلاحیت بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی۔(۱)

کیفی طالب علمی کے زمانے سے شعر کہتے تھے۔ حیدر آباد کے ہر بڑے مشاعرہ میں شرکت کرتے اور مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ طبیعت میں شوخی اور شرارت تھی۔ اس طرح محفل میں اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ سارے ہندوستان میں کیفی نے شہرت حاصل کر لی۔ حضرت فیض اور میکش تھانوی کے سالانہ مشاعروں میں کیفی اپنا کلام سنا کر کافی داد حاصل کرتے۔ کیفی کے تعلق سے صمصام شیرازی سخنوران دکن لکھتے ہیں:

> ''آج سے پندرہ بیس سال پہلے حیدر آباد میں صرف دو ہی شاعر تھے ایک توفیق دوسرے کیفی، اگر توفیق اپنے وقت کے میر تھے تو کیفی سودا۔ دونوں کے کلام میں بھی ایسا ہی رنگ تھا جیسا کہ میر اور سودا کے کلام میں ہے''(۲)

ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنی تصنیف سید محمد افتخار علی شاہ وطن میں غالب اور کیفی کا

تقابل پیش کیا ہے دونوں کے اشعار ساتھ ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ دو شعر بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں۔

غالب:۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

کیفی :۔

یہ مستی اور اس پر بت پرستی حضرت کیفی
بھلے مانس اسی پر دعویٰ اسلام کرتے ہیں

غرض یہ اور اسی انداز کے کئی ایک شعر حضرت کیفی کے کلام میں ملتے ہیں۔

نظم کی یہ نظم ہے تاریخ کی تاریخ ہے
واقعات و شاعری کا بھی ہے کچھ لب لباب
داد اپنی شاعری کی آپ ہی دیتا ہوں میں
جس طرح سے آفتاب آمد دلیل آفتاب (۳)

☆☆

(۱) ڈاکٹر زور، مضمون مشمولا، مرقع سخن، جلد اول، حیدر آباد ۱۹۳۵ء، صفحہ (۲۵۹)

(۲)(۳) صمصام شیرازی۔ سخنوران دکن، حیدر آباد، ۱۹۶۵ء، (۱۲۱)

غلام صمدانی خاں گوہرؔ حیدر آبادی

نام غلام صمدانی خان اور گوہر تخلص تھا۔ گوہر کی ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ حیدر آباد میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں فارسی اور عربی میں حاصل کی انگریزی اور تلنگی سے بھی واقف تھے۔ اردو زبان تو مادری تھی۔ آپ کے جد اعلیٰ غلام امام خاں صاحب آصف جاہ ثالث کے بعد حیدر آباد آئے وہ موضوعہ سرور نگر میں رہتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گوہر محکمۂ مالگزاری میں ملازمت شروع کی۔ یہیں سے وظیفہ حاصل کیا خودنوشت سوانح میں گوہر خود رقم طراز ہیں۔

گوہر کی پہلی شادی والد صاحب کی عین حیات میں سرور نگر کے مقام پر ۱۳۰۵ھ میں ہوئی۔ آپ کا عقد میر جعفر علی صاحب منصبدار کی صاحبزادی سے ہوا(۱)

جناب گوہر کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ۸ محرم الحرام ۱۳۱۴ھ کو انتقال کر گئی۔ جناب گوہر کی پہلی بیوی کے انتقال سے قبل ۱۳۱۳ھ میں دوسری شادی شمس النساء بیگم عرف خواجہ بیگم سے عمل میں آئی۔ جن کے بطن سے ایک لڑکا غلام دستگیر خان عرف دستگیر پاشاہ۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ تولد ہوا۔ دوسرا لڑکا ۲۲ جمادی الثانی ۱۹۲۱ء بروز سہ شنبہ تولد ہوا اس لڑکے کا نام محبوب علی خان رکھا دونوں کا انتقال ہوگیا۔

جناب گوہر عہد محبوبیہ کے نامور مورخ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں تاریخ بعنوان تزک محبوبیہ جلد اول ۱۳۱۷ھ میں اور تزک محبوبیہ جلد دوم کو ۱۳۱۹ھ میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ بہت کم اصحاب یہ جانتے ہیں کہ غلام صمدانی خاں گوہر ایک کامیاب شاعر تھے۔ ان کا ایک دیوان ”نظم گوہر“ کے نام سے ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوا تھا مگر آج دستیاب نہیں ہے۔ تزک محبوبیہ کے دیباچہ میں سے اخذ کردہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیتے ہیں اپنی جان وہ غیروں کی چاہ میں
بالکل نہیں سماتے ہم ان کی نگاہ میں
کھوٹا ہیں کھرا ہے بتو نقد دل میرا
دیکھو پر کھ لو جانچ لو اپنی نگاہ میں
بوسہ لیا جو ان کا تو جھنجلا کے یوں کہا
چھوڑو ہٹو چلو کوئی دیکھے نہ راہ میں
اے دل ذرا ٹھہر کہ جواب آہی جائے گا
قاصد کو دیر ہوگئی شاید کہ راہ میں
گوہر بتوں کی جور سے بالکل ہوا ہے تنگ
شیر خدا اسے رکھو اپنی پناہ میں(۲)

جناب گوہر حیدرآبادی تھے مگر عہد محبوبیہ میں ریاست کے ضلع رائچور میں مقیم تھے۔جواب کرناٹک اسٹیٹ میں شامل ہے۔ایک مصرعہ میں رائچور کا ذکر کسی خوبی سے کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

جو حال پوچھے گوہر خانہ خراب کا
کہہ دو کہ اب مقیم ہے وہ رائچور میں

جناب گوہر ایک مورخ اور شاعر ہی نہیں تھے انہوں نے ایک ممتاز صحافی کی حیثیت سے بھی عہد محبوبیہ میں خوب نام کمایا۔آپ کا ایک ہفتہ وار اخبار ’جلوۂ محبوب‘‘ کے نام سے شائع ہوتا تھا۔بعد میں یہ اخبار روزنامہ میں تبدیل ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد بند ہوگیا۔یہ اخبار آج تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہوا۔

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ جلد دوم دیباچہ، حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ(الف)

(۲) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، دوم دیباچہ، حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ ک

مرزا نظام شاہ لبیبؔ

نام مرزا نظام شاہ اور تخلص لبیب تھا۔لبیب کا سلسلۂ نسب خاندان تیموریہ سے ملتا ہے۔جناب لبیب کی ولادت ۱۸۸۳ء میں دہلی میں ہوئی۔جب آپ (۹) برس کے ہوئے تو اپنے والد کے ہمراہ ''عہد محبوبیہ'' میں تلاش معاش میں حیدرآباد آئے۔جناب لبیب نے حیدرآباد میں مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی پھر پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم اور مولوی فاضل کامیاب کیا۔اس کے علاوہ ہندی زبان اور انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ابتداء میں محکمۂ مال میں ملازم ہوئے۔کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر کے ''مشیر دکن'' اخبار کے دفتر میں منیجر ہوگئے۔بعد میں اڈیٹر بھی۔اس کے بعد انہوں نے خود اپنا ایک مطبع محبوب پریس کے نام سے قائم کرلیا اور ایک ادبی رسالہ ''افادہ'' بھی شائع کرتے رہے۔اس رسالہ میں ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔(۳۵) سال کی عمر میں لبیب کے دل میں فقیری کا رجحان پیدا ہوا چنانچہ اسی زمانہ میں وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر نو دس سال تک ایک حضرت شاہ صاحب کے گھر پر رہ گئے(۱) جناب لبیب نے (۶۳) برس کی عمر پائی۔آخر زمانے میں وہ حیدرآباد سے بمبئی منتقل ہوگئے۔کینسر میں مبتلا ہوکر وہیں ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا(۲)

جناب لبیب کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔شروع میں استاد سخن حضرت داغ دہلوی کو دو چار غزلیں دکھائیں۔اس کے بعد اپنے والد مرزا حامد، آقا سید علی شوستری، مرزا منیر الدین ضیاء اور حبیب کنتوری سے بھی مشورۂ سخن کیا۔کسی کی باقاعدہ شاگردی نہیں کی۔

جناب لبیب ایک کامیاب شاعر گزرے ہیں۔انہوں نے شاعری کے علاوہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی کافی شہرت حاصل کی۔انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی فرمائش پر ۱۹۲۳ء میں کلیات حسن بصری کے قلمی نسخے کی تصحیح کی جو اسی سال شائع ہوئی۔۱۹۳۷ء میں مولوی عبدالحق بابائے اردو کی فرمائش پر مثنوی مولانا روم کو اردو جامہ پہنایا جو حکایات رومی

کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئے۔اس کے علاوہ انہوں نے ''رموز اوقاف'' کے نام سے اردو کی علامات اوقاف پر ایک کتاب تحریر کی اور ایک کتاب ''سلوک قلندری'' کے نام سے مرتب کی جس کے مصنف شاہ بالمیں تھے۔

جناب لبیب ۱۹۵۸ء میں پاکستان منتقل ہوگئے اور وہاں سے اپنے کلیات کا مجموعہ ''آتش خزاں'' کے نام سے شائع کیا جو غزل، نظم، گیت، رباعی اور قطعات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ان کی غزلیات میں حسن وعشق کی پابندی اور معاملہ بندی نمایاں ہے۔ذیل کے اشعار اس بیان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

کیا ہوئے آہ وہ دن رات سنورنے والے
جن کی ہر آن پہ تھے سینکڑوں مرنے والے
تھے تغافل میں بھی دل لینے کے انداز میں طاق
ڈھونڈ کر گھر دل صد چاک میں کرنے والے
زندہ درگور ہیں دم عشق کا بھرنے والے

غزل دیگر

خوشی ناخوشی دن گزر جائیں گے ۔۔۔ تری رہگزر ہی میں مرجائیں گے
نشاں زندگی کا تڑپ ہے لبیب ۔۔۔ مریں گے تو سب زخم بھرجائیں گے

حیدرآباد کے ایک غیر طرحی مشاعرہ میں (۱۹۲۳ء) لبیب نے ایک مشہور غزل پڑھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مٹایا اس قدر اس کے خرام ناز نے یارب ۔۔۔ کہ باقی ہے فقط اب داستان میری
نہیں گردش میں کچھ کم چرخ سے عمر رواں میری ۔۔۔ کہ ہر دم اک بہار نو دکھاتی ہے خزاں میری
فنا ہے ماضی و مستقبل زندانیاں لیکن ۔۔۔ نمود ہستی بس فی الحال ہے اک چیستاں میری
مجھی سے اے بہار جانفزا آباد ہے گلشن ۔۔۔ تری نیرنگیوں کی جان ہیں بیتابیاں میری
لبیب اس بام پر چڑھنے کی جتنی جستجو کیجئے ۔۔۔ ہوئی جاتی ہے اتنی ہی فروتر نزدیاں میری

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم دفتر ہفتم حیدرآباد ۱۳۱۹ھ، صفحہ ۱۴۹

(۲) رسالہ اردو مرتبہ عبدالحق، جلد سوم، اپریل ۱۹۲۳ء، صفحہ (۳۰۷)

سید نوازش علی لمعہ حیدرآبادی

آپ کا نام سید نوازش علی خاں اور تخلص لمعہ تھا۔ ولادت ۱۲۸۷ھ م ۱۸۶۸ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ جناب میر کاظم علی خاں شعلہ آپ کے والد تھے۔ اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کر لی۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں بھی مہارت پیدا کی۔ لمعہ علم طب سے بھی واقف تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کی اور اسی محکمہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ حیدرآباد میں آپ کا گھر دارالشفاء کے قریب جام باغ کے مقام پر تھا۔ آپ کی اولاد میں ایک فرزند ابوالحسن سید مہدی تھے۔ آپ کا وصال (۶۰) سال کی عمر میں ۱۹۲۴ء میں ہوا(۱)

جناب لمعہ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے دادا میر احمد علی خاں شہید دہلوی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ جناب لمعہ اپنے والد شعلہ سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ کا کلام نہایت صاف اور شگفتہ تھا۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کا ایک قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ مینوسکرپٹ) میں محفوظ ہے۔ آپ نے شاعری کے علاوہ ایک منظوم اضافت رسالہ جاری کیا اور ''مراۃ العروض'' کے نام سے ایک کتاب قواعد شاعری پر شائع کی۔ دوسری تسہیل المعنی، تیسری لنگڑا شیطان، چوتھی معیار الاضافتہ، پانچویں جواہر الاشعار، چھٹی تخمیس لمعہ ہے۔ یہ سب کی سب شائع ہو چکی ہیں۔

غزل کے چند اشعار نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔ پہلے ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

رباعی

پختہ جو ہوا ثمر تو خامی کے بعد
عزت ملی یوسف کو غلامی کے بعد

حاصل ہوا لمعہ خضر کو آبِ حیات
یک جرعہ ہزار تشنہ کامی کے بعد

غزل کے اشعار

انہیں اس روز سے مشق ستم ہے　　نہ تھی جب ابتدا لوح و قلم کی
ترے کوچے کو جب مسند بنایا　　زیارت کر چکے دیر و حرم کی
مسجد کو ہم نجائیں گے میخانہ چھوڑ کر　　پیماں شکن بنیں گے نہ پیمانہ چھوڑ کر

جناب نصیرالدین ہاشمی اپنی تصنیف دکن میں اردو میں جناب لمعہ حیدرآبادی کی ایک نظم درج کرتے ہیں جس کا عنوان ''زنگی اور آئینہ'' ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کسی زنگی نے اک آئینہ رستے میں پڑا پایا
نظر آئی جب اس کی شکل زشت اس میں تو گھبرایا
وہ چپٹی ناک وہ نتھنے کشادہ ہونٹ وہ موٹے
وہ چوڑے دانت جن پر ہو گماں غول بیاباں کا
ہوئیں یہ دیکھ کر غصے سے اس کی لال لال آنکھیں
تھا کالا کوئلہ پہلے بنا اب سرخ انگارا
لگا مارسیہ کی طرح کھانے پیچ و تاب اس دم
برائی اپنی صورت کی قصور آئینہ کا سمجھا
رہی بالکل نہ تاب ضبط جب اس کو تو گھبرا کر
زمیں پر آئینہ پٹکا چڑھا کر ناک بھوں بولا
اسی سے تو کسی نے راستے میں اس کو پھینکا ہے
نظر آتی ہے اس میں کیا بری ہیئت مڑا چوڑا
جو اپنے عیب سے غافل ہیں ان کی ہے یہی حالت
خفا اے لمعہ ہو اس سے بتائے عیب جو ان کا (۲)

بعد کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ نوازش علی خاں لمعہ اپنے والد کے انتقال کے بعد نظم طباطبائی سے رجوع ہوئے اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے (۳)

لمعہ نے صنف غزل کے علاوہ رباعیات بھی کثرت سے لکھی ہیں۔نمونے کے طور پر یہاں دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

رباعی

دنیا مردار، اہل دنیا کلاب
کرتے ہیں خوشامد امیر و نواب
اے لمعہ کبھی کسب تو کل کو نہ چھوڑ
پہنچاتا ہے رزق سب کو رب الارباب

دیگر

رو دھو کے لڑکپن کا زمانہ گزرا   ایام شباب کو بھی جوں توں کاٹا
پیری میں گرا پہاڑ سر پر ایسا   ہم جھک گئے لمعہ بار یہ اٹھ نہ سکا

☆☆

(۱) سلیمان اریب، حیدرآباد شاعر،۱۹۶۴ء، صفحہ (۳۵)
(۲) نصیرالدین ہاشمی۔دکن میں اردو، دہلی۔۱۹۸۷ھ، صفحہ (٦١٧)
(۳) صاحب حیدرآبادی، دکن میں رباعی گوئی، حیدرآباد، صفحہ (٢١٨،٢١٧)

ڈاکٹر احمد حسین مائل

آپ کا نام احمد حسین اور تخلص مائل تھا مائل کی پیدائش ۱۲۷۴ھ میں مدراس میں ہوئی۔ مائل اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائے۔ان کے والد حاجی محمد رضا حسین رضا اور صرف خاص میں میر منشی تھے۔ مائل کا خاندانی سلسلہ شمالی ہند میں قاضیاں گوپا موسے اور ننھیال مدراس کے والا جاہی خاندان سے ملتا ہے۔ مائل کی ابتدائی تعلیم اپنے سرپرست کی نگرانی میں ہوئی۔ انہوں نے انگریزی کے علاوہ سائنسی علوم میں بھی مہارت حاصل کی۔ انٹر کامیاب کرنے کے بعد مدرسہ طبابت میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی اور ۱۲۹۲ھ میں ڈاکٹری کی ڈگری ملی۔ایلو پیتھک کے علاوہ مائل طب یونانی اور ہومیو پیتھک سے بھی واقف تھے۔(۱) محکمۂ طبابت میں ملازمت شروع کی اور مملکت آصفیہ کے ہر ضلع میں انہیں کام کرنا پڑا۔آخر میں وظیفہ سے تین سال قبل حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ پھر تا حیات یہیں مقیم رہے۔ مائل غریب مریضوں کو بمبئی سے دوا منگوا کر مفت دیا کرتے تھے۔نہایت نیک شریف النفس ڈاکٹر تھے۔وظیفہ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے حضرت آغا داؤد صاحب سے بیعت حاصل کی اور اکثر اوقات ذکر واذکار کی محفلوں میں بیٹھ جاتے اور مراقبہ میں بھی دن گزارتے حیدرآباد میں انہوں نے اپنے پیرومرشد کی درگاہ کے قریب آغا پورہ کے ایک مکان میں سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد فالج میں مبتلا ہوگئے اور تقریباً دو سال بیمار رہنے کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۳۲ھ کو وفات پائی اور اپنے مرشد کی درگاہ کے قریب مدفون ہیں۔

آپ کے دو فرزند تھے ایک مبارک احمد فاروقی اور دوسرے جمال احمد فاروقی۔

مائل جناب وصفی کے شاگرد تھے(۲)ان کی شاعری میں تمام اصناف ملتے ہیں۔
مائل اپنے وقت کے قادرالکلام شاعر گزرے ہیں۔انہوں نے شمالی ہند کے مشہور شعرا کی غزلوں کی زمینوں میں اپنی طویل غزلیں لکھی ہیں جن میں میر،سودا،ذوق،انیس،جرات، امیراورداغ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔مائل نے پندرہ ہزار اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔کچھ کلام دوسروں کو بھی دیا تھا جو بعد میں دستیاب نہیں ہوسکا۔۱۳۲۱ھ تک مائل کے تین دیوان شائع ہوچکے تھے۔مائل نے دولغات بھی مرتب کئے(۱) پہلا"نورظہور" دوسرا(۲)"ظہور نور" نام سے شائع ہوئے اس کے علاوہ انہوں نے"تحفہ دکن" کے نام سے ایک دیوان مرتب کیا جس میں ہرصنف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔یہ مجموعہ تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔اسے ۱۳۱۴ھ میں شائع کیا۔تحفۂ دکن کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہرغزل پر مصنف کی وہ عمردرج ہوتی تھی جو اس کی تصنیف کے وقت تھی اس کے علاوہ انہوں نے اپنے پیرومرشد کی فرمائش پر ایک نعتیہ کلام کا مجموعہ عمر کے آخری دنوں میں مرتب کیا۔مائل کے اس مجموعہ کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے بعض غزلیں دوغزلہ اورسہ غزلہ کی صورت میں لکھیں اور بعض غزلوں میں تو انہوں نے سو سے زیادہ اشعار لکھے ہیں۔
مائل سنگلاخ زمینوں میں بھی شعر لکھا کرتے تھے۔انہوں نے جس ماحول میں شعروسخن کی محفل سجائی وہ داغ کی شہرت کا زمانہ تھا مائل کو اس دور کے لوگ شاعر ماننے سے انکار کرتے تھے جس کا مائل کو رنج تھا۔ایک شعر میں اس بات کا شکایت کرتے ہیں۔

مائل جو قد داں سفارش ملا تو کیا
مجھ کو تو قدر دان سخن کی تلاش ہے
قدر مائل کی ہو کیونکر کہ ہے مائل دکنی
وہ دکھاتا ہے یہی عیب ہنر سے پہلے
نشوونما پائی ہے دکن میں قدر ہماری کیونکر ہوگی
گھر کی مرغی دال برابر کس کو دکھائیں اپنا ہنر ہم

مائل کو اہل دکن ہونے پر ناز تھا۔اپنے دکنی ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔شمالی

ہند کے اکثر شاعر مائل کے قدرداں تھے۔ اردو کے علاوہ انہوں نے فارسی میں بھی شعر کہے اور اپنے والد سے اپنے کلام پر اصلاح لی (۳)

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی ۱۹۷۸ء، صفحہ (۵۶۱)

(۲) ڈاکٹر زور مضمون مشمولہ، مرقع سخن، جلد اول، ۱۹۳۵ء، صفحہ (۲۳۴)

(۳) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، حیدرآباد۔۱۳۱۹ھ، شعرائے نازک خیال، صفحہ (۱۶۰)

سید خوند میر متین

سید خوند میر نام اور تخلص متین تھا۔ متین فرقہ مہدویہ کے بزرگ گزرے ہیں پیدائش کا سنہ معلوم نہ ہو سکا۔ پیدائش حیدر آباد میں ہوئی۔ متین کی شاعری سطحی خیالات سے بالکل پاک تھی۔ آپ کا انداز بیان صوفیانہ اور انداز بیان ناصحانہ تھا۔ کلام کی سنجیدگی اور متانت کے لحاظ سے حقیقت میں آپ متین تھے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ کی رباعیات کا مجموعہ ''صد برگ متین'' کے نام سے شائع ہوا۔ مگر دستیاب نہیں ہے(۱) چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

جام وحدت کو پی کے مدہوش رہو
یادِ حق سے نہ تم فراموش رہو
اتنا تو کرو جناب من کم سے کم
گر ذکر نہ ہو سکے تو خاموش رہو

بے پردہ متین اس کی ہے ذات دید
لیکن اس کے لئے بڑی شرط ہے دید
اندھا کب خاک دیکھ سکتا ہے اسے
تاباں عالم پہ ہے اگر خورشید

تیرے اصحاب سب تھے اہل تحقیق
فاروقؓ، وغنیؓ و مرتضیٰؓ، صدیقؓ

مقبول خدا تھے برگزیدہ سب تھے
باخبر تھے باخدا تھے اور ذی توفیق(۲)

☆☆

(۱) رسالہ المصدق، حیدرآباد، جلد اول، ۱۳۳۲ھ، صفحہ (۳۱)
(۲) رسالہ المصدق، حیدرآباد، جلد دوم، ۱۳۳۳ھ، صفحہ (۲۸)

محبّ حسین محبّ

نام محب حسین اور تخلص محب تھا۔محب کی ولادت ۱۸۳۹ء میں اٹاوا میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اٹاوا ہی میں مکمل ہوئی۔ وہیں ایک اسکول میں ملازمت شروع کی۔عہد محبوبیہ میں سرکار آصف جاہ سادس کی علم دوستی سے متاثر ہو کر دوسروں کی طرح محب حسین بھی حیدرآباد وارد ہوئے اور محکمۂ مال میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔تقریباً تیس سال مختلف محکموں میں مترجم رہ کر آخر ۱۹۰۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

جناب محب پکے کانگریسی تھے۔بادشاہت پسند نہیں کرتے تھے۔ان کی تمام زندگی قومی بیداری، سماجی شعور اور سیاسی بصیرت کو عام کرنے میں گزری۔محب حسین نے دکن میں آزادیٔ فکر وعمل کا پرچم بلند کیا۔تجدد اور اجتہاد کی جو مشعل محب حسین کے ہاتھ میں تھی وہ شرار افغانی کا ایک کرشمہ تھی۔جب مولانا جمال الدین افغانی کا قیام حیدرآباد میں تھا اسی زمانے میں ان کے مشورہ پر انہوں نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔پہلے معلم پھر شفیق ۱۸۸۰ء میں جاری کیا۔۱۸۹۴ء میں ''معلم نسواں'' کا اجرا کیا۔بعد ازاں علم وعمل کے نام سے ایک اور رسالہ ۱۹۰۴ء میں اپنی ادارت میں نکالا (۱)

محب حسین کانگریس کے طرفدار یک قومی نظریہ کے حامی تھے۔محنت کش طبقات کے ترجمان، حقوق نسواں کے محافظ، صحافتی آزادی کے علمبردار اور سماجی اصلاح کے مبلغ تھے۔یہ خوبیاں ایسی ہیں جو ان کے کسی ہمعصر میں نظر نہیں آتیں۔حیدرآباد کی صحافتی تاریخ میں ان کا نام سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔جناب محب نے اپنی تمام زندگی اسی جدوجہد میں گزرنے کے بعد ۱۳۴۸ھ م ۱۹۲۹ء کو (۸۰) سال کی عمر میں وفات پائی۔

جناب محبّ صرف ایک کامیاب صحافی ہی نہیں تھے بلکہ ایک پر گو شاعر بھی تھے۔

حضرت داغ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ استاد داغ کے کلام میں اور محبؔ کے کلام میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ محبؔ ایک کامیاب مترجم تھے۔ ان کے تراجم میں سوانح امیر علی ٹھگ، میرا پہلا جرم، سوانح عمری جان ہاورڈ، سوسائٹی اور گورنمنٹ اور فلسفہ ازدواج قابل ذکر ہیں۔

جناب محبؔ کی شاعری میں آزاد خیالی نمایاں ہے۔ نمونہ کے طور پر ان کی نظموں سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

ہماری قوم بھی ضدی بڑی ہے — پرانی ریت رسموں میں پر اڑی ہے
عجب مشاطہ ہے تعلیم نسواں — یہی سرمہ ہے مسی ہے دھڑی ہے
ہمارے حال پر روتا ہے بادل — ہمیں بارش پہ اشکوں کی جھڑی ہے
(۲)

علم کا ہندوستاں میں قدرداں ملتا نہیں — فلسفی کا اس جگہ نام و نشاں ملتا نہیں
جس کو دیکھو وہ مثال آسیا چکر میں ہے — چین اک دم بھی یہ زیر آسماں ملتا نہیں

محبؔ کی شاعری میں اجتہاد نمایاں ہے۔ نمونہ کے طور پر ذیل کے شعر دیکھئے۔

عبادت تو بہت کی حور و جنت کے لئے واعظ
کیا ہے بے غرض احسان تو نے بھی تو انساں پر

بڑھاپے میں یہ کمسن بیویاں کیا زیب دیتی ہیں
مسلط ایک بوڑھا دیو ہے گویا پرستاں پر

ان کے ایک نظم کے شعر میں تخلص کس خوبی سے استعمال ہوتا ہے۔

جب خدا ترجیح دے بیٹی کو بیٹے پر محبؔ
کیوں نہ ہوں مردوں سے پھر بالا برتر عورتیں

☆☆

---

(۱) زینت ساجدہ، حیدر آباد کے ادیب، جلد دوم، حیدر آباد ۱۹۶۲ء، صفحہ (۴۳۰)

(۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی ۱۹۸۴ء، صفحہ (۶۲۵)

حکیم میر مظفرالدین خان مزاج

آپ کا نام محمد مظفرالدین خان اور تخلص مزاج تھا۔ ۱۲۳۱ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم اپنے والد کے زیر سایہ حاصل کی اور پھر علم طب کی تعلیم کی تکمیل کی اور اس فن میں اتنی مہارت حاصل کی کہ حیدرآباد کے ماہر اطبا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ مزاج پائیگاہ خورشید جاہ کے خاندانی طبیب تھے اور وہاں سے منصب حاصل کرتے تھے۔ مزاج کی صرف ایک اولاد نرینہ تھی۔ جن کا نام حکیم منورالدین خان علاج تھا۔ منورالدین خان علاج نے اپنے والد کا ضعیفی میں ساتھ چھوڑ دیا۔ جس کا مزاج کو سخت رنج تھا۔ چنانچہ وہ آخری ایام میں بہت مایوس ہوگئے۔ زندگی سے بیزارگی محسوس کرنے لگے۔ مگر انہوں نے طویل عمر پائی اور ستیاسی سال کی عمر میں ۱۳۱۸ھ میں انتقال کرگئے (۱)

مزاج حضرت فیض کے شاگرد تھے اور اس پر انہیں فخر تھا۔ اس بات کا اشارہ مزاج نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

آتی ہے بوئے فیض سخن سے ترے مزاج شاید جناب فیض سے تو مستفید ہے۔

مزاج نے حضرت فیض کی صحبت میں تقریباً تیس سال کا عرصہ گزارا اور ان سے اصلاح لیتے رہے۔ مزاج کے چار ضخیم قلمی دیوان کتب خانہ نواب عزیز یار جنگ کے پاس محفوظ تھے۔ لیکن اب نہ جانے کہاں ہیں۔ اس کے علاوہ مزاج کا ایک مطبوعہ دیوان بھی ہے۔ جو اب دستیاب نہیں ہے۔ مزاج کا کلام نہایت سادہ اور سلاست سے سرشار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اشعار ان کی زبان سے بے ساختہ نکل رہے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

جان گئی عشق میں کچھ غم نہیں حق محبت تو ادا ہوگیا
خاک نشینی نے کیا سرفراز نقش قدم راہنما ہوگیا

مزاج کے کلام میں شروع سے ہی قنوطیت اور درد و الم نمایاں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزاج ایک طرح سے قنوطی شاعر تھے۔ (اشعار کے نمونے)

مزاج خواجہ میر درد کے کلام سے کافی متاثر تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

یوں تو ہر شاعر ہے فرد اپنی طرح میں اے مزاج
ہے دوا ہر درد کی دیوان خواجہ میر ایک

مزاج کی غزلوں میں تصوف کے بھی مضامین ملتے ہیں۔

یہی عبدیت کے بھیس میں کہتے ہیں سب خدا
بندہ ہے کون کون خدا ہے خبر نہیں
وہ کون سی جگہ ہے کہ تو جلوہ گر نہیں
افسوس ہے کہ بے خبروں کو خبر نہیں

مزاج زبان کو علاقوں کی حد بندیوں میں قید کرنے کے قائل نہ تھے۔ شمال و جنوب کے فرق کو مٹا دینا چاہا۔

ذیل میں مزاج کی غزلوں کے چند منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے رنگ اور ان کے کلام کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پیدا بتوں کے عشق سے عشق خدا ہوا — آئینہ مجاز حقیقت خدا ہوا
مقصود شکل عجز میں صورت نما ہوا — دست دعا ہی آئینہ مدعا ہوا
ایمان سے ہاتھ اٹھا کے بتوں پر فدا ہوا — کم بخت میرے دل کو خدا جانے کیا ہوا
کیا خاک منہ دکھائیں خدا کو ہم اے مزاج — ہم سے نہ کوئی کام یہاں کام کا ہوا (۲)

☆☆

(۱) سید عباس متقی، قاضی احمد علی قاضی، مقالہ ایم فل، حیدرآباد، ۱۹۸۸ء، صفحہ (۵۶)
(۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ (۵۷۴)

نثار یار جنگ مزاج

آپ کا نام سید نثار احمد اور مزاج تخلص تھا۔مزاج کی ولادت ۱۸۸۰ء میں علی گڑھ میں ہوئی۔ جناب مزاج کاظم علی باغ کے سگے چھوٹے بھائی تھے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی۔عربی، فارسی میں بھی کمال پیدا کیا۔بچپن ہی میں اپنے والد کے ہمراہ حیدرآباد منتقل ہوگئے۔تعلیم کی تکمیل حیدرآباد میں ہوئی۔بعد ختم تعلیم انہوں نے اضلاع مملکت آصفیہ میں گتہ داری کا کام شروع کیا مگر زیادہ عرصہ تک نہیں کر سکے۔جب سر علی امام وزارت اعلیٰ پر فائز ہوئے تو مزاج ان کے سکریٹری مقرر ہوگئے اور یہیں سے ترقی کر کے اول تعلقدار (کلکٹر) ہوگئے۔اسی عہدے سے وظیفہ حاصل کیا(۱)۔تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہوگئے۔وہاں پانچ سال تک زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

جناب مزاج کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔وہ بھی اپنے بھائی کی طرح حضرت داغ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔مزاج بڑے زندہ دل شاعر تھے۔انہوں نے مہمان نوازی میں بڑی شہرت حاصل کی۔مزاج کے کلام میں غزل، رباعی، نوحہ قصیدہ اور مرثیہ ملتا ہے۔مزاج کے کلام کا مجموعہ 'کیفیات' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا(۲)

مزاج کی کلیات میں غزلوں کی تعداد ہی زیادہ ہے۔ذیل میں نمونہ کلام درج ہے۔

چنگاریاں بھری ہیں ہر ایک موئے تن میں
ڈر ہے کہ لگ نہ جائے پھر آگ پیرہن میں

سبزہ لہک رہا ہے غنچے چٹک رہے ہیں
کس کا ہے خیر مقدم کون آگیا چمن میں

کچھ مہرباں ہوئے ہیں وہ اے مزاج تجھ پر
کچھ ہو چلی ہے پیدا گرمی ترے سخن میں

ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تری چشم فسوں گر کا تماشا ہم بھی دیکھیں گے
نگہہ پھرتے ہی پھر جاتی ہے دنیا ہم بھی دیکھیں گے
الٰہی شرم رہ جائے مرے جیب و گریباں کی
وہ کہتے ہیں کہ وحشت کا تماشا ہم بھی دیکھیں گے
مزاج اللہ کی رحمت سے ہو مایوس ارے توبہ
خدا چاہے تو ارض پاک بطحا ہم بھی دیکھیں گے

مزاج کی غزلوں میں جو داغ کا رنگ ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھئے۔

اب وہ نالے نہیں، وہ شورش و فریاد نہیں
اف تری یاد کہ اب کچھ بھی مجھے یاد نہیں(۲)

☆☆

(۱) نوراللہ محمد نوری، داغ دہلوی، حیدرآباد، ۱۳۵۵ھ۔ صفحہ (۱۸۹)
(۲) سلیمان اریب، حیدرآباد کے شاعر، ۱۹۶۲ء۔ صفحہ (۴۷)
(۳) نوراللہ محمد نوری، داغ دہلوی کی سوانح، ۱۳۵۵ھ۔ صفحہ (۱۹۰)

حافظ محمد مظہر۔ مظہرؔ

نام محمد مظہر اور تخلص مظہر تھا۔ آپ کی ولادت ۱۵ر رمضان ۱۳۰۱ھ م ۹ر جون ۱۸۸۴ء کو محلہ رائی پیٹھ مدراس میں ہوئی۔ بچپن ہی میں اپنے والدین کے ساتھ حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ (۱۰) سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا پھر مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہو گئے (۱) تعلیم مکمل کرنے کے بعد جناب مظہر محکمۂ پولیس میں عارضی طور پر ملازم ہو گئے، ماہانہ تیس روپے تنخواہ پاتے تھے۔ پانچ سال بعد اسی محکمہ میں مستقل ملازمت مل گئی۔ وہاں سے آپ کا تبادلہ محکمۂ طبابت میں ہو گیا۔ یہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔ جناب مظہر کی بہتر کارگزاری پر انہیں ڈھائی سال کی توسیع بھی دی گئی (۲) وفات حیدر آباد ہی میں ہوئی۔

شاعری کا شوق مظہر کو بچپن سے تھا۔ آپ نوجوانی کی عمر سے ادبی مضامین لکھا کرتے تھے جو مخبر دکن اور جریدہ روزگار میں شائع ہوتے تھے۔ رسالہ صحیفہ ماہانہ جو ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا تھا اس میں مستقل طور پر سیاسی اور تاریخی موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔ رسالہ صحیفہ کے ماہانہ سے روزنامہ ہو جانے پر بھی تحریر کا یہی سلسلہ تین سال جاری رہا۔

آپ کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ درج ذیل ہے۔

۱۔ جناب مظہر نے ''دارالعلوم کے سپوت'' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں ایک کتاب شائع کی جو (۹۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایسی (۱۹) شخصیات کے حالات زندگی و ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے جو ''عہد محبوبیہ'' کے نامور شاعر وادیب تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے یہ کتاب شائع کی۔

۲۔ سیرت مصطفویؐ کے نام سے ایک سوانح حیات حضور اکرمؐ کے تعلق سے شائع کی۔

۳۔ ''اخلاق رسالت پناہی'' نام سے ایک کتاب حضور صلعم کی سیرت پر شائع کی۔

۴۔ "عہد آصفیہ کے مسائل دستور آصفی" کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی دستور آصفی پر محیط ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے کئی مضامین لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ مظہر ایجوکیشنل کانفرنس کی روح رواں تھے۔ وظیفہ پر علیحدہ ہونے کے بعد کانفرنس کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ علاوہ ازیں ایک رسالہ روح ترقی بھی شائع کیا جوان کی زندگی تک جاری رہا۔ افسوس کہ ان کا کلام باوجود تلاش بسیار دستیاب نہیں ہو سکا۔

☆☆

(۱)،(۲) حفیظ قتیل، راہ اور کارواں، حیدرآباد ۱۹۵۵ء، صفحہ (۱۱۶)

حضرت محمد مظفرالدین معلیٰ

نام محمد مظفرالدین تھا اور معلیٰ تخلص فرماتے تھے آپ کے جد اعلیٰ مولوی غلام محی الدین صاحب مشہور اتالیق تھے۔انہوں نے نواب ناصرالدولہ آصف جاہ ثانی کی ہمشیرہ شہزادی کمال انساء بیگم کو بھی پڑھایا تھا۔حضرت معلیٰ کے دادا محمد بہاؤالدین کا عقد حضرت ابوالفتح محمد شمس الدین عرف ملتانی بادشاہ کے گھرانہ میں ہوا تھا۔(۱) حضرت معلیٰ اپنے والد جناب محمد علی الدین صاحب کے گھر ۱۲۵۵ھ میں اورنگ آباد میں تولد ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے گھریلو ماحول میں حاصل کی کچھ عرصہ بعد علم کا شوق دامن گیر ہوا۔اور حیدرآباد تشریف لائے۔پہلے مولوی محمد یعقوب حیدرآبادی سے علم حاصل کیا۔پھر مولوی زماں خان صاحب شہید کے مدرسہ میں شریک ہوئے۔یہاں آپ کے ہم مکتب شہزادگان اور خود بادشاہ وقت نواب آصف جاہ سادس تھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد محکمۂ مال سے وابستہ ہوئے۔آپ دیانتدار اور نیک سیرت تھے۔اس وجہ سے چند ماہ کے بعد نواب مختار الملک سالار جنگ اول نے سرشتہ ٹسپ کا انتظام آپ کے سپرد کر دیا۔اس محکمہ میں آپ نے بہت اچھے انتظامات کروائے۔وظیفہ پر علیحدگی کے بعد ناظم حجاج کی اعزازی خدمت انجام دیتے رہے۔حضرت معلیٰ نہایت خلیق مزاج، حلیم الطبع، ذی مروت اور علم دوست بزرگ گزرے ہیں۔پہلی مرتبہ انہوں نے ۱۲۹۵ھ میں فریضۂ حج وزیارت مدینہ شریف ادا کیا۔نواب محمد انواراللہ خاں صاحب فضیلت جنگ اور حافظ محمد شجاع الدین صاحب قبلہ اور دیگر قابل احترام حضرت آپ کے ہم رکاب سفرِ حج میں تھے۔اس کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت کی۔

حضرت معلیٰ نے بہت کم عمری میں شاعری شروع کی۔عروض سے اچھی طرح واقفیت تھی اور اس میں اعلیٰ درجہ کے معلومات رکھتے تھے۔اوائل زمانہ شاعری میں آپ کو

حضرت حیدر حسین خان حیدر حیدر آبادی سے تلمذ تھا۔ جو حضرت حفیظ کے فرزند اور فیض کے ہم عصر تھے۔ حضرت معلیٰ اردو کے علاوہ فارسی میں شعرو سخن کا اعلیٰ مزاج رکھتے تھے۔ آپ کے ہم عصر شعرا میں حضرت فیض، حضرت شاہ خاموش، حضرت افتخار حسین وطن، جناب مزاج، عبدالحفیظ پاس، حبیب اللہ ذکا قابل ذکر ہیں۔ عہد محبوبیہ میں حضرت معلیٰ کی قابلیت اور ذہانت کا ہر کس و ناکس معترف تھا۔ آپ کا شمار حیدر آباد دکن کے صف اول کے شعرا میں ہوتا تھا۔ آپ کے شاگردوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ جن میں خاص کر راجہ کشن پرشاد شاد یمین السلطنت آصفیہ قابل ذکر ہیں۔

شاد آپ کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ وہ فخریہ کہتے ہیں۔

تم معلیٰ کو نہیں پہچانتے
شاعری میں شاد کا استاد ہے(۲)

جناب معلیٰ کے کلام میں نعت، منقبت رباعی قطعات اور غزلیں ملتی ہیں۔ نعت گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ نعت کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

یہ نہ سمجھو کہ نبی ملنے سے کیا ملتا ہے — بخدا ان کے ہی ملنے سے خدا ملتا ہے

حضرت معلیٰ نے اپنی زندگی میں قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ جو انتہائی سلیس اور بامحاورہ ہے۔ یہ ترجمہ آپ کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ حضرت معلیٰ نے قصیدہ بردہ شریف کا بھی اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی شاعری کا دیوان "ریاض معلیٰ" کے نام سے ملتا ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ نعتیہ کلام پر محیط ہے دوسرا حصہ عشقیہ شاعری پر ہے جو عشق حقیقی سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرا حصہ فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ ذیل میں آپ کی غزل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

وہم کی کیا دوا کرے کوئی — بدگمانی کو کیا کرے کوئی
ان بتوں سے ستم شعاری کا — لے تدارک خدا کرے کوئی
اے معلیٰ یہی دعا ہے میری — مجھ سے مجھ کو جدا کرے کوئی(۲)

(۱) امتہ السلام عالمہ، آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء مقالہ ایم فل، حیدر آباد، صفحہ (۳۳۹)
(۲) محمد شریف الدین، انتخاب کلام، ارض معلیٰ، صفحہ (۱۵۱)

امتہ الفاطمہ بیگم منعم

نام امتہ الفاظ بیگم اور تخلص منعم تھا۔ ولادت ۱۲۸۲ھ میں حیدر آباد میں ہوئی آپ کی شادی عبدالسلام تحصیلدار سے ہوئی۔ منعم اپنے کلام پر جناب داغ دہلوی سے اصلاح لیتی تھیں۔ رسالہ ''انساء'' میں آپ کا کلام شائع ہوتا تھا۔ انہوں نے شاعری میں تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔

نمونہ کے طور پر آپ کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مبارک عید قرباں آئی ہے، ہر ایک شاداں ہے
خدا کی رحمتوں سے شادماں ہر اک مسلماں ہے
گرانی سے پراگندہ تھے محتاج و غنی سارے
کیا خالق نے فضل اپنا اسی کا لطف و احساں ہے
الٰہی ملک و مالک کو مبارک عید قرباں ہو
رہیں آباد سب باہم یہی منعم کا ارماں ہے

☆☆

(۱) رسالہ النساء، محبّ حسین حیدر آباد، صفحہ ۲۱

سید منور میاں منوؔر

نام سید منور میاں اور تخلص منور تھا۔منور کی ولادت ۱۲۵۰ھ میں حیدرآباد میں ہوئی آپ کے والد کا خاندانی سلسلہ فرقہ مہدویہ کے پیرو مرشد سے تھا۔منور میاں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ رشد و ہدایت اور پیری و مریدی سے آراستہ تھا چنانچہ گھریلو ماحول ہی میں تعلیم حاصل کی اور اپنے والد کے ساتھ رشد و ہدایت میں منہمک ہوگئے۔بچپن ہی سے منور میاں نے ''ترک دنیا'' کر دی تھی (۱) آپ کی وفات کا سنہ معلوم نہ ہوسکا۔کاچی گوڑہ میں مدفون ہیں۔آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔راقم کو یہ تمام حالات اور کلام ان کے ماموں زاد بھائی سید یعقوب میاں کے پوتے سید معین الدین صاحب سے فراہم ہوئے۔جن کی عمر اس وقت (۷۰) سال کی ہے۔علم دوست ہیں۔پسندیدہ شخصیت ہیں۔(۱)

جناب منور کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا مگر کبھی وہ اس جوہر کے مبلغ نہیں رہے۔آپ کے دیوان ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی کی نذر ہوگئے آپ کا باقی کلام انقلاب زمانہ کے ہاتھوں تلف ہوگیا۔ان کے کلام کا ایک قلمی نسخہ ان کے عزیز سید معین الدین صاحب کے یہاں موجود ہے۔اس کا ایک قطعہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

ادھر سے آتا ہے نیچر کی فوج کا سالار — طلوع ادھر سے ہوا ہے ستارہ دمدار
یہ دونوں نحس قدم شہر کو کریں گے تباہ — مدد کرو بخدا جلد حیدر کرار

نیچر اس زمانے میں عوام انگریز کو کہتے تھے اور جناب منور کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔منور اپنے وقت کے قادرالکلام شاعر تھے۔وہ فارسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ان کے قلمی دیوان میں فارسی قطعات کی کثرت ہے۔

(۱) فرقہ مہدویہ میں یہ اصطلاح عام رائج ہے۔ترک دنیا کا مطلب دنیا کے تمام

عیش و آرام چھوڑ دینا اور صرف راہِ خدا سے واسطہ رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت دن رات کرنا، فقر و فاقہ پر اکتفا کرنا، کوئی مرید یا منعقد کھانا لائے تو کھالینا ورنہ کسی پر اپنی ضرورت ظاہر نہ کرنا صرف اللہ کے اصول اور امام مہدی کی پیروی کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام مندرجہ صفات کا نام ترک دنیا ہے (راقم الحروف)

☆☆

(۱) انٹرویو سید معین الدین نبیرہ سید یعقوب میاں اہل حیدرآباد

پنڈت سورج بھان میکشؔ

آپ کا نام سورج بھان اور تخلص میکش تھا۔ ۱۲۷۶ھ میں مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ اوائل شباب ہی میں درویشانہ زندگی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ جوگیوں کی صحبت اختیار کی۔ انہیں دنیاوی زندگی سے کسی قسم کا لگاؤ نہ تھا۔ میکش نے میر امداد علی علوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ مگر جب امداد علی علوی حیدر آباد تشریف لائے تو ان کے فراق میں میکش بھی حیدر آباد پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے سلسلہ چشتیہ، نظامیہ اور قلندریہ میں شمولیت اختیار کی اور سردار بیگ صاحب کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گئے اور اپنا نام سورج بھان سے "سجاد علی" رکھ لیا۔ سردار بیگ صاحب نے میکش کا تقویٰ، عبادت اور ریاضت دیکھ کر انہیں "شمس الحق" کے لقب سے نوازا۔ میکش کا انتقال ۱۳۵۵ھ میں ہوا(۱)

میکش ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ نے اپنی یادگار چھ دیوان چھوڑے ہیں۔

(۱) میخانۂ عشق (۲) خمار خانہ میکش (۳) جوش میکش (۴) شراب الصالحین (۵) پیمانۂ میکش شائع ہو چکے ہیں۔

میکش کا زیادہ تر کلام تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ آپ کے دیوان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا زیادہ تر کلام حمد اور نعت پر مشتمل ہے۔ بطور نمونہ ذیل میں چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

عالم میں صنم گرم وہ بازار ہے تیرا
یوسف کو بھی دیکھا تو خریدار ہے تیرا

ہر رگ و پے میں رواں تھا، مجھے معلوم نہ تھا
دل میں تھا جسم میں جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

وہی میکش وہی ساقی تھا، وہی بادہ فروش
اور وہی پیرمغاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا(۲)

میکش کے صوفیانہ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ یہ کیا بلا ہے عشق
میں تو یہی کہوں گا کہ شاید خدا ہے عشق
اس کے ہی دم سے اپنی رسائی ہے ذات تک
ہادی ہے رہنما ہے یہی پیشوا ہے عشق

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکھنی ہندو اور اردو، حیدرآباد، ۱۹۵۲ء۔ صفحہ (۱۳۱)
(۲) امتہ السلام (مقالہ) ایم فل۔ آصفجاہی عہد کے صوفی شعراء۔ صفحہ (۳۰۰)

سید عیسیٰ مہدوی

نام سید عیسیٰ اور تخلص مہدوی تھا۔ مہدوی کی ولادت ۱۲۹۵ھ م ۱۸۷۸ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد سید شہاب الدین جمعدار فضل الدولہ کے عہد میں تھے۔ جناب مہدوی کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ ان کا تعلق فرقہ مہدوی سے تھا۔ اسی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص مہدوی رکھا۔ جناب مہدوی کی مذہبی تعلیم اثر ان کی زندگی پر پڑا۔ وہ علم حکمت سے بھی واقف تھے۔ اس پیشہ کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ حکمت میں مہدوی نے حکیم محمد حسین صاحب سے تجربہ حاصل کیا۔ وہ اپنے گھر پر خانگی طور پر علاج معالجہ کرتے تھے(۱)۔ آپ کے ایک فرزند سید یعقوب تھے۔ جناب مہدوی کی وفات ۱۳۵۰ھ میں ہوئی۔

شاعری میں مہدوی نے حکیم عاشق حسین خاں ہاتف سے استفادہ کیا اور انہیں سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ موصوف نے فارسی اور اردو میں اپنا کلام چھوڑا ہے۔ اردو کی دو مثنویاں مطبوعہ ہیں۔ ایک ''سفینۂ غم'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ دوسری مثنوی کا نام ''بدر شہادت'' تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ زیادہ ملتا ہے۔ انہیں اپنے فرقہ مہدوی کے بانی امام مہدی سے بیحد عقیدت تھی۔ ان کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان کی مدحیہ رباعیات میں بھی تصوف کا رنگ اختیار کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند رباعیات درج ذیل کی جاتی ہیں۔

دلچسپی اگر سخن کی منزل میں رہے
ارمان سخن گوئی نہ کیوں دل میں رہے
جائیں گے وہاں آنکھوں سے اے مہدوی

جب قدر ادب قدر کی منزل میں رہے(۲)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان کے کلام میں امام حضرت مہدی موعود سے عقیدت کا اظہار بہت زیادہ ہے۔ نمونے کے طور پر اشعار ملاحظہ ہوں۔

خوب ہی روزازل سے عہد و پیاں ہوگیا
دل مرا سوجان سے مہدی پہ قرباں ہوگیا
جان وہ ہے احمد مختار پر جو ہے فدا
دل وہ ہے جو حضرت مہدی پہ قربان ہوگیا

صنفِ غزل میں بھی فکر کے جوہر دکھائے ہیں:

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

مزے میں غم ہے،غم میں دل لگی ہے
وہی جانے محبت جس نے کی ہے
بلا ڈھائے گی ہر دم ان کی شوخی
لب رنگیں پہ مسی کی دھڑی ہے
کہانی کیا شب غم کی سناؤں
مرا کہنا تمہاری دل لگی ہے
ذرا اس کا بھی دل میں دھیان رکھنا
تمہارا شیفتہ ایک مہدوی ہے

☆☆

(۱) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند کے رباعی گو شاعر، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۲۹۸)

(۲) صاحب حیدرآبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۲۹۸)

محمد سلمان مہدیؔ حیدر آبادی

نام محمد سلمان اور تخلص مہدی تھا۔ مہدی کی ولادت ۱۸۵۶ء م ۱۲۷۲ھ میں بمقام دہلی ہوئی۔ اجداد خانوادہ حضرت مولانا شاہ غلام علی شاہ روشن ولی صاحب کشف گزرے ہیں۔ مہدی کے والد ۱۲۸۰ھ میں بغرض حج و مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے بمبئی سے ہوتے ہوئے جا رہے تھے۔ والد کے ہمراہ جناب مہدی بھی تھے۔ بمبئی میں شاہ نورالدین صاحب مجددی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مہدی کے والد سے بعد حج حیدر آباد چلنے کی خواہش کی چنانچہ آپ بعہد افضل الدولہ ۱۲۸۱ھ میں حیدر آباد آئے (۱)۔ مہدی کے والد کی قابلیت دیکھ کر افضل الدولہ نے انہیں صدر مدرس دارالعلوم مقرر کر دیا اور دو سو روپیہ منصب سے سرفراز فرمایا۔ جناب مہدی کی باقی تعلیم و تربیت حیدر آباد کے ماحول میں مکمل ہوئی۔ مہدی نے عربی فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ علم فقہ اور دوسرے علوم کے درس کی تعلیم مکمل کر کے دارالعلوم کے طلبہ کو خانگی طور پر معقول و منقول کا درس دیتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد آصفجاہ سادس نے ماہانہ سو روپیہ منصب جاری کیا۔ جناب مہدی کو علم نحو، معانی، بیان، منطق، حکمت، فقہ، تفسیر اور حدیث وغیرہ میں کمال حاصل تھا۔ نواب شمس الملک ظفر جنگ کی فوج میں منشی کے فرائض انجام دینے کے بعد وہیں سے وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔ آپ کے ایک فرزند محمد اکبر علی تھے۔ جناب مہدی کی وفات ۱۳۳۰ھ میں ہوئی۔

جناب مہدی کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے اپنا کلام جناب استاد سالک کو بغرض اصلاح دکھایا تھا۔ شاعری کے علاوہ انہیں نثر نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے عربی اور علمی و فقہی مسائل پر کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ جناب مہدی کے ایک پکے مذہبی شاعر تھے۔ ان کے کلام میں زیادہ تر تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی رباعیات

اور غزلیں سب کی سب تصوف میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند شعر درج ہیں۔

کس قدر بے حوف ہے اللہ اکبر آئینہ
ان کی خود بیں کہہ رہا ہے ان کے منہ پر آئینہ
حسن سارا کردیا خود بیں کے اوپر آئینہ
ہوگیا ہے خستہ حال ان کا ستمگر آئینہ
وہ تو قصہ زندگی کا پاک ہی کرنے کو ہیں
لہو ہمارا ہوگیا ہم پر مقدر آئینہ
اپنے عاشق ہوگئے وہ اب چلو چھٹی ہوئی
عشق ہے مہدی کا ہادی، ان کا رہبر آئینہ

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر ہفتم، حیدرآباد، صفحہ (۱۵۳)

نواب محمد مہدی خاں مہدیؔ

ان کا اصلی نام نواب میر محمد خاں تھا۔ مہدی تخلص کرتے تھے۔ مہدی ۱۲۷۷ھ میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدِ اعلیٰ نواب مصباح الدولہ دہلی سے آصف جاہ اول کے ساتھ دکن آئے تھے۔ مہدی کے والد حکیم میر روشن علی خاں صاحب جاگیر دار تھے۔ نواب میر مہدی خاں مہدی اپنے والد کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ مہدی نے عربی و فارسی کی تعلیم شیخ محمد علی خراسانی اور سید علی شوستری سے اور اردو کی تعلیم سید محمد صاحب لکھنوی سے حاصل کی تھی۔ انہیں ابتداء ہی سے مذہبی محفلوں اور شعر و سخن کی محفلوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل تھا۔ ان ہی صحبتوں اور محفلوں کی وجہ سے وہ بغیر کسی استاد کے مرثیہ، سلام اور رباعیاں وغیرہ کہنے لگے۔ اعزازی مصنف کی حیثیت سے (۱۴) سال تک بلا معاوضہ اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۳۱۱ھ میں نواب شوکت جنگ اول کی صاحبزادی سے آپ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۳۴۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا(۱)

مہدی پرگو شاعر تھے۔ چنانچہ سید محمد نقی رضوی نے اپنے مضمون میں مہدی کے کلام کے اعداد و شمار دیے ہیں جس کی رو سے مہدی کے کل اشعار کی تعداد ۵۹۹۵۴ ہے(۲)

ان کی تمام تر شاعری اہل بیت اطہار کی مدح سرائی ہے۔ ایک مرثیہ میں طریقہ عزاداری کا ذکر ملاحظہ ہو۔

ہند میں شاہ کے مداح یہی تھے بخدا   جن سے راضی تھے نبی خوش تھیں جناب زہرا
اب سنو میرے بزرگوں کا احوال ذرا   جن سے اس شہر میں ہے تعزیہ داری کی بنا
ان سے پہلے نہ یہ ترکیب عزاداری تھی   نہ یہ ممبر تھا نہ ذاکر تھا نہ یہ زاری تھی

اس کے علاوہ پنجتن کی مدح میں کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

مشہور جہاں فاطمہ زہرا کی ہے عزت — خالق نے عطا کی ہے جسے چادر عصمت
خاتونِ جہاں بنت نبیؐ مبداء عفت — سردار زماں زوجۂ سلطان ولایت
جبریل امیں مدح و ثنا کرتے تھے انکے — تعظیم رسول دوسرا کرتے تھے ان کی
فرزند ہر اک ان کا ہے اللہ کا پیارا — جن کے لیے خالق نے دو عالم کو سنوارا
بخشش کا گنہگاروں کی ہر ایک سہارا — اک زیور کرسی ہے تو اک عرش کا تارا
زہرا کے جگر بند ہیں بیٹے ہیں علی کے — اللہ کے پیارے ہیں نواسے ہیں نبیؐ کے(۲)

ذیل میں مہدی کے مرثیہ کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔اس کی ابتداء بہاریہ مضمون سے ہوتی ہے۔

وہ وقت سحر اور وہ غنچوں کا چٹکنا
پھولوں کا دم صبح وہ کھلنا وہ مہکنا
وہ سبزۂ نو خیز کا صحرا میں لہکنا
وہ گل کے قریں بلبل شیدا کا چہکنا

مہدی کی ایک رباعی بھی پیش کی جاتی ہے۔اس رباعی میں ذات باری تعالیٰ کی حمد ملتی ہے۔

بے مثل تری ذات ہے یکتا ہے تو
لاریب کہ بے عدیل و ہمتا ہے تو
عاجز ہے تری کنہ میں عقل انساں
کیا بندۂ ناچیز کہے کیا ہے تو

مہدی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں جو منقبت لکھی تھی اس کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

سوائے شیر خدا کوئی بو تراب نہ تھا
بجز علی کے کوئی مالک الرقاب نہ تھا
خدا نے یوں تو بہت سے بشر کیے پیدا
مگر علی کا بجز مصطفیٰ جواب نہ تھا

ذیل میں مہدی کے لکھے نوحے کے چند اشعا بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

مومنو جور سپہر کیف پرور دیکھنا
چل گئی باغ نبی میں باد صرصر دیکھنا

لٹ گئی دولت نبی کی کربلا میں ہائے ہائے
کٹ گیا تیغ ستم سے باغ حیدر دیکھنا

چاند سی چھاتی پہ برچھی کھاکے اکبر مرگئے
دل پکڑ کر گر پڑے لاشے پہ سرور دیکھنا

مہدی کا شمار محبوبیہ دور کے ان شعراء میں ہوتا ہے جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عالم، فاضل اور معزز عہدے کے حامل تھے۔ ان کے کلام میں سلاست زبان، سادہ اسلوب، شوکت الفاظ اور لطافت جیسی خوبیاں پنہاں ہیں۔

☆☆

(۱) سید محمد تقی صاحب مضمون مشمولہ، مرقع سخن، جلد دوم، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ (۱۹۶)

(۲)، (۳) سید محمد تقی صاحب مضمون مشمولہ، مرقع سخن، جلد دوم، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ (۱۹۴، ۱۹۶)

نواب محمد وزیرالدین خاں مہؔر حیدرآبادی

نام محمد وزیرالدین اور تخلص مہر تھا۔ مہر کی ولادت ۱۲۷۹ھ م ۱۸۶۲ء حیدرآباد میں ہوئی۔ جناب مہر کے جداعلیٰ نواب محمد اکبرالدین نواب سکندر جاہ کے امرا میں تھے۔ اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے خاندان میں جاگیر اور منصب عہد عثمانیہ تک جاری رہی۔ جناب مہر کی تعلیم امرا کے فرزندوں کی طرح بہت اعلیٰ درجہ پر ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ مہر تعلیم کے بعد نواب خورشید جاہ کے مصاحب میں شامل ہو گئے۔ خورشید جاہ کی جاگیر سے چھ سو روپیہ منصب مقرر تھی (۱) یہ منصب انہیں تاحیات ملتی رہی۔ جناب مہر (۵۶) برس کی عمر میں ۱۳۳۵ھ میں انتقال کر گئے۔

شاعری کا شوق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ وہ اپنے کلام پر شمس الدین فیض سے اصلاح لیتے تھے۔ حضرت فیض کے شاگردوں میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔ ان کا ایک نعتیہ دیوان شائع ہوا ہے۔ جس کا تاریخی نام ''منشور چشتیہ'' ہے۔ اس سے سنہ اشاعت ۱۳۱۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دو دیوان قلمی اپنی یادگار چھوڑے ہیں جو کتب خانہ آصفیہ کی فہرست مخطوطات میں موجود ہے۔ دیوان کافی ضخیم ہیں ان میں حمد، نعت، قصیدے، رباعیات، قطعات اور غزل کے علاوہ دیگر تمام اصناف ملتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر بڑے پرگو شاعر تھے۔ بزرگان دین کی مدح میں ان کے کلیات میں کثیر تعداد میں رباعیات ملتی ہیں۔ رباعیات کا اتنا ذخیرہ شاید ہی کسی اور شاعر کے پاس ہو۔ نمونہ کے طور پر غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

کلیجہ ٹکڑے ہو ہو کر لب فریاد نکلا
تڑپ کر جب کوئی نالہ دل ناشاد سے نکلا

جہاں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے ہر سو لوگ وحشت کو
پتہ آخر کو مہر خانماں برباد سے نکلا

جناب مہر کی رباعیات کا قلمی نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات میں ہے اس کی دو رباعیاں درج کی جاتی ہے جو اس بات کی ضمانت ہیں کہ مہر اپنے دور کے کامیاب رباعی گو تھے۔

جس شخص کو دنیا میں تو کل نہ ہوا
حاصل اس کو عروج بالکل نہ ہوا
عارف کے لئے گوشہ نشینہ ہے ضرور
جو پھول کہ غنچہ نہ ہوا گل نہ ہوا

روزِ مولود صاحب تاج کا ہے
حیرت میں ہیں سب رنگ عجیب آج کا ہے
یہ رات ہے رشک نور خورشید فلک
اس پر سایہ شب معراج کا ہے

☆☆

(۱) صاحب حیدر آبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۲۴۴)

سید اصغر حسین ناجی

نام سید اصغر حسین اور تخلص ناجی تھا۔ ۱۲۵۶ھ میں تولد ہوئے۔ ناجی کے والد میر صلابت علی، نواب فخر الملک اول کے معتمد اسٹیٹ تھے۔ ناجی کی ابتدائی زندگی اپنے والد کی سرپرستی میں گزری، مولوی سید نیاز حسن قبلہ اور مولوی سید محمد علی قبلہ سے فقہ اور عربی کا علم حاصل کیا۔ اثنا عشری مذہب کے پیرو تھے۔ شیعہ عقیدت سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد نواب نظام یار جنگ خانخاناں کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ملازم حاصل کرلی۔ نازک مزاج تھے۔ اسٹیٹ کے دوسرے ملازمین سے ان بن ہوگئی۔ ایک زمانہ تک خانہ نشین ہوگئے۔ جب اسٹیٹ کی تقسیم ہوئی یعنی نواب فخر الملک کی جائداد تقسیم ہوگئی تو ناجی ان کے فرزند فخر الملک ثانی کے ہاں چار سو روپیہ ماہوار پر بحیثیت معتمد ملازم ہوگئے۔ ناجی کو اپنے آبا و اجداد کی نیک نامی کا بہت خیال رہتا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے والد کی آخری نصیحت کا خیال رکھا۔ کہا کرتے تھے۔

”میاں اگرچہ ہماری عمر کوئلے کی کوٹھری میں گزری ہے مگر ہم کو کبھی سیاہ دھبہ نہ لگنے پایا۔(۱)

ان کی باقیات میں ایک صاحبزادی اور دو فرزند تھے۔

ناجی ایک پکے مذہبی شاعر تھے۔ تفضل حسین عطا سے تلمذ تھا۔ ناجی کے چھوٹے بھائی سید اکبر حسین خرد بھی شاعر تھے۔ ناجی کو شہرت کا خیال نہ تھا۔ حضرت سرور کائنات اور اہلبیت سے دلی عقیدت تھی اور اسی عقیدت میں شعر کہتے تھے۔ ان کے مکان پر یوم عاشورہ سے ۲۸ رصفر تک مجالس پابندی سے منعقد ہوتی تھیں۔ نوحہ، سلام، منقبت اور تاریخ گوئی میں ماہر تھے۔ وقت واحد میں قطعہ تاریخ لکھ کر دوسروں کو دیدیا کرتے تھے۔ ناجی نے زندگی بھر

کبھی غزل نہیں کہیں۔انہوں نے صرف مدحت اہلبیت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔
ناجی نے کوئی دیوان نہیں چھوڑا۔نام ونمود کو پسند نہیں کرتے تھے۔جب خیال آیا شعر موزوں
ہوتے ہی ایک کاغذ کے پرزے پر لکھتے اور اپنے شاگردوں کے حوالے کردیتے۔انہیں اپنا
کلام یکجا کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔میر احمد علی تحصیل داران کے بھتیجے اور بھانجے مرزا علی
رضا نے ان کے نوحوں کو جمع کرکے ''درۃ الغموم'' کے نام سے شائع کیا جو (۱۵۰) صفحات پر
مشتمل ہے۔جس میں تقریباً دوہزار اشعار جمع ہیں۔ان کے تعلق سے محبوب الزمن میں
عبدالجبار ملکاپوری یوں رقمطراز ہیں۔

> ''ناجی کے کلام میں میر کا انداز معلوم ہوتا ہے۔آپ کے تلامذہ شہر
> میں اکثر ہیں۔آپ کی اصلاح سے کلام کو درست کراتے ہیں۔آپ
> تاریخ گوئی میں ید بیضا رکھتے ہیں۔تہنیت اور تعزیت میں فی البدیہہ
> موزوں فرماتے ہیں(۲)

ناجی کے شاگردوں کی فہرست کافی طویل ہے۔طوالت کی وجہ سے چند خاص نام
درج کئے جاتے ہیں جیسے میر دلاور علی دانش،لائق،غیور،جواد،جعفر،سجاد اور ناہید وغیرہ۔ناجی
نے آصفجاہی خاندان کے حالات پر ایک طویل منظوم تاریخ بھی لکھ کر نواب آصفجاہ سادس کو
پیش کی تھی جس پر سرکار آصفیہ کی طرف سے تین ہزار روپے انعام عطا ہوا تھا۔ناجی کے مشہور
قطعات تاریخ درج کئے جاتے ہیں۔تاریخ دیوان طبع ڈاکٹر احمد حسین مائل یوں نکالی ہے۔

ہوا دیوان رنگین منطبع جس وقت مائل کا
تو بولے دیکھ کر سب اس کو بہتر ہے گلستاں سے
جو پوچھی دوستوں نے طبع کی تاریخ ناجی سے
کہا سن چھپ گیا مائل کا دیواں فصل سجاں سے

۱۳۱۵ء

قصیدے کے دوشعر درج کئے جاتے ہیں۔

اللہ ثنا خواں حسینؓ ابن علی ہے — قرآن مبیں شان حسین ابن علی ہے
ناجی ہے گلستاں جناں تیرا نشیمن — تو بلبل بستاں حسین ابن علی ہے

ناجی کے نوحے بھی بہت مشہور ہیں صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

کہتے تھے شب قتل یہ مشتاق شہادت ہوئیگی سحر کب
یارب ہمیں مرنے کی تمنا ہے نہایت ہوئیگی سحر کب

☆☆

(۱) مرزا محمد علی مضمون سید اصغر حسین ناجی، از مرقع سخن، جلد اول، حیدر آباد۔ ۱۹۳۵ء۔ صفحہ (۳۱۸)

(۲) عبد الجبار ملکاپوری، محبوب الزمن، حیدر آباد، صفحہ (۱۱۲)

13.4KB/s 4:07 75%

شاہ محمد چندا حسینی نامیؔ

نام شاہ محمد چندا حسینی اور تخلص نامی تھا۔ ۱۸۸۷ء میں ولادت ہوئی۔ نامی کے والد تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ میں مسجد کے پیش امام تھے۔ آپ دس برس کے تھے کہ آپ کی والدہ انتقال کر گئیں۔ ان کی نانی نے بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ نامی کے والد نے انہیں بچپن ہی سے مذہبی تعلیم دلوائی اس کے بعد دینی مدرسہ میں شریک کروادیا۔ مگر نامی اس مذہبی تعلیم سے خوش نہ تھے انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا ہے۔

> ''ابا جان میری آئندہ زندگی نہایت دشوار گزار اور خطرناک دکھائی دیتی ہے۔ براہ کرم بغائت پدری مجھے مڈل اسکول انگریزی میں شریک فرمایئے''(۱)

نامی کے والد نے ان کے کہنے پر انگریزی اور فارسی تعلیم دو سال تک دلوائی۔ دیہات میں مڈل اسکول سے زیادہ تعلیمی مدارس نہیں تھے۔ والد حیدرآباد بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر ان کی ناراضی سے متفق نہ ہو کر نامی بغیر اجازت حیدرآباد آ گئے اور اپنے عزیز کے یہاں مقیم ہو گئے۔ بعد ازاں والد اور اپنے بڑے بھائی کی سخت ناراضی سے مجبور ہو کر نامی حیدرآباد سے شاہ پور واپس ہو گئے۔ اس کسمپرسی کے عالم میں عمر کے ۱۸ سال گزارے۔ والد نے نامی کی شادی اپنے سالے کی لڑکی سے طے کر دی۔ نامی اس شادی سے خوش نہیں تھے مجبوراً شادی کرنا پڑی۔

۱۹۰۷ء میں نامی گلبرگہ پہنچ گئے اور تلاش معاش میں مہتمم تعلیمات کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور پیش کیا۔ صدر مہتمم نے ماہانہ دس روپے تنخواہ کی ایک جائداد پر ان کا تقرر کر دیا۔ یہیں کارگزار رہے۔ نامی کی وفات ۱۳۴۹ھ میں بمقام شاہ پور ہوئی۔ آپ کی اولاد

غزل موجود ہیں جو اس زمانہ کا رواج تھا۔ نامی کے کلام میں اقبال، اکبرالہ آبادی، سیماب اکبرآبادی وغیرہ کے کلام کا اثر نمایاں ہے۔

☆☆

(۱) وقار خلیل، سخن نامی، حیدرآباد، ۱۹۸۵ء، صفحہ (۱۲)

(۲) وقار خلیل، دیوان سخن نامی، حیدرآباد۔ ۱۹۸۵ء، صفحہ (۱۹،۱۸)

محمد عبدالغفور خاں نامؔی

عبدالغفور نامی محبوبیہ دور کے ایک نامور شاعر گزرے ہیں۔آپ کی ولادت حیدرآباد میں ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ نامی کے والد میر فیض محمد خان تھے جو ۱۸۵۷ء کے غدر سے متاثر ہو کر دہلی سے حیدرآباد دکن تشریف لائے۔نامی نے ابتدائی تعلیم اشرف حسین محمد حسین، زماں خاں اور مولوی عبداللہ صاحب سے حاصل کی۔ان کے علاوہ مولوی محمد عباس خان پشاوری سے صرف ونحو،فقہ وحدیث،تفسیر کا درس لیا اور پھر مولانا عبدالصمد قندھاری سے علم ہیت،مولوی قادرالدین سے علم منطق،مولوی عباس علی خان سے فلسفہ معقول،مولانا عبدالرحمان سہارنپوری سے علم ادب وحدیث،اس طرح نامی تقریباً تیس سال کی عمر میں کامل مولوی ہو چکے تھے۔اس کے ساتھ انہوں نے علم طب میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔انہوں نے علم جفر اور خوش نویسی میں بھی کمال حاصل کیا(۱)

نامی کے کئی تصانیف یادگار ہیں۔جن میں (۱) جواہر الصلواۃ (عربی) (۲) آیات الکبریٰ (عربی) (۳) دلائل الخیرات (عربی) (۴)...... (فارسی) (۵) تکسیرات وتسخیرات (فارسی) (۶) دبستاں نامی (فارسی) (۷) دبستان نامی (۸) احادیث خیرالانام (۹) مناجات نامی (فارسی) (۱۰) تعبیرات نامی (۱۱) فرائض نامی (فارسی) (۱۲) فردوس دکن (فارسی) (۱۳) الدرجات العلیٰ (اردو) (۱۴) ریحان الرواح (اردو) (۱۵) مجربات نامی (اردو) (۱۶) کشکول (اردو)

اس کے علاوہ انہوں نے کئی سفرنامے بھی لکھے ہیں۔نامی اردو،فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے۔دس برس کی عمر سے شاعری سے ذوق ہو چلا تھا۔انہوں نے اپنا کلام محفوظ نہ رکھا البتہ جب داغ دہلوی سے اصلاح لینی شروع کی۔تب سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا۔ان

کا ایک دیوان عربی میں اور دو اردو میں ہیں۔انہوں نے غزلوں قصیدہ، رباعی، واسوخت، مثنوی، ٹھمری وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ جن میں سادگی مضمون آفرینی، سلاست، برجستگی، شیری، موسیقی، نازک خیالی اور حسنِ ترتیب جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ذیل کے اشعار ان خوبیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ہوئی ہیں غصہ سے لال آنکھیں غضب کے تیور بدل رہے ہیں
بھوئیں تنی ہیں کھنچا ہے خنجر یہ میرے ارماں نکل رہے ہیں
مکرنا آتا نہیں ہے کہہ کر وہ خود کو جھٹلائیں بھی تو کیونکر
زبان سے وعدہ نکل گیا ہے اب اس کے پہلو بدل رہے ہیں
لگی ہے اب آگ کچھ انہیں بھی جو غیر سے بیوفائی دیکھی
خدا کی قدرت کا ہے تماشہ جلانے والے بھی جل رہے ہیں

چونکہ محبوبیہ دور میں داغ دہلوی مرکزی مقام رکھتے تھے۔ اس لیے جہاں تک ان کے شاگردوں کا تعلق ہے۔ ان میں سے زیادہ تر داغ کی زمین میں شعر لکھنا اپنے لئے فخر سمجھا کرتے تھے۔ ذیل میں نامی کی یہ غزل داغ دہلوی کی زمین میں ملتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آئینہ دیکھ کے زلفیں تو بناؤ اپنی
آج دیکھو تو میں لیتا ہوں بلائیں کیونکر
پہلے تو روٹھ کے اس بزم سے آئے نامی
اب تڑپتے ہیں کہ پھر جائیں تو جائیں کیونکر (۲)

☆☆

(۱) محمد وحیداللہ خان مضمون مشمولہ، مرقع سخن، جلد دوم ۱۹۳۷ء، صفحہ (۲۱۱)

(۲) محمد وحیداللہ خان مضمون مشمولہ، مرقع سخن، جلد دوم، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ (۲۱۵)

احمد حسین ناوکؔ حیدر آبادی

نام احمد حسین اور تخلص ناوک تھا۔ ولادت گلشن آباد میدک میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم میدک میں حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش میں حیدر آباد آئے اور ''عہد محبوبیہ میں محکمۂ بندوبست سے وابستہ ہو گئے۔ وہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۳۰۹ھ میں وفات ہوئی۔

شاعری کا شوق نوجوانی سے موجزن تھا۔ لال مکند لال جوہری لکھنوَ سے اصلاح سخن حاصل کرتے تھے۔ آپ کے کلام میں جملہ اصناف سخن ملتے ہیں۔ ناوک نے محبوب علی پاشا اور مہاراجہ کشن پرشاد کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔ نمونے کے طور پر رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

ہوتا رہے ہر سال گرہ کا جلسہ
خنداں رہیں مثل گل ہمیشہ ذی جاہ
احباب رہیں عیش و طرب میں یارب
پامال ہو سبزے کی طرح سب بدخواہ

آقا مرا دنیا میں سدا شاد رہے
بدخواہ نہ بند غم سے آزاد رہے
محبوب علی حب علی سے ہوں شاد
اور شہر بفضل حیدرآباد رہے(۱)

☆☆

(۱) صاحب حیدر آبادی، جنوبی ہند میں رباعی گوئی، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۲۵۳)

نظم طباطبائی

نظم طباطبائی کا اصلی نام سید علی حیدر اور تخلص نظم تھا۔ نظم نے اپنی شاعری میں حیدر تخلص بھی بعض شعروں میں استعمال کیا ہے۔ نظم ۱۶ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ ۱۸ نومبر ۱۸۵۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انہیں مختلف زبانوں جیسے اردو فارسی عربی اور انگریزی وغیرہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ انہیں فلسفہ منطق سائنس اور علم نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ نظم سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدہ سرسالار جنگ بہادر کی بیٹی تھیں۔ نظم نے ۸۲ سال کی عمر پائی۔ ان کا انتقال حیدرآباد میں ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا۔ تدفین حضرت موسیٰ قادری کے دائرے میں عمل میں آئی۔ نظم طباطبائی نواب واجد علی شاہ اودھ کے رشتہ کے نسبتی برادر تھے واجد علی شاہ کے آس پاس کے ماحول کے زیر اثر نظم نے اپنی عمر کے ۳۴ سال اودھ میں گزارے ۱۸۸۷ء میں پہلی مرتبہ تفریح کی غرض سے حیدرآبد تشریف لائے۔ اس وقت حیدرآباد کے چیف جسٹس سید افضل حسین لکھنوی نے نظم کی قابلیت سے متاثر ہو کر انہیں حیدرآباد میں قیام کے لئے مجبور کیا۔ مگر وہ نہ مانے اور کلکتہ چلے گئے۔ اسی سال واجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا اور نظم بے روزگار ہو گئے۔ ملازمت کے لئے پریشان تھے۔ اسی اثنا میں حیدرآباد کے ایک مدرسہ میں عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی۔ نظم اس ملازمت کے لئے کلکتہ سے حیدرآباد آنے ہی والے تھے کہ حیدرآباد سے جسٹس سید افضل حسین کا تار ملا۔ جس میں انہوں نے نظم کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور درخواست کی کہ ان کے فرزند سید حسین کے اتالیق کی حیثیت سے ماہانہ ایک سو روپیہ قبول فرمائیں۔ چنانچہ نظم ۱۸۸۷ء میں دوبارہ حیدرآباد آئے اور پھر تا حیات یہیں قیام فرمایا۔

نظم طباطبائی حیدرآباد آنے کے کچھ ماہ بعد مدرسۂ اعزا میں عربی کے استاد مقرر

ہوئے۔۱۸۹۰ء میں کتب خانہ آصفیہ کے پہلے مہتم بنائے گئے۔۱۸۹۱ء میں مدرسۂ عالیہ کے عربی و فارسی کے استاد کے عہدہ پر مامور ہوئے اور ۱۸۹۷ء تک یہاں اپنی خدمات انجام دیں۔۱۳۱ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو ان کا تبادلہ نظام کالج میں ہوا۔ یہاں عربی فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے۔۱۶ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو اسی کالج میں اردو کے پروفیسر کے عہدہ پر ترقی ہوئی۔۶/ جون ۱۹۱۷ء کو نظام کالج سے صرفخاص منتقل کیے گئے۔ جہاں وہ شہزادگان کو عربی تعلیم دینے لگے۔۱۰/ جولائی ۱۹۱۸ء کو ان کا تبادلہ دار ترجمہ جامعہ عثمانیہ کیا گیا۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۱۹ء انہیں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوجانا چاہیے تھا۔لیکن ان کی علمی قابلیت اور دارلترجمہ میں ان کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کئی بار ان کی ملازمت میں توسیع کی جاتی رہی۔ بالآخر وہ ۱۱/ جولائی ۱۹۲۶ء کو دارالترجمہ سے سبکدوش ہوئے۔

۲۱/ مئی ۱۹۱۷ء کو آصف سابع نے نظم طباطبائی کو ان کی گزشتہ خدمات کے صلہ میں حیدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے نوازا۔

نظم طباطبائی کی دو طویل نظمیں ملتی ہیں۔ایک تو نعت خواں قصیدہ ہے دوسری ساقی نامہ شقشقیہ ہے۔نعت خواں قصیدہ میں بعثت نبوت سے غلبہ اسلام کی داستان ہے۔ اس میں مجاہدین کا ذکر ہے اور یہ جنگ حسنین پر ختم ہوئی ہے۔

قصیدہ بعثت سے لیے گئے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

اٹھیں باگیں بڑے توسن کھنچیں قبضیں چلے نیزے
کٹے جوشن، تہیں زرہیں دم رزم صف آرائی
وہ نیزوں کا لچک جانا کندوں کا وہ بل کھانا
وہ سوفاروں کی ہچکی اور کبادہ کی وہ انگڑائی (۱)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظم ساقی نامہ شقشقیہ، مسدس حالی کی طرح مسلمانوں کے مذہبی و قومی شعور میں انقلاب بیدار کرنے کے ارادہ سے لکھی ہوگی۔اس میں برطانوی حکمرانوں کے شراب نوشی اور شراب کی تجارت اور ان کے اخلاقی گراوٹ کو پیش کیا گیا ہے۔ بطور نمونہ ذیل میں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

سیکھا انگریز کا تو علم و ادب — اور ہیں اپنی زبان سے جاہل سب
ذوق تقریر سے نہیں آگاہ — سبک تحریر سے نہیں آگاہ
ہوئے سودے کی نثر سے آگاہ — نہیں سودا کی نظم سے کچھ راہ
پڑھ کے انگریزی نوکری جو ملی — آگئی کیا لیاقت علمی
تم نے سمجھے نہیں مطلب علم — تم نے دیکھے نہیں ہیں طلب علم(۲)

نظم نے کئی نظمیں لکھیں ان میں خطاب اہل اسلام، اسی طرح وطن کی خبر مناتے ہیں۔ ہندوستان کی سیفو میڈم سروجنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ نظم کے کلام میں انگریزی نظموں کے اردو تراجم بھی ملتے ہیں ان میں ''گور غریباں'' Thomasgray کے مرثیہ Elegy کا ترجمہ ہے قابل ذکر ہے۔ نظم نے شیکسپیر کے منظومات کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ گور غریباں کے دو بند ذیل میں پیش ہیں۔

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گل و ریحان نہ ہو تو کیا
نہیں نمگیرہ اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاری قرآن نہ ہو تو کیا
ہراک کے درددکھ سے اس کو رہتا تھا سدا مطلب
ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشکباری کی

نظم طباطبائی نے گرے (Gray) کی ایک اور نظم ''اوڈ ان اسپرنگ'' کا ترجمہ ''زمزمۂ فصل بہار'' کے عنوان سے کیا ہے۔

۱۹۰۶ میں نظم نے نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کے جشن چہل سالہ پر ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں رباعیوں کی ترتیب مسلط مربع کے اصول پر کی گئی ہے اور ہر رباعی کے چوتھے مصرع میں نفس مضمون کو پرزور انداز میں پیش کیا ہے۔ قصیدہ کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

پھیلا ہوا عالم میں عجب نور ہے آج — رشک شب یہ شب دیجور ہے آج
کیا جوش و سرور چشم بد دور ہے آج — ہے آخر ماہ چاند بھرپور ہے آج

ساون کا سماں ہے نغمہ ہائے ترسے — جب تار پر مضراب پڑے مینہہ برسے
جی زاہد خشک کا نہ کیوں کر ترسے — رشک رگ ابرتا طنبور ہے آج

نظم طباطبائی کی غزلیات تقریباً (۵۰) سال کے طویل عرصہ پر محیط ہیں۔۱۸۸۶ء سے قبل لکھی ہوئی غزل انہوں نے مٹیا برج کے مشاعرہ میں داغ کے ساتھ پڑھی تھی۔ان کے کلام میں طرز غالب سے مماثلت ملتی ہے میر اور نظم کا ماحول ایک دوسرے سے جدا ہے لیکن میر کے اسلوب میں نظم نے اشعار کہے ہیں مثلاً میر کی غزل۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

میر کی اس غزل کی اتباع میں جو غزل نظم نے بھی کہی اس کے چند اشعار پیش ہیں۔

بسان نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے — بے آشنا ہے جو کہنے پر آشنا کے چلے
نمود رعشہ پیری ہوا اجل آئی — چراغ صبح تھے گویا کہ جھملا کے چلے
کبھی جو آگئے تکیہ پہ ہم فقیروں کے — دعائیں سن کے چلے کوسنے مٹا کے چلے

نظم طباطبائی نے حضرت داغ کے رنگ میں بھی کئی غزلیں لکھی ہیں۔ایک غزل کے چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

کس لئے پھرتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ
کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ
مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر
یا خدا آئے تھے کیا شام و سحر دونوں ساتھ
کیسی یارب یہ ہوا صبح شب وصل چلی
بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ (۳)

اس کے علاوہ نظم طباطبائی نے جن دیگر شعراء کی اتباع میں غزلیں لکھی ہیں ان میں قابل ذکر سودا، ناسخ، آتش، ظفر وغیرہ ہیں۔ان کے کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے تہذیب کی شائستگی کو اہمیت دی ہے۔عشقیہ کلام کا کوئی شعر تہذیب کے حدود سے باہر نہیں جاتا۔ان کا محبوب خوش اطوار شائستہ اور پارسا نظر آتا ہے۔جیسے۔

وہ برہم ہوگئے زلفیں ذرا رخ سے جو سرکائیں
خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا

چنانچہ نظم طباطبائی نے اکثر محبوب سے مخاطبت میں احتیاط برتی ہے اور محبوب کے حسن کی تصویر کشی میں زیادہ تر تشبیہات سے کام لیا ہے۔ اس کی جانب سے جو بھی رنج و غم سہنا پڑا۔ اس کے اظہار میں بھی انہوں نے تہذیب و متانت کو ملحوظ رکھا ہے۔

میں نہ کہتا تھا گلشن میں نہیں جائیں حضور
نالۂ بلبل سے آخر دردِ سر پیدا ہوا

نظم طباطبائی کے کلام میں تصوف کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ نظم طباطبائی نے لکھنؤ کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس کے ماضی اور حال کی تہذیب کا نقشہ انہوں نے اپنی ایک غزل میں کھینچا ہے۔ جس کے چند اشعار درج ہیں۔

ڈھونڈتا ہے اب کسے لے کر چراغِ آفتاب   کیوں مٹایا اے فلک تونے نشانِ لکھنؤ
لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید   ہے نشانِ لکھنؤ باقی نہ شانِ لکھنؤ
اب نظر آتا نہیں وہ مجمعِ اہلِ کمال   کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنؤ

حیدرآباد آنے کے بعد بھی نظم سے لکھنؤ کی محفلیں بھلائی نہ گئیں۔ ذیل کے اشعار اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

وہ محفل اربابِ صفا ہوگئی برہم
ان لوگوں میں باقی ہے اب اک نظمِ حزیں اور
اپنے خرمن پر تسلط دیکھتے ہیں غیر کا
ہے بھروسا ہم کو برق نالہ شبگیر کا
لکھنؤ گردشِ دوراں نے چھڑایا اے نظم
دور پھینکا مجھے آخر کو شاید فلاخن ہو!

نظم طباطبائی بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن ان کا اردو نثر میں بھی قابلِ لحاظ کام موجود ہے ان کے تصانیف میں (۱) تلخیص عروض و قوافی (۲) شرح دیوان غالب (۳) شرح دیوان امرالقیس (۴) سائیس (۵) اشعار انتخاب (۶) ادب الکاتب والشاعر (۷) اردو

میں علم کیمیائی اصلاحات (۸) مالک الدولہ صولت (۹) نیا برج کے سبع سیارے (۱۰) مہتاب الدولہ درخشاں (۱۱) اثرلکھنوی (۱۲) ایک وزن عروض کی تحقیق (۱۳) آفتاب سے خطاب (۱۴) لکھنؤ کی محفل میں ناچ (۱۵) امرو القیس (۱۶) طرف شاعرعرب (۱۷) تاریخ طبری (ترجمہ) قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ کئی مضامین بھی ان کی یادگار ہیں۔

نظم صاحب دیوان شاعر ہیں۔ان کا دیوان، دیوان طباطبائی یعنی صوت تغزل کے نام سے ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔یہ دیوان ۳۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس کے دور کے اس شاعر و ادیب کے تعلق سے پروفیسر مسعود حسین خاں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

وہ عربی فارسی کے جید عالم اور اردو شعر کے رمز شناس تھے اور انگریزی نظموں کے کامیاب ترین مترجم بھی۔ایک طرف وہ روایت پسند غزل گو تھے تو دوسرے جانب ایک انقلاب آفریں نظم گو اور شارح بھی (۴)

☆☆

---

(۱) نظم طباطبائی، ڈاکٹر اشرف رفیع، صفحہ ۲۸۶

(۲) نظم طباطبائی، ڈاکٹر اشریف رفیع، صفحہ ۲۸۰

(۳) نظم طباطبائی، ڈاکٹر اشریف رفیع، صفحہ ۲۵۹

(۴) مضمون تعارف، از پروفیسر مسعود حسین خان (نظم طباطبائی) مصنفہ اشرف رفیع، صفحہ (۱۳،۱۴)

نصیرالدین نقش حیدرآبادی

نام نصیرالدین اور تخلص نقش تھا۔ نقش کی ولادت ۱۲۶۰ھ م ۱۸۴۳ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ اردو، فارسی اور عربی میں کمال حاصل تھا۔ نوجوانی میں محکمۂ مال میں ملازم ہوگئے اور وہیں سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے (۱)

جناب نقش کو شاعری کا شوق نوجوانی سے ہوا۔ انہوں نے اپنا کلام حضرت شمس الدین فیض کو دکھلایا اور اصلاح لی۔ جہاں حیدرآباد میں بیسیوں شاگرد شمس الدین فیض کے فیض سے سیراب ہوتے تھے جناب نقش بھی ان سے مستفید ہوئے۔ نقش کو فیض کے شاگردوں میں خاص مقام حاصل تھا۔ نقش فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے باقیات میں ایک تذکرۂ شعرا ہے جس کا نام ''عروس الاذکار'' ہے۔ یہ فارسی میں ہے اس کے علاوہ ان کی اور کئی قلمی تصانیف ہیں جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ ہم یہاں ان کی اردو شاعری کے کچھ اشعار درج کرتے ہیں۔

زلف سیہ کا اس کی ہے تار تار سودا
ہے حسب حال میرے اک سر ہزار سودا

محفل گھر سے اگر ہے طالب قدر
کہاں قیمت صدف میں ہے گہر بند

جان شیریں عشق میں کھوتا ہے کیا
سنگ مشکل کوہکن ڈھوتا ہے کیا

جو صبا کرتی ہے خاک اپنی خراب
بال بیکا زلف کا ہوتا ہے کیا

تیرگی ہو محو دل، غفلت نہ کر

جھٹ پٹے کا وقت ہے سوتا ہے کیا

جناب نقش کی شاعری میں سادگی، بانکپن اورشوخی کے عناصر نمایاں ہیں۔ نقش کا کلام ایک عہد آفریں دور سے تعلق رکھتا ہے۔ جن کے استاد حضرت فیض تھے۔ فیض کا عہد محبوبیہ دور کا وہ زمانہ ہے جب دہلی میں مرزا غالب کا دور تھا۔ اس کے باوجود دکن میں جو شاعر پیدا ہوے ان پر دہلی کے شعرا کا اثر زیادہ ظاہر نہیں ہوا۔ حالانکہ فیض بھی شمالی ہند کے شاعر تھے مگر عہد محبوبیہ میں دکن کے شاعر کی حیثیت سے ان کے چرچے شمالی ہند کی محفلوں میں بھی ہوتے تھے۔ جناب نقش کے کلام میں غزل کا جو رنگ ہے حضرت فیض سے ملتا جلتا ہے۔

ترے رخ سے زلفوں کی یوں میل ہے

کہ سورج کبھی پر امر بیل ہے

اس کی زلفوں میں پھنسا ہے جو مثال شانہ

دیکھتا ہوں دل صد چاک سے خالِ شانہ

(۲)

☆☆

(۱) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو دہلی۔ ۱۹۷۸ء، صفحہ (۵٦۰)

(۲) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو دہلی۔ ۱۹۷۸ء، صفحہ (۵٦۰)

حضرت سید عبدالکریم نورؔ

حضرت سید عبدالکریم نور فرقہ مہدویہ کے پیرو مرشد تھے۔ آپ کی ولادت ۱۲۹۲ میں محلہ کاچی گوڑہ حیدرآباد میں ہوئی۔ حضرت نور کے والد حضرت سید عالم بھی فرقہ مہدویہ کے پیرومرشد تھے۔ حضرت نور کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی چونکہ والد مذہبی تھے اس لیے حضرت نور نے بھی عربی فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ حضرت نور کے جد اعلیٰ کرگاؤں موقوعہ گجرات سے ہجرت کر کے حیدرآباد وارد ہوئے تھے اور اپنا دائرہ قائم کرلیا تھا۔ فرقہ مہدویہ میں دائرہ سے مراد حلقہ مہدویت میں شامل ہوجانا ہوتا ہے۔ فرقہ مہدویہ میں ہر پیرو مرشد کا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ جس میں انہی کے مریدین وابستہ رہتے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد حضرت نور کے بڑے بھائی حضرت سید خدا بخش صاحب جانشین دائرہ ہوئے۔ سید عبدالکریم نور دوسرے فرزند تھے ان کے ایک اور بھائی سید محمد ابجی میاں بھی تھے۔ حضرت نور کا انتقال ۱۳۵۳ھ میں ہوا۔

حضرت نور کے فرزند سید عالم تھے ان کا بھی انتقال ہوئے کافی عرصہ ہوگیا۔ سید عالم کے پانچ فرزند ہیں (۱) حضرت پیرومرشد سید حمید صاحب مرحوم (۲) سید عبدالکریم مرحوم (۳) سید خوندمیر سوز ہاشمی (۴) سید محمد میراں جی (۵) سید اشرف مہدی۔

حضرت نور کو شاعری کا شوق نوجوانی سے تھا ان کے دو ضخیم دیوان قلمی ان ہی کے پڑپوتے کے پاس موجود ہے۔ سید عبدالکریم نور کے پوتے حضرت سید حمید مرحوم نے اپنے دادا کے دیوان کا ایک انتخاب ''ضیائے نور'' کے نام سے سنہ ۱۳۷۸ھ میں زیور طبع سے آراستہ کیا تھا۔ اس دیوان میں پروفیسر سید محمد صاحب مرحوم کی تقریظ ان الفاظ میں ہے ملاحظہ کیجیے۔

حضرت نور، فن شعر پر انہیں بڑی دسترس تھیں محاسن و مصائب سخن

سے وہ نہ صرف کماحقہ آشنا تھے بلکہ اپنی استادانہ مہارت کی وجہ سے
ہر محفل میں مرکز توجہ رہتے تھے(۱)

حضرت نور نے استادِ فن حضرت توفیق کے آگے زانوے ادب تہہ کیا تھا۔آپ کے تلامذہ میں علامہ شمسی، ضامن کنتوری، ہتین تنویر، تسکین المعی اور سعادت اللہ خان ہوش مندوزئی قابلِ ذکر ہیں۔حضرت نور کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔حضرت نور ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ادبی اصناف سخن کے علاوہ ان کے دیوان میں طنز و مزاح کا گوشہ بھی ملتا ہے۔حضرت نور کی ایک خاص بات یہ تھی انہوں نے اپنے دیوان قلمی میں غزلوں کے ساتھ دن اور تاریخ لکھنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیے۔

کس طرح بار محبت وہ اٹھا سکتے ہیں
جن کے ہاتھوں پہ گراں رنگ حنا ہوتے ہیں

زمانہ پیری میں حضرت نور کی لکڑی کھوگئی تھی اس موضوع پر ایک نظم یوں موضوع کرتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے۔

کیا ہوگئی برسوں کی وہ ہمدم مری لکڑی
ہوئی تھی جدا مجھ سے بہت کم مری لکڑی(۲)

حضرت نور کے طنز و مزاح کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے۔

سرمایہ کسی کا ہے اڑاتا ہے کوئی اور
کھاتا ہے کوئی اور کماتا ہے کوئی اور

دلہن کی عمر ہے کچھ بارہ برس کے نیچے
دولہا دو روز کا مہمان مبارک ہوئے

☆☆

(۱) حضرت سید حمید مرحوم ضیائے نور، حیدرآباد، ۱۳۸۷ھ۔صفحہ ۲۶
(۲) رسالہ المصدق، جلد دوم ۱۳۵۱۔صفحہ ۱۳

محمد احمد اللہ واصل

نام محمد احمد اللہ اور تخلص واصل تھا۔نوائی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی پیدائش ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔ان کے والد محترم محمد تقی حسین رفعت جو فارسی اور دینیات کے ماہر تھے محکمۂ امورِ مذہبی سے وابستہ تھے۔واصل کی ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد کے زیرِ اثر ہوئی۔انہوں نے تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ۱۲۹۰ھ میں صرفِ خاص مبارک میں ملازمت اختیار کی اور اپنی علمی قابلیت سے ترقی کرتے ہوئے مہتمم کے عہدے تک جا پہنچے۔۱۳۳۶ھ میں ان کا وصال ہو گیا(۱)

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی میں واصل کے حقیقی بھائی کا پورا خاندان نذرِ آب ہو گیا جس کا صدمہ واصل کو زندگی بھر رہا۔

واصل ایک قادرالکلام شاعر تھے۔انہیں میر سرفراز علی وصفی لکھنوی کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔واصل کو اپنے استاد سے گہری عقیدت تھی۔واصل نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی جیسے نعت،منقبت،رباعیات اور غزل وغیرہ۔ان کے ایک غیر مطبوعہ دیوان کا نسخہ "نغمۂ عندلیبِ دکن" کے نام سے موجود ہے۔انہوں نے اپنے کلام میں موضوعات کو سمیٹا ہے۔ان کے کلام میں سنجیدہ شوخی اور لطفِ زبان کی جھلک نظر آتی ہے۔انہوں نے سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

رودِ موسیٰ کی طغیانی کے صدمۂ جان کا اظہار ان اشعار میں ملتا ہے:

موسیٰ عمراں کو بھولیں گے، نہ بھولیں گے تجھے
یاد ہے اے رودِ موسیٰ تیری طغیانی ہنوز

رود موسیٰ کہیں پھر آئے نہ طغیانی پر
دیدہ پھر واصل غم دیدہ کا نم ہوتا ہے

واصل نہایت غیور اور خوددار شاعر تھے اور خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

تھا فخر فقیری پہ کچھ ایسا کہ نہ پوچھو | منہ پھیر لیا دیکھ کے رخ ہم نے غنی کا
تھی یہ غیرت کہ نہ لی غیر سے امداد کبھی | دکھ اٹھائے گئے احسان اٹھایا نہ گیا
سائل مرے در کے نہیں پھیلاتے کبھی ہاتھ | ہم اور دراز اپنے کریں دست طلب جھوٹ
بندہ ہوں تیرا سر نہ جھکاؤں گا پیش غیر | ایسی فروتنی ہے مرے بانکپن سے دور
اے بے نیاز مجھ کو بھی تو بے نیاز رکھ | ہے مدعا یہی دل بے مدعا ملے

واصل کے دل میں اردو زبان کی خدمت کا بے لوث جذبہ گامزن تھا۔ جیسا کہ ان کے اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

واصل ترقی دیں گے ہم اردو زبان کو
ملک دکن کو ہند کا ہمسر بنائیں گے(۲)
مرا ذمہ زباں میں ہو دکن بھی ہند کا ہمسر
رہیں واصل اگر جلسے یو ہیں یار ان یکدل کے

واصل کی غزل میں متوازن شوخی، لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

صدقے صدقے ترے اے جوش جوانی صدقے
کھل رہی ہے گرہ بند قبا آپ ہی آپ
مانا کہ تم سے کھل نہیں سکتے قبا کے بند
اچھا جو دست شوق ہمارا مچل گیا

واصل کی قادرالکلامی اور سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کی صلاحت کا اندازہ ذیل کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہم ایسے ہیں بدنصیب واصل ہوابدی سے بھی کچھ نہ حاصل
بنی ہماری سیاہ کاری نہ تارگیسو نہ خال عارض

اشکوں کے ساتھ خون تمنا ٹپک پڑے
ہے لطف اس طرح سے جو چھلکے ایاغ داغ

واصل کا طبع رجحان نعت ومدحت کی طرف تھا۔ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ حضور اکرم کی مدح سرائی ان کی شاعری کا اصل محور ہو اور انہوں نے اپنے شاگردوں سے بھی اسی طرح کی توقع کی تھی۔ ذیل کے اشعار سے واصل کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔

مداح نبیؐ میری طرح ہوں مرے شاگرد
پھولے پھلے اس طرح سے واصل شجرِ فیض

وہ پاؤں صلہ نعت کا دامن مرا بھر جائے
ہر نقطہ ترے فیض کا ہو صد گہر فیض

ولہ

مرے دیوان کا عنوان ہے نعت نبیؐ واصل
سرِ مصحف پہ ہو جس طرح بس اللہ کی صورت

انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں بھی اشعار لکھے ہیں۔واصل کی رباعیوں میں قوم سے ان کا دلی تعلق اور دردمندی کا اظہار ہے۔اور اسی کے ساتھ ساتھ قوم کی بے راہروی پر آنسو بھی بہائے ہیں۔رباعیوں کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

ہم اپنے ہی ہاتھوں سے ہوئے آہ تباہ ظاہر میں بڑے نیک ہیں باطن میں سیاہ
اس دعویٰ اتحاد پہ ہر دل میں نفاق لاحول ولا قوۃ الا باللہ

دیگر

اسلام کی قسمت تھی کچھ ایسی واصل دارین کی تھیں نعمتیں اس کو حاصل
جس قوم پہ قرآن کا ہوتا ہے نزول اب ہوتی ہیں افسوس بلائیں نازل(۳)

واصل کے کلام میں تصوف کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ذیل کے اشعار اس کی

ترجمانی کرتے ہیں۔

تیرے جلوے کے تصدق تو نہیں جلوہ فروش
جس سے دیکھا نہ گیا اس کو دکھایا نہ گیا

☆☆

(۱) محمد عمر مہاجر، مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ۔(۱۵۹)
(۲) محمد عمر مہاجر، مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ۔(۱۶۰)
(۳) محمد عمر مہاجر، مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ۔(۱۶۶)

سید عبدالصمد واصفیؔ

نام سید عبدالصمد تھا۔ واصفی تخلص فرماتے تھے۔ واصفی کی ولادت ۱۲۸۸ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ کے والد سید عبدالمنان ''عہد محبوبیہ'' میں سرکاری ملازم تھے جناب واصفی کے نانا سید محمد مہدی واصف ایک پرگو شاعر تھے۔ واصفی کو ترکہ میں شاعری ملی تھی۔ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ واصفی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ ''معاصرین داغ'' کا نقطۂ عروج تھا۔ استاد داغ حیدرآباد تشریف لا چکے تھے۔ واصفی بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہوگئے اور بہت جلد اپنی فطری مناسبت سے ہمعصر شعرا میں امتیاز حاصل کرلیا اپنے اک شعر میں وہ فرماتے ہیں۔

کیا نہ غیر سے اے بے وفا کبھی حیلہ
ہمارے پاس ہی آنے تجھے بہانہ ہوا(۱)

داغ نے اس شعر کو پسند کیا اور ایک نقطہ کی اصلاح دی کہا کہ آنے کو آتے کردو۔ واصفی کو داغ کی شاگردی کا زیادہ شرف حاصل نہ ہوسکا۔ جناب داغ کے انتقال سے واصفی کو بیحد صدمہ ہوا۔ اس تعلق سے اپنے مضمون مشمولہ مرقع سخن میں محمد عمر رقمطراز ہیں کہ ''ایک رات استاد داغ مرحوم واصفی کے خواب میں آئے اور ایک طرح بھی دی جو درج ذیل کی جاتی ہے۔

ع۔ تمہارا جور و ستم کچھ مزا نہیں دیتا

مرقع سخن میں محمد عمر لکھتے ہیں کہ استاد داغ کی اصلاحوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اشعار میں بہت کم تبدیلی کرتے اور شاعر کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع دیتے ایک بار واصفی نے ایک شعر کہا۔

کیوں کر مرا سخن نہ ہو مقبول واصفی
پایا ہے میں نے بلبل ہندوستان سے فیض (۲)

اس شعر سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ واصفی کی شاعری داغ کی نظر میں ایک پختہ شاعر کی تھی جس کو اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ''عہد محبوبیہ'' میں واصفی کی غزلیں رسالہ محبوب الکلام'' معیار انشاء'' زبان دہلی اور اکثر گلدستوں میں شائع ہوتی تھیں۔ استاد داغ کے انتقال کے بعد واصفی ایک پختہ شاعر بن چکے تھے۔ احتراماً استاد سرمد کو کبھی کبھی اپنا کلام دکھانے لگے گو اصلاح کی ضرورت باقی نہیں تھی۔

واصفی کے کلام میں شاعری کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ استاد داغ کی طرح ان کا کلام بھی تصنع سے پاک تھا۔ زبان نہایت آسان مگر انداز بیان میں شوخی۔

قصور وار محبوب ہیں سامنے ان کے کھڑے ہیں سر کو جھکائے گناہگار سے ہم

واصفی کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غزلوں کے علاوہ مسلسل نظمیں بھی کہیں تھیں۔ ایک قابل ذکر نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پردے سے جو تونے منہ نکالا اے حسن ترا ہوا اجالا
عالم میں جو تیرا نور چمکا ہر اک نے فراغ اس سے پایا
تیری ہی ضیا ہے صبح میں بھی گردوں پہ شفق تجھی سے پھولی
ہے جلوہ آفتاب تجھ سے ذروں میں ہے آب و تاب تجھ سے
ہے شمس و قمر میں نور تیرا کس شے میں نہیں ظہور تیرا (۳)

واصفی نے طویل عمر پائی۔ ضعیفی میں ان کا ایک جوان فرزند فوت ہوگیا جس کا ان کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ اس سانحہ کے بعد ان کے کلام میں درد و غم کے جذبات نمایاں ہوگئے۔ یہ رباعی ملاحظہ ہو۔

ہر چند جہاں کی خاک ہم نے چھانی جانی تو آخر یہ حقیقت جانی
اللہ ہے، بندہ بندہ باقی ہے فانی فانی

''عہد محبوبیہ'' کے واصفی ایک کامیاب شاعر تھے۔ انہیں بادشاہ وقت آصفجاہ سادس سے بے پناہ عقیدت تھی۔ گو دربار سے وابستہ نہیں تھے مگر آصفجاہ کی مدح میں سالگرہ

کے موقع پر ایک قصیدہ نظم کیا۔ چند شعر درج ہیں۔

ہر ایک طرف دیکھ کے آثار خوشی کے
جب مجھ کو ہوئی سوچ تو دل نے کہا ناداں
محبوب علی خاں کی جو ہے سالگرہ آج
یہ عیش و طرب کا ہے اسی واسطے ساماں
وہ شاہ جو ہر ایک کا ہے شاہد مقصود
وہ شاہ کہ دل جس پہ رعایا کے ہیں قرباں
وہ شاہ کہ آتی ہے نظر جس سے حقیقت
وہ شاہ کہ دل جس کا ہے آئینہ عرفاں
وہ شاہ جو ہے فخر سلاطین زمانہ
وہ شاہ جو ہے غیرت فغفور و سلیماں

واصفی کے کئی شعر عام و خاص کی زبان پر آج بھی ہیں جیسے۔

ہنس رہے ہیں وہ غیر سے سر بزم
اپنی قسمت کو رو رہا ہوں میں
میری ہستی بھی اک حقیقت ہے
مظہر قدرت خدا ہوں میں

☆☆

(۱) محمد عمر۔ مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ (۲۳۴)
(۲) محمد عمر۔ مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ (۲۳۴)
(۳) محمد عمر۔ مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر زور، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ (۲۳۴)

ہدایت محی الدین خان وجدؔ

نام ہدایت محی الدین خان اور تخلص وجد تھا۔ وجد خاندان نوائط سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۲۴۰ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ خاندانی سلسلہ والد کی طرف سے حضرت جعفر صادق تک پہنچتا ہے۔ جداعلیٰ تاج الدین خاں نواب سکندر جاہ کے عہد میں ارسطو جاہ کی ایما پر مدراس سے حیدرآباد منتقل ہوگئے (۱) حیدرآباد میں ارسطو جاہ نے ان کی قابلیت دیکھ کر سرکار آصفیہ سے منصب جاری کروادیا تھا۔ جناب وجد کی تعلیم ان کے والد غلام محی الدین خاں کی نگرانی میں ہوئی۔ جناب وجد بہت نیک سیرت صاحب اخلاق اور صوم وصلوٰۃ کے پابند شاعر گزرے ہیں آپ کے تین صاحبزادے محمد علی، احمد علی اور محمد خاور علی تھے۔ آپ کی وفات ۱۳۴۴ھ میں ہوئی۔

جناب وجد کو تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاعری کا شوق ہوا اور جب داغ دہلوی حیدرآباد آئے تو یہ بھی ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوگئے اور ان سے اصلاح لینے لگے۔ جناب وجد کی شاعری میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ جیسے حمد، نعت، قصیدہ، رباعی، غزل اور قطعات وغیرہ۔ قابل ذکر ہیں۔ وجد ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ان کی نعت کے چند اشعار درج ہیں۔

روبرو روضۂ پیغمبرؐ کے   بندہ آیا خدا خدا کرکے
سید المرسلین رسول اللہ   یہ لقب ہیں ہمارے سرور کے
شب معراج منتظر تھے سبھی   عرش کیا، عرش کے بھی اوپر کے
خضر و الیاس دونوں کے دونوں   راستہ پر ہیں میرے رہبر کے

وجدؔ قربان یا رسول اللہ
ہے غلاموں میں آل اطہر کے(۱)

جناب وجد کی شاعری میں غزل کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

حسن نے تیرے ترا چرچا کیا عشق نے میرے مجھے رسوا کیا
یار تیرے حسن کے بازار نے پہلے میری جان کا سودا کیا
یار پر مرنے کی خاطر ناصحا
وجد کو اللہ نے پیدا کیا

جناب وجد کی شاعری میں طویل بحر کی غزلیں بھی ملتی ہیں جیسے یہ غزل کے چند اشعار۔

کچھ گئی جان نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
نہ قضا آئی ہوئی ہوں کہ میں جا بھی نہ سکوں
نام مٹی پہ مرا لکھ کے وہ فرماتے ہیں
تو وہ لکھتا نہیں لایا کہ مٹا بھی نہ سکوں

وجد کے کلام میں داخلیت اور خارجیت کا میلان ابتدا ہی سے موجود تھا۔ نفس مضمون اور اسلوب بیان کے اعتبار سے ان کی غزل گوئی میں وہی فضا ہے جو اس وقت کے اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ یعنی داغ و امیر کے سامنے تک جو فضا اس دور کے شعرا کے کلام پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی وجد کے کلام میں موجود ہے۔

وجد نے مشکل زمین میں بھی اپنی جودت طبع سے نادر اشعار نکالے ہیں اور ان میں شدت اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

رخنہ اندازیاں وہ روزن دیوار کرے
اور اسے دور سے میں آنکھیں دکھا بھی نہ سکوں
کیا میں اپنے دل پر داغ کی منت کا چراغ
کسی اجڑی ہوئی مسجد میں جلا بھی نہ سکوں

ناتواں آہ مری کہیت ہے اس کان سے وجد
وہ نہیں میں تری بجلی جو گرا بھی نہ سکوں

☆☆

(۱) عزیز جنگ ولا ، نوائد التوارخ ، حیدرآباد ، ۱۳۳۲ھ ۔ صفحہ ۔ (۵۳۳)

(۲) عزیز جنگ ولا ، نوائد التوارخ ، حیدرآباد ، ۱۳۳۲ھ ۔ صفحہ ۔ (۵۳۶)

صاحبزادہ نواب میر وزیر علی خاں وزیرؔ

صاحبزادہ نواب میر وزیر علی خاں خانوادہ آصفیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد نواب میر یار جنگ بہادر تھے جو نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے پوتے تھے اور نواب صمصام الملک کے فرزند تھے۔نواب وزیر علی خاں عام طور پر وزیر علی پاشا کے نام سے مشہور تھے۔ان کا تخلص وزیر تھا۔ان کو میر احمد علی اثر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔وزیر ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲رشوال ۱۳۲۹ھ کو وفات پائی۔درگاہ حضرت برہنہ شاہ صاحب قبلہ حیدرآباد میں مدفون ہیں۔نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے وزیر کو برقرار جنگ، آصف الدولہ، آصف یاور الملک کے خطابات اور اعزازات سے نوازا تھا۔(۱)

وزیر کی تعلیم اسی زمانے کی واحد درسگاہ دارالعلوم میں ہوئی۔انہیں عربی، فارسی، میں ید طولیٰ حاصل تھا۔علمی و ادبی محفلوں میں ان کو بڑی عزت حاصل تھی۔شاہ دکن سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔وزیر نے اپنے قلمی دیوان کو ''چمنستانِ سخن'' کے نام سے منسوب کیا تھا۔مرقع سخن جو ڈاکٹر محی الدین قادری کا مرتب کردہ ہے اس میں شامل ایک مضمون کے مطابق وزیر کا یہ دیوان ۶۱۵ صفحات پر مشتمل ہے(۲)

وزیر کے کلام میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور رباعیات بھی ملتی ہیں۔ان کی غزلوں میں بیساختگی، سلاست، شوخی اور بلند خیالی نمایاں ہے۔غزل کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔جس میں ان خصوصیات کی جھلک ملتی ہے۔

مجھ ہوا خواہ کو رکھتا ہے ہوا کے اوپر
کیا یہ دستور ہے فقروں میں اڑانا تیرا

آنکھ تھی عشق کی، تھا حسن و جوانی پہ غرور
میری نظروں میں ہے وہ آنکھ لڑانا میرا

رہبر کو اپنے ہاتھ سے رہزن بنالیا بیٹھے بٹھائے دوست کو دشمن بنالیا

شاہ دکن کے لئے ان کے دل و جاں نثاری کے جذبات موجود تھے۔ذیل کے اشعاران جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اے شہنشاہ زمن کیوں نہ ثنا خواں ہو وزیر
حیدرآباد دکن کا ہے ترے سر سہرا

قیامت تک رہے نام و نشاں سرکار عالی کا
زمیں سرکار کی ہو آسماں سرکار عالی کا

نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کی شادی کے موقع پر وزیر نے ایک سہرا لکھا تھا اس کے چند اشعار یہ ہیں:

دیکھو سر پر ترے محبوب دلاور سہرا
عالم افروز و درخشندہ و خوش تر سہرا

رشتہ تارشعاعی سے عجب حسن کے ساتھ
گوندھ کر لایا ہے خورشید منور سہرا

بزم عالم میں سے ایک ایک بشر کے لب پر
ہو مبارک تجھے اے رشک سکندر سہرا

وزیر کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی۔بعض تاریخوں میں برجستگی و بے ساختگی پائی جاتی ہے۔انہوں نے کئی تاریخی قطعات کہے ہیں۔

وزیر نے کئی رباعیاں بھی لکھی ہیں۔اکثر رباعیاں اولیاءاللہ اور بزرگان دین کی شان میں ملتی ہیں۔وزیر کی نظموں میں بھی شاہ سے بے پناہ عقیدت اور جاں نثاری کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔

شاد کرتی ہے ہر اک دل کو وزارت شاد کی
دھوم ہے گلزار عالم میں مبارکباد کی

یہ خبر سن کر دل احباب شاداں ہوگئے
مستقل راجہ کشن پرشاد دیواں ہوگئے

وزیر نے ایسی کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں حضور اکرم اہل بیت اطہار اور کئی بزرگان دین کی مدح اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ان کی نعتوں میں سے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

نعت:۔

ہے سینۂ بے کینہ مرا کوئے مدینہ
ہر سانس سے آتی مجھے بوئے مدینہ

مرثیہ:۔

ہو رقم کیا ہم سے وصفِ داستانِ اہل بیت
لابیاں کہتے ہیں جس کو ہے بیانِ اہل بیت

قصیدہ:۔

نہ بھولیں گے کبھی ہم راہ حق کی
ہمارے رہنما ہیں غوث اعظم

منقبت:۔

اسرارحق دہن کو اعجاز لب سخن کو
الہام غیب جانا گویا کلام خواجہ

وزیر کے دیوان میں مخمس بھی ملتے ہیں نمونہ کے طور پر ایک مخمس کا ایک بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہے ناقدوں کے ہاتھ میں فکرِ سخن عبث — ساقی اگر نہیں تو شراب کہن عبث
رونق فزا جو روح ہووے یہ تن عبث — تکلیف باغ دیتا ہے بے گلبدن عبث
لہرا رہی ہے مجھ کو ہوائے چمن عبث

☆☆

(۱) مبکش۔مضمون صاحبزادہ میر وزیر علی مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، صفحہ (۱۵۵)
(۲) مبکش۔مضمون صاحبزادہ نواب میر وزیر علی خاں مشمولہ مرقع سخن جلد دوم۔صفحہ (۱۵۵)

سید افتخار علی شاہ صاحب وطنؔ

نام سید افتخار علی شاہ تھا اور تخلص وطن فرماتے تھے۔ ولادت سادات گھرانے میں ۱۲۴۹ھ میں ہوئی۔ تیسویں پشت میں آپ کا سلسلہ حضرت امام زین العابدینؓ سے ملتا ہے۔ وطن جب سات سال کے ہوئے تو ان کے والد میر کاظم علی الحسینی المدنی کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی تعلیم و تربیت والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ بچپن میں قرآن وحدیث کا درس لیا۔ دورانِ تعلیم مولانا روم کی مثنوی کا درس بھی حاصل کیا اور مذہبی تصنیفات کا گہرا مطالعہ فرمایا۔ شاعری اور علم عروض کا درس میر شمس الدین فیض سے حاصل کیا۔ جوانی میں اپنا خاندانی سلسلہ بیعت و خلافت حاصل فرمایا۔ دنیا سے بے نیاز ہوکر اللہ تعالیٰ سے رجوع ہوگئے۔ دن رات ذکر میں گزارتے اور اسی حالت میں بارگاہ اجمیر شریف کی زیارت فرمائی۔ پھر خواجہ صاحب اجمیر کی بشارت سے حیدرآباد دکن واپس ہوگئے۔ وطن جب اجمیر میں تھے آپ کے کرامات کا ظہور شروع ہوگیا تھا۔ لوگ آپ کے کرامات سے فیض یاب ہونے لگے۔ معتقدین کا حلقہ بڑھنے لگا۔ آپ کو سلسلہ چشتیہ، صابریہ سے بیعت کا خاندانی سلسلہ جاری تھا۔ حضرت وطن شریعت وطریقت کے سخت پابند تھے۔ محبوبیہ دور میں آپ کی بہت عزت وقدردانی کی گئی۔ آپ کے سامنے کسی شخص میں ہمت نہیں کہ لب کشائی کرے حضرت وطن کا وصال ۱۳۲۴ھ حیدرآباد میں ہوا۔

آپ کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوتی ہے۔ لیکن اس میں عشق مجازی پر عشق حقیقی ایسا غالب آیا جس نے وطن کو شاعر کم اور صوفی زیادہ بنادیا۔ آپ کی شاعری میں حضرت فیض کا ایسا اثر شامل تھا کہ وہ زندگی میں ایک صوفی منش انسان ہوکر رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر زور داستان ادب حیدرآباد میں ان کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

.ııl .ııl 0.28KB/s 4:24 72%

حضرت وطن کا سلسلہ تلامذہ اور سلسلہ بیعت وتصوف ایسا جاری رہا کہ اب تک قائم ہے اور صدیوں قائم رہے گا(۱) حضرت وطن کے کلام میں تصوف کی چاشنی نمایاں نظرآتی ہے انہیں سچی لگن عشق حقیقی سے تھی۔ان کے علاوہ کشف وعبادت سے ایسا مقام بلند پائے کہ حقائق ومعارف وواقعات عشق اور انسانی فطرت کے رموزان کی فکر کا موضوع و مرکز بن گئے۔سلوک چشتیہ کاان پرغلبہ رہا۔اس حصول مقصد کے لئے انہیں تصوف کی رہگزاری پسندآئی۔وطن صوفی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

''صوفی وہ ہے کہ دنیا کے غم وشاد کا گزراس کے پاس ہو۔تعریف اور مذمت کااس کے دل پرموثر انداز نہ ہو۔(۱)

چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

وہی صوفی وہی ہے قطب عالم نہ ہوئے غیر حق کا کچھ اسے غم

وطن صوف کے بارے میں ایک اور مقام پریوں فرماتے ہیں۔

''صوفی وہ ہے کہ باطن اس کا رنگ ماسوا سے حنا ہو''

وطن کے کلام میں ہرجگہ وجود باری تعالیٰ تحقیق کائنات۔وحدت الوجود،وجود دوعالم عالم ثانی،حقیقت روح،مسئلہ جبروقدر،خیروشر،حقوق اللہ،موجودومشہور،حقوق العباد اوراخلاقی مسائل کے موضوعات ملتے ہیں۔

حضرت وطن کے کلام میں تصوف ہی ان کی شاعری کا موضوع تھا۔جس میں انہوں نے اپنے جذبات حقیقی کے اثرات رقم کیے ہیں۔آپ کے کلام میں خواجہ میر درد کی طرح عشق مجازی اور عشق حقیقی کی حدیں ملی ہوئی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی ضمیر کی آوازیں ہیں جیسے یہ شعر۔

مکتوب بے غرض ہے نہ قاصد سے کام ہے
آئینہ نظر میں جہاں ہے جمال دوست
سمجھا نہ حق کو بندہ کہا یا تو کیا ہوا
اندھے کی طرح رو کے پکارا تو کیا ہوا(۲)

حضرت وطن کے دیوان میں تصوف کا رنگ ہرموضوع میں ملتا ہے۔جیسے غزل،

قطعہ، رباعی، مسدس وغیرہ میں بھی تصوف نمایاں نظر آتا ہے۔غزل کا ایک شعر۔

رہتی ہے جان عرش پر تن ہے یہاں مرا　　پایا ہے لامکان سے پرے ہے مکان مرا
سامنا مجھ کو ہے ہر پل اک رخ پرتور کا　　میری ہر ہر رگ میں ہے عالم چراغ طور کا

قطعہ

گلشن میں گل ہیں گل میں نہاں ہیں کئی دہن　　منہ میں سخن سخن کو ہیں پیدا کئی دہن
ہر راہ کو قیام ہے ہر سانس کو ہے جسم　　ہر دو بدو فنا کو تامل نہیں وطن

رباعی

جو اہل نظر ہیں وہ نظر کو دیکھیں　　جو اہل خبرہ ہیں وہ خبر کو دیکھیں
لے نام خدا کا نہ کوئی بت کا وطن　　گر ایک نظر یار بشر کو دیکھیں

☆☆

(۱) محی الدین قادری زور ڈاکٹر، داستان ادب، حیدرآباد، صفحہ (۱۴۰)
(۲) عقیل ہاشمی ڈاکٹر، ارشادات وطن، حیدرآباد، صفحہ (۲۳)

صاحب زادہ میر جہاندار علی خان وفائی

نام صاحب زادہ میر جہاندار علی خان تھا اور تخلص وفائی کرتے تھے آپ خانوادہ شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ولادت ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ وفائی کے والد صاحب زادہ میر جہانگیر علی خاں نے اپنے فرزند کی ابتدائی تعلیم شاہی محلات میں دلائی۔ پانچ سال کی عمر میں مدرسہ اعزہ، ملک پیٹھ میں شریک کر دیا گیا۔ جو اس زمانہ میں صرف خانوادہ آصفیہ کے خاندان تک محدود تھا۔ وفائی نے اپنی لگن و جستجو سے بہت جلد اردو، فارسی میں مہارت حاصل کی۔ وفائی کے دادا صاحب زادہ میر ہدایت علی خان ہدایت اپنے وقت کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ شاعری خاندانی ورثہ میں ملی تھی۔ وفائی نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کی کوشش شروع کر دی۔ آپ خاندان آصفیہ کے فرزند تھے۔ ملازمت کرنا بہت شرم کی بات تھی۔ مگر آپ ملازمت کے لیے اپنے حاکم آصف جاہ سادس کے دربار میں حاضر ہوئے اور ایک قصیدہ لکھ کر پیش کر دیا۔ آصف جاہ سادس نے وفائی کے قصیدہ سے متاثر ہو کر ان کو تحصیلداری پر مامور کر دیا۔ وفائی زیادہ دن ملازمت کا سلسلہ نہ رکھتے ہوئے وظیفہ پر علیحدگی اختیار کر لی۔ آپ نے حضرت آغا داؤد صاحب صحو کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وفائی کی اپنے پیر و مرشد سے بے پناہ عقیدت تھی (۱) جناب وفائی اپنی فرصت کے اوقات کا ایک بڑا حصہ حضرت صحو کی صحبت میں گزارتے تھے اور حضرت صحو کے انتقال کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ وفائی صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ قرآن کریم کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے۔ زندگی بھر شراب نہیں پی۔ سادہ اور شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ وفائی کا کلام کلاسیکی تھا۔ قدیم روایات کے شیدا تھا۔ ان کی شخصیت کے بارے میں مرقع سخن جلد دوم میں صاحبزادہ محمد علی خان میکش یوں رقمطراز ہیں۔

وفائی کا نام شاعر کی حیثیت سے غالباً کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ نہ ان کا کلام رسائل میں شائع ہوتا ہے اور نہ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں (۲)

وفائی کے کلام میں مقناطیسی کشش نمایاں ہے۔ ان کی نظر میں عاشق کا دل ہمیشہ حسن کی وسعتوں میں ڈوبا رہتا ہے۔

کم سن محبوب عاشق کے بارے میں کہتے ہیں۔

اس کمسنی میں لے لئے دل تین چار کے   ہو کر جواں تو چھین ہی لوگے ہزار کے

جناب وفائی اپنے اشعار میں تخلص کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔

کیا اسی کا نام ہے شرط وفا   تم نے دل لے کے بے وفائی کی

ولہ

اے وفائی شہ لولاک کے صدقہ میں تیری   بات بھی بن کے رہی کام بھی بن کر نکلا

☆☆

(۱) محمد علی خان میکش، مضمون مشمولہ، مرقع سخن، جلد دوم، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء، صفحہ (۲۵۱)

(۲) محمد علی خان، مضمون مشمولہ مرقع سخن، جلد دوم، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء۔ صفحہ (۲۵۲)

عزیز جنگ ولاؔ

عزیز جنگ ولا کا اصلی نام احمد عبدالعزیز اور تخلص ولا تھا آپ نوائط خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ولا کی ولادت ۱۲؍ربیع الاول ۱۲۷۲ھ میں ضلع نیلور میں ہوئی۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین اور جدِ اعلیٰ مولوی اویس عربی الاصل نوائطی شافعی تھے۔

نواب سالار جنگ اول وزیرِ اعظم دکن مولوی نظام الدین کو ضلع نیلور سے جو اس وقت مدراس کے صوبہ میں تھا وہاں سے حیدرآباد دکن لے آئے اور عدالت کے نائب ناظم کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس زمانہ میں ولا کی عمر ۹ سال تھی۔ ولا کی تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی ولا نے جناب حبیب ذکا نیلوری جو مرزا غالب کے شاگرد تھے اور مولوی سید علی کامل لکھنوی، مضطر، راقم، افضل اور سنجر طبرانی سے درس حاصل کیا ولا کو فن عروض میں کمال حاصل تھا۔ قانون کی تدوین کے صلہ میں سلطنت آصفیہ نے انہیں عزیز جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ وائسرائے ہند کی جانب سے انہیں مزید دو اعزازات ملے۔ علمی قابلیت کے صلہ میں شمس العلماء اور عوامی خدمات کے صلہ میں خان بہادر کا اعزاز ملا۔ ولا نے سررشتۂ عدالت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بعد سررشتہ مال گزاری میں منتقل ہوگئے۔ آگے چل کر ولا صدر محاسبی میں اکونٹنٹ جنرل مقرر ہوئے اور اس کے بعد محکمہ مالگزاری میں مددگار معتمد کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کی قابلیت کے مدنظر حکومت آصفیہ نے انہیں کلکٹر کے عہدہ پر مامور کیا اور آپ بحیثیت کلکٹر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ آپ کی اولاد میں چار لڑکے ہیں جن کے نام یہ ہیں (۱) مولوی غازی الدین احمد (۲) محی الدین احمد (۳) علی الدین احمد (۴) رکن الدین احمد (۱)

ولا سلطنت آصفیہ کے ایک قادرالکلام شاعر اور صاحب طرز ادیب گزرے ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ حضور اکرم کے سراپا مبارک فارسی اور

اردو میں تحریر کیے۔ اُردو سراپائے مبارک میں جو اشعار پیش کئے ہیں۔ ان میں نادر تشبیہات واستعارات کثرت سے ملتے ہیں۔

وقار الملک مشتاق حسین کی وفات پر ولا نے جو مرثیہ لکھا ہے۔ وہ بھی کافی جگر سوز درد انگیز ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے قومی وملی درد کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

مٹایا اے فلک چن چن کے تو نے اہل دانش کو
ہمیشہ خانہ بربادی ہے داخل تیری عادت میں
نہ سرسید رہے باقی نہ محسن قوم کا مہدی
نذیر احمد پڑے سوئے ہیں تنہا اپنی تربت میں

ولا کے کلام میں بے شمار بلند پایہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ جس میں حسن وعشق کے مکالمات دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ وطن پرستی اور قومی جذبات کا بیان بھی پرسوز انداز میں ملتا ہے۔ ایسے اشعار کی بھی ان کے کلام میں کمی نہیں جس میں حسرت ویاس اور قنوطی خیالات پائے جاتے ہوں۔ ذیل میں ان خصوصیات کے شعر درج کئے جاتے ہیں۔

بجھ کر رہا فراق میں اس کے دل حزیں — شب ہی میں سو گئے تھے چراغ سحر سے ہم
ہم رو رہے تھے بزم میں جب چل رہا تھا دور — اشکوں کو دل نے بادہ احمر بنادیا
غم سے بھر آئی آنکھ تو پینے لگے ہم اشک — ضبط الم نے آنکھ کو ساغر بنادیا(۲)

مومن کی مشہور غزل ”تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو“ کی زمیں میں ولا نے ایک غزل کہی تھی جس میں حسن وعشق کے مکالمے نہایت دلکش پیرائے میں پیش کیے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

ہوا ذکر وعدہ وصل کا تو کہا کہ یاد نہیں ذرا
میں کبھی نہ چھوڑوں گا مدعا تمہیں یاد ہو کہ یاد ہو

حیدرآباد دکن سے ولا کو بے پناہ محبت وعقیدت تھی جس کا اظہار وہ بڑے فخر سے کرتے تھے۔ ذیل کے اشعار میں اس جذبہ کو ترجمانی ملاحظہ فرمائے۔

دلی سے کچھ غرض نہ ہمیں لکھنو سے کام — ملک دکن ولا ہے وطن اپنے یار کا
گو لکھنو کی سیر میں محو سرور ہوں — رہ رہ کے مجھ کو آتی ہے اپنے دکن کی یاد

ولا شاعر ہونے کے علاوہ بہت بڑے نثر نگار تھے۔ان کے نثری و شعری تصانیف کی کافی طویل فہرست ہے۔ولا اگر شاعر نہ بھی ہوتے تو ان کی نثری خدمات اس قدر وسیع ہیں کہ اردو ادب میں جب بھی تاریخ لکھی جائے گی ان کے کارناموں کا سنہری الفاظ میں ذکر کیا جائے گا۔ذیل میں ان کے تصانیف کے نام درج کئے جاتے ہیں۔

(۱)منتخب المام(۲)خزینۃ۔۔۔(۳)عمدۃ القوانین(۴)اعظم العطیات (۵)تاریخ عزیزہ(۶)آصف اللغات(فارسی)(۷)کلیات نظم ولا(۸)تاریخ نوائط (۹)مجموعہ احکام مال(۱۰)قوانین مالگزاری(۱۱)شرح قانون مال(۱۲)شیرازہ دفاتر (۱۳)محبوب السیر (۱۴)عطیات سلطانی (۱۵)سیرت دکن(۱۶)ترکاری کی کاشت (۱۷)کاشت انگور(۱۸)غرائب الجمل(۱۹)مصطلحات دکن(۲۰)الثانیت والتزکرہ (۲۱)معیار فصاحت(۲۲)فارسی کلیات(۲۳)اردو کلیات وغیرہ۔

ولا کو صحافت سے بھی خاص دلچسپی تھی انہوں نے اپنی ادارت میں ''عزیز الاخبار'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے ''لسان الہند والعجم'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔جس کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

ذیل میں بطور نمونہ ولا کی شاعری کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

ہے اگر گل کو تلاش ترجمان عندلیب
ایک میں ہوں جو سمجھتا ہوں زبان عندلیب
ڈر خزاں کا، باغباں کا، خوف ہے صیاد کا
آفتیں ہیں اور کیا کیا ایک جان عندلیب

ولہ

دشت جنون میں عمر بھٹکتے گزر گئی
لیکن دل حزیں سے نہ نکلی وطن کی یاد

☆☆

(۱) عزیز جنگ ولا، تاریخ نوائط، جلد اول، صفحہ (۱۲۱)

(۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ (۵۷۹)

حکیم وائسرے وہمی

نام وائسرائے تھا اور تخلص وہمی۔ آپ کا خاندان کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہمی کی ولادت ۲۸/ذیعقدہ ۱۳۰۸ام ۶/جولائی ۱۸۹۱ء ہوئی۔ جناب وہمی کے والد ڈاکٹر کرپا شنکر حشم بھی شاعر تھے ان کی اور مہاراجہ شیوراج بہادر دھرم ونت کی قریبی رشتہ داری تھی۔ وہمی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں سٹی ہائی اسکول لاڈ بازار حیدر آباد میں داخل کیا گیا۔ میٹرک تک اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد طبابت کے تعلیم کے لئے مدرسہ طبِ یونانی (نظامیہ طبیہ کالج) سے حکمت میں سند حاصل کی اور سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ والد کے مطب پر بھی وہمی مریضوں کا معائنہ کرتے تھے۔ ملازمت سے وظیفہ حاصل کرنے کے بعد اپنے والد کے مطب پر کافی مدت تک حکمت کرتے رہے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی وفات ہوئی (۱)

جناب وہمی کو شاعری کا شوق ورثہ میں ملا۔ اپنے والد کی طرح وہمی حکمت کرتے ہوئے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ نادر علی برتر سے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ جناب وہمی ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے اور حکیم بھی۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین حصہ کارنامہ رامائن کا "منظوم ترجمہ" انجام دیا۔ اس ترجمہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک ہی قافیہ استعمال کیا گیا ہے۔ رامائن کے منظوم ترجمہ میں چھ چھ ہزار اشعار ہیں جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئے۔ (۲) ان کے دیگر اصناف سخن میں ہمیں موضوعی شاعری ملتی ہے۔ مثلاً آرتی، سدھ سری گنیش آئینہ وغیرہ۔ نمونے کے طور پر یہاں ان کی غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

خدا پر ہو نظر جن کی قناعت جن کا پیشہ ہو　　خدا کو ہیں وہی پیارے وہی منظور ہوتے ہیں

آرتی نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

سری رگھوناتھ دیا کے سوامی نرگن ہو تم انتر یامی
دینا ناتھ، دیا کے ساگر سرشٹی کے تم ہی ہو اجاگر
رام لچھما پورن کا دسرتھ نندن بل کے دھاما
آرتی آپ کی ہم کرتے ہیں چرنن میں مستک دھرتے ہیں
گن وہی کے اجاگر کردو پار اس کو بھوساگر کردو

☆☆

(۱) سلیمان اریب، حیدرآباد کے شاعر، حیدرآباد ۱۹۶۴ء، صفحہ (۱۰۵)
(۲) نصیرالدین ہاشمی، دکنی ہندو اور اردو، ۱۹۳۶ء، صفحہ (۱۱۵)

حکیم عاشق حسین ہاتفؔ حیدر آبادی

نام عاشق حسین اور تخلص ہاتف تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۸ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ اپنے والد حکیم عنایت علی خاں شمس الحکما کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر حکمت کی سند لے کر اپنے والد کی سرپرستی میں اپنے گھر واقع بیگم بازار میں روزانہ مریضوں کو دیکھا کرتے تھے۔ جناب ہاتف کی شہرت دور دراز تک تھی۔ غریب مریضوں کا مفت ہی علاج کیا جاتا تھا اور صاحب استطاعت سے صرف دوا کی قیمت حاصل کرتے تھے۔ حکمت کے علاوہ خزانہ عامرہ (محکمہ تقسیم تنخواہ) میں اہلکار تھے۔ جہاں سے ہاتف ماہانہ پچاس روپے تنخواہ حاصل کرتے تھے۔ آپ کے دو صاحبزادے حکیم شفیع حسن عارف (ولادت ۱۳۱۲ھ م ۱۸۹۵ء) اور قاسم حسین تھے۔ ہاتف کی وفات ۵/رجب المرجب ۱۳۴۶ھ بروز جمعہ ہوئی۔ درگاہ حضرت داؤد آغا قبلہ میں مدفون ہیں۔ آپ کے فرزند اکبر عارف کے مادے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

حاجی حکیم عاشق حسین ہاتف ابوالعلائی

۱۳۴۶ ہجری

جناب ہاتف کو شاعری کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کے والد بھی مشہور شاعر تھے۔ ہاتف اپنا کلام سرفراز علی وصفی لکھنوی کو بغرض اصلاح دکھاتے تھے۔ انہوں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی لیکن فن تاریخ گوئی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ نظم کے علاوہ ہاتف نے نثر میں بھی اپنی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ ہاتف حکیم تھے اس لئے فن طب پر بھی اپنی یادگار نثری تصانیف چھوڑی ہیں (۱) فراغ اطبا (۲) مرقع پیری) (۳) تریاق السموم، یہ تینوں کتابیں فن طب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ نعتیہ کلام کے مجموعہ بھی انہوں نے مرتب و شائع کئے (۱) خیال مدینہ (۲) ناقہ نبوی (۳) باغ مدینہ اور (۴) بہار مدینہ

(۵) بیاضِ مدینہ (۶) نغمۂ توحید (۷) خزانہ ابوالعلائی (۸) جواہ انفاس (۹) عشق نامہ (۱۰) اشتیاق ہاتف (۱۱) مثنوی جلوہ داؤد (۱۲) حلیہ ابوالعلائی وغیرہ قابل ذکر ہیں (۲)

جناب ہاتف نے حضرت سید شاہ آغا داؤد صاحب ابوالعلائی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے پیرو مرشد کے شان میں ایک کتاب لکھی جو جلسۂ ابوالعلائی کے نام سے شائع ہوئی۔

ہاتف کے نعتیہ کلام کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

نوراحمد میں نہاں جلوہ جانا نہ ہوا — آپ ہی شمع بنا آپ ہی پروانہ ہوا
دل میں طیبہ کی ہوا سینہ میں کعبہ کی ہوس — یہ نبی جلوہ بنا اور وہ خدا خانہ ہوا

خلد میں پیش نبی دیگی مزا نعت شریف
سننے والے یک طرف ہاتف ثنا خواں یکطرف

بعض حضرات کو جناب ہاتف کے اشعار زبانی یاد ہیں۔ ایک صاحب سید معین الدین اہل چنچل گوڑہ نے راقم کو انٹرویو میں ہاتف کا ایک شعر زبانی سنایا۔ ملاحظہ ہو۔

وفا کا نام کسی نے پھر عمر بھر نہ لیا
ترے سلوک نے چونکا دیا زمانے کو

غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

جو تھا طفل وہ نوجواں ہوگیا — بہار گل و گلستاں ہوگیا
جوانی سے خوبی ہے انسان کی — جوانی نگہبان ہے جان کی

سماعت بصارت جوانی سے ہے
کمال شجاعت جوانی سے ہے (۳)

☆☆

(۱) حامد ملتانی۔ عہد عثمانی کا تاریخ گوشاعر ۱۹۸۵ء صفحہ (۲۳)
(۲) حامد لطیف ملتانی، عہد عثمانی کا تاریخ گوشاعر، حیدرآباد، ۱۹۸۷ء صفحہ (۳۸)
(۳) تسکین عابدی، سخ دکن، حیدرآباد، ۱۳۷۵ھ صفحہ (۲۷۶)

ابوالحسن محمد داوٗد ہادی

نام ابوالحسن محمد داوٗد اور تخلص ہادی تھا۔ ولادت ۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۸ء میں بمقام دہلی ہوئی۔ آپ میر حیدر علی صاحب کے پوتے اور آپ کا سلسلہ نسب حضرت خلیفہ اول ابوبکر صدیقی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ جناب ہادی کا بچپن دہلی میں گزرا۔ آپ کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ نو برس کی عمر میں جناب ہادی حافظ قرآن ہو گئے اپنے والد کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ جب دلی سے بمبئی پہنچے تو وہاں حضرت نورالدین شاہ قادری سے ملاقات ہوئی۔ ان کی ہدایت پر ہادی اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ جناب ہادی کے والد ایک بزرگ عالم، نیک سیرت اور روشن ضمیر شخص تھے۔ آپ کی علمی قابلیت دیکھ کر آصفجاہ خامس نے دارالعلوم پر آپ کا تقرر کیا اور دو سو روپیہ منصب سے سرفراز فرمایا (۱) جناب ہادی نے (۷۰) برس کی عمر پا کر ۱۳۴۵ھ میں انتقال کیا۔

ہادی کو شاعری کا اچھا ذوق تھا۔ اپنا کلام مرزا قربان علی سالک دہلوی کو بغرض اصلاح دکھلاتے تھے۔ کلام دلچسپ و معتبر تھا مگر زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ صرف ایک مثنوی پری پیکر کے نام سے شائع ہوئی۔ کلام میں دہلی اسکول کی چاشنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ آپ کے کلام میں حمد، نعت، قصیدہ، منقبت، رباعی، قطعات اور غزلیات بھی اصناف سخن ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار حمد کے درج کئے جاتے ہیں۔

گریہ ہی رہا حال مرے آہ و بکا کا　　اللہ نگہبان ہے پھر ارض و سما کا
کیا حال کیا کیا کہوں فرقت نے شب غم　　بیتابیوں نے ارض کا، نالوں نے سما کا

واقف نہیں تو ہادی آشفتہ سے ظالم
وہ کشتہ دل ریش تری تیغ ادا کا

ہادی کے رنگ تغزل کے اظہار کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

کون جانے مبتلا کے حال کو جز مبتلا — کون روئے حال پر میرے سوائے عندلیب

کوئی حیلہ رہ نہ جائے دادخواہی کے لئے — ہم ادھر بیٹھیں ادھر کچھ غل مچائے عندلیب

ہم نے ہادی عشق کر کے جو اڑائے ہیں مزے

مر کے بھی ایسی کبھی لذت نہ پائے عندلیب

☆☆

(۱) غلام صمدانی خاں گوہر، تزک محبوبیہ، جلد دوم، دفتر شعراء، صفحہ (۱۷۵)

ہدایت علی خان ہدایتؔ

نام محمد ہدایت علی خاں اور تخلص ہدایت تھا۔ ولادت ۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۸ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ آپ خانوادہ آصفیہ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کے والد میر معزالدین خاں المخاطب شرف یار جنگ ہمایوں جاہ تھے۔ جناب ہدایت کی پرورش شاہی محلات میں ہوئی (۷) سال کی عمر میں مدرسہ اعزہ میں شریک کیا گیا۔ مدرسہ اعزہ صرف امرا کے بچوں کی درسگاہ تھی۔ خاندان آصفیہ کے فرد ہونے کی وجہ سے ملازمت کا سوال نہیں تھا۔ آپ کے وہ صاحبزادے تھے۔ آپ کی وفات ۱۳۳۵ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ (۱)

جناب ہدایت کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا جو ورثہ میں ملا تھا۔ کوئی اور مصروفیات نہ ہونے کی وجہ سے شعروشاعری کی محفلیں آراستہ کرنا ان کا خاندانی مشغلہ تھا۔ اپنے کلام پر حضرت فیض سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جناب ہدایت کے کلام میں غزلیات، مثنوی، مخمس، رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔

نمونے کے طور پر غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

میں نے غیروں کو تو پھر گھر میں بلانا چھوڑا — تو نے آنکھیں نہیں ہر بار ملانا چھوڑا

مرا عشق جب تجھ پہ اظہار ہوگا — تجھے درد و غم بھی تو بسیار ہوگا

دل کی صفائی مانگ ہدایت بقول درد — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

گلہ میں اب تو ہدایت کھلی ہے اپنی زبان — قسم وفا کی تجھے محض بے وفا کے لئے

ہدایت کی ایک مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ترا حمد کرنے کو جان جہاں — زمیں میں بھی ذروں کو طاقت کہاں

کہوں نعت احمد کی کہہ کر احد — کہ ہے خاص وہ نور ذات صمد

وہ ہے احمدی آئینہ سرمدی — کہ دکھلا دیا صورت ایزدی

جناب ہدایت کا قلمی دیوان کتب خانہ، سالار جنگ میں محفوظ ہے۔اس کی تصنیف کا سن ۱۲۷۵ھ اور کتابت کا ۱۳۰۱ھ ہے۔ان کی ایک رباعی ملاحظہ کیجئے۔

زاہد کو ہے جنت کی ہوا سے سروکار — عارف تو ہے معرفت حق سے سرشار

اور ہم ہیں خراباتی مختار عشق — ہے مست جہاں میں کوئی کوئی ہشیار(۲)

☆☆

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی ۱۹۷۸ء۔صفحہ (۵۱۳)

(۲) صاحب حیدر آبادی، جنوبی ہند کی رباعی گوئی۔حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۲۶۵)

مرزا عبداللہ بیگ ہوش دہلوی

نام مرزا عبداللہ بیگ اور تخلص ہوش تھا۔ ولادت ۱۲۷۷ھ م ۱۸۶۰ء میں دہلی میں ہوئی اپنے والد جناب مرزا قاسم بیگ کے ساتھ بچپن میں بعہد محبوبیہ حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ باقی تعلیم حیدر آباد میں والدین کی نگرانی میں ہوئی۔ ہوش کے والد مملکتِ آصفیہ میں اعلیٰ عہدیدار تھے(۱)

شاعری میں ہوش کو شمس الدین فیض سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کے کلام میں عشقیہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ عشقیہ غزلیات کا ایک مجموعہ ۱۳۰۶ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا جس میں عشقیہ غزلیات کے اخلاقی اشعار بھی ملتے ہیں۔ نمود کے طور پر غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

محبوب گر خدا ہے تو دولت پہ کیوں ہے عشق
باطل تمام اس سے تو دعویٰ ترا ہوا

دونوں جہاں سے ہوش اسے کچھ غرض نہیں
جس شخص کا کہ دل ہے خدا سے لگا ہوا

پھرتا ہے ہر طرف تو مجھے ڈھونڈتا ہوا
وہ جان جاں ہے مجھ ہی میں ایدل چھپا ہوا

ترے واسطے ہوش نے سب کو چھوڑا
مگر مجھ کو بے رحم کیا یاد ہوگا

وہ بولے دیکھ کے آئینہ میں رخ روشن
لگی ہے کیسی خدایا یہ آگ پانی میں

پوچھتے ہیں جو ہوش کو کیا ہے

ان کو کچھ رحم آگیا ہوگا(۲)

☆☆

(۱)(۲) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو دہلی، ۱۹۸۴ء، صفحہ (۵۰۹، ۵۱۰)

مرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی

نام مرزا واجد حسین تھا۔ پہلے یاس اور پھر یگانہ تخلص اختیار کیا۔ ولادت ۱۸۸۳ء میں عظیم آباد میں ہوئی۔ تعلیم عظیم آباد میں مکمل کی۔ نوجوانی میں تلاش معاش میں کلکتہ گئے۔ وہاں بیمار ہو جانے کے سبب پھر لکھنؤ لایا گیا۔ لکھنؤ میں شعروادب کی محفلیں آراستہ تھیں۔ وہاں ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی۔ لکھنؤ میں ان کی مقامی شعراسے ان بن ہوگئی۔ ''عہد محبوبیہ'' میں حیدرآباد وارد ہوئے۔ یہاں محکمہ رجسٹریشن میں ملازم ہوگئے اور یہاں سے وظیفہ حاصل کیا۔ پھر لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ وہاں ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔

یگانہ چنگیزی کو شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ بیتاب عظیم آبادی سے اصلاح لیتے تھے۔ جب لکھنؤ منتقل ہوگئے تو وہاں مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ لکھنؤ میں ان کے کلام نے بڑی شہرت پائی۔ وہ لکھنؤ کے شعرا پر سخت اعتراضات اور چوٹیں کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی یگانہ کو نیچا دکھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بالآخر یگانہ چنگیزی لکھنؤ سے دل برداشتہ ہو کر ''عہد محبوبیہ'' میں حیدرآباد آگئے (۱)

جناب یگانہ چنگیزی لب ولہجہ کے لحاظ سے اپنے دور کے منفرد غزل گو شاعر ہیں۔ اردو زبان پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ غزلوں کے علاوہ رباعیات نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی۔ یگانہ کا صحیح مرتبہ آج تک متعین نہیں ہوا۔ وہ اپنے معاصرین میں حسرت موہانی اور فانی بدایونی سے کم نہیں تھے۔ ان کی تصانیف کی تفصیل یوں ہے۔ نشترِ یاس، چراغِ سخن، آیاتِ وجدانی، غالب شکن، ترانہ، گنجینہ، ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار دیے جاتے ہیں۔

ہنوز زندگی تلخ کا مزہ نہ ملا   کمال صبر ملا، صبر آزما نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی　　مزاج اس دل بے اختیار کا نہ ملا
جواب کیا وہی آواز بازگشت آئی　　قفس میں نالہ جانکاہ کا مزا نہ ملا(۲)

دیگر غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نظر آئے جب آثار جدائی رنگ محفل سے
نگاہ یاس بیگانہ ہوئی یارانِ یکدل سے
لپٹتی ہے بہت یادوطن جب دامن دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کرلیتا ہوں منزل سے

یہیں سے سیر کرلو یاس اتنی دور کیوں جاؤ
عدم آباد کا ڈانڈا ملا ہے کوئے قاتل میں

یگانہ چنگیزی کی ایک غزل جو زبان زد خاص و عام رہی ہے۔ اس کے تین اشعار ملاحظہ ہوں جن میں جذبات کی ترجمانی بڑے موثر انداز میں کی گئی ہے۔

جب تک خلش درد خدا داد رہے گی　　دنیا دل ناشاد کی آباد رہے گی
روح اپنی ہے بے بیگانہ ہر جنت و دوزخ　　گم ہو کے ہر اک قید سے آزاد رہے گی

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا
...... پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی

یگانہ چنگیزی نے رباعیات میں بڑا کمال پیدا کیا تھا۔ یہاں ان کی وہ رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

ساجن کو سکھی منالو پھر سو لینا　　سوئی ہوئی قسمت جگالو پھر سو لینا
سوتا سنسار سننے والا بیدار　　اپنی بپتی سنالو پھر سو لینا

سورج کو گہن میں نہیں دیکھا شاید　　یا چاند گرہن میں نہیں دیکھا شاید
اے حسن وہ روزہ پہ اکڑنے والو　　یوسف کو کفن میں نہیں دیکھا شاید

(۱) سلیمان اریب، حیدر آباد کے شاعر، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء، صفحہ (۹۳)

(۲) سلیمان اریب، حیدر آباد کے شاعر، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء، صفحہ (۹۵)

کتابیات

مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
انورالدین محمد صدیقی	خوان نعیما	نیشنل فائن پریس، حیدرآباد	۱۳۷۵ھ
جگدیش مہتا درد	اردو کے ہندشعرا	مطبوعہ دہلی	۱۹۷۴ء
حبیب ضیاء (پروفیسر)	کشن پرشاد شاد	نیشنل فائن پریس، حیدرآباد	۱۹۷۸ء
حسام الدین فاضل محمد	دیوان نعتیہ فاضل	اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد	۱۳۶۸ھ
حسرت موہانی	انتخاب سخن جلد یازدہم	اردو اکاڈمی، یوپی	۱۹۸۳ء
داغ مرزا دہلوی	آفتاب داغ	نسیم بکڈپو، حیدرآباد	۱۹۵۹ء
دلاور علی دانش میر	ریاض مختاریہ	اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد	۱۹۴۳ء
رحم علی الہاشمی	اسٹارڈائرکٹری	اسٹار پریس، الہ آباد	۱۹۱۹ء
رمن راج سکینہ	تذکرہ، دربار حیدرآباد	ترقی اردو بیوریو، دہلی	۱۹۸۸ء
زینت ساجدہ	حیدرآباد کے ادیب جلد دوم	ساہتیہ اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۶۴ء
سردار علی محمد	کلام کیفی خیرآبادی	شمس الاسلام پریس حیدرآباد	۱۳۴۵ھ
سلیمان اریب	حیدرآباد کے شاعر جلد دوم	ساہتیہ اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۶۴ء
عبدالجبار خاں محمد صوفی	محبوب الزمن، جلد دوم	محبوب پریس، حیدرآباد	۱۳۲۹ھ
عبدالحی محمد	مملکت آصفیہ کراچی جلد دوم	ادارہ محبان دکن	۱۹۷۸ء
عبدالحی محمد	مملکت آصفیہ کراچی جلد دوم	ادارہ محبان دکن	۱۹۸۰ء
عبداللہ خاں ضیغم	دیوان ضیغم	مطبع فخر نظامی، حیدرآباد	۱۳۰۳ھ

عبدالمجید صدیقی	مقدمہ تاریخ دکن	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	۱۹۴۰ء
عزیز جنگ عزیز	گلکدہ داغ	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۳۶۴ء
عقیل ہاشمی ڈاکٹر	سید محمد افتخار علی شاہ وطن	اعجاز پریس حیدرآباد	۱۹۸۰ء
عزیز جنگ ولا	تاریخ نوائط	عزیز المطابع حیدرآباد	۱۳۲۲ء
غلام پنجتن شمشاد	حیدرآباد کے بڑے لوگ	اعجاز پریس حیدرآباد	۱۹۵۷ء
غلام صمدانی خاں گوہر	تزک محبوبیہ جلد دوم	محبوب پریس حیدرآباد	۱۳۱۹ھ
فخرالدین حسین قادری	دیوان شاہ خاموش	اسٹوڈنٹس بک ہاؤس	۱۴۰۶ھ
لئیق صلاح پروفیسر	میر شمس الدین فیض	میگو پبلکیشنز حیدرآباد	۱۹۸۰ء
لئیق صلاح پروفیسر	عہد ارسطو جاہ (ادبی خدمات)	نیشنل فائن پریس حیدرآباد	۱۹۷۶ء
مانک راؤ وٹھل راؤ	بستان آصفیہ جلد اول	انوارالاسلام پریس حیدرآباد	۱۳۲۷ھ
محبوب علی خاں اخگر	تلامذہ صفی اورنگ آبادی	دائرہ پریس	۱۹۹۱ء
مختار شمیم	ظہیر دہلوی حیات و فن	نصرت پبلکیشنز لکھنو	۱۹۹۰ء
مظفرالدین خاں صاحب	جنوبی ہند میں رباعی گوئی	نیشنل پریس حیدرآباد	۱۹۸۴ء
محی الدین قادری زور ڈاکٹر	مرقع سخن جلد اول	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۳۵ء
محی الدین قادری زور ڈاکٹر	مرقع سخن جلد دوم	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۳۷ء
محی الدین قادری زور ڈاکٹر	دکنی ادب کی تاریخ	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	۱۹۸۲ء
محی الدین قادری زور ڈاکٹر	داستان ادب	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	۱۹۸۲ء
محمد علی زیدی	مطالعہ داغ	کتاب نگر لکھنو	۱۹۴۷ء
مراد علی طالع سید	نظام الملک آصفجاہ اول	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۴۲ء
مراد علی طالع سید	نظام الملک آصفجاہ ثالث	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۴۳ء
مراد علی طالع سید	نظام الملک آصفجاہ رابع	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۴۳ء
مراد علی طالع سید	نظام الملک آصفجاہ خامس	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۴۳ء
مراد علی طالع سید	نظام الملک آصفجاہ سادس	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۴۴ء
مصطفیٰ کمال۔ منظور احمد	حیدرآباد میں بیرونی شعرا	نیشنل فائن پریس حیدرآباد	۱۹۸۸ء

منظر عباس نقوی	وحید الدین سلیم	علی گڑھ، یوپی	۱۹۹۶ء
نصیر الدین ہاشمی	دکن میں اردو	ترقی اردو بیورو دہلی	۱۹۸۵ء
نصیر الدین ہاشمی	دکھنی ہندو اور اردو	مطبع ابراہیم	۱۹۵۸ء
نصیر الدین ہاشمی	خواتین دکن کی اردو خدمات	رزاقی پریس حیدرآباد	۱۹۴۰ء
نظم طباطبائی	دیوان طباطبائی	مکتبۂ ابراہیم	۱۳۵۱ھ
نور اللہ محمد نوری	داغ دہلوی	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۳۵۵ھ
نرسنگ راج عالی	غم احباب شاد	ابراہیمیہ پریس حیدرآباد	۱۳۵۰ھ
وقار خلیل	سخن نامی	ایجاز پریس حیدرآباد	۱۹۸۳ء
ولی احمد خان	محاورات داغ	ادب اردو، دہلی	۱۹۴۴ء
یعقوب علی عرفاں شیخ	حیات عثمانی جلد اول	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۳۶ء

رسائل اور گلدستے

پنڈت رتن ناتھ سرشار	دبدبۂ آصفی	محبوب پریس حیدرآباد	۱۸۹۷ء
حمید الدین عاقل محمد	حسامی سالنامہ	اعجاز پریس حیدرآباد	۱۹۵۷ء
رضی الدین حسن کیفی	صحیفہ	صحیفہ پریس حیدرآباد	۱۹۰۵ء
طفیل محمد	نقوش سہ ماہی	لاہور، پاکستان	۱۹۵۶ء
ظفریاب خان	ادیب	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۰۸ء
عبدالحق	اردو	اورنگ آباد	۱۹۲۳ء
غلام حسین داد	الہادی	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۹۱۱ء
محب حسین	افسر	نظام پریس، حیدرآباد	۱۸۹۷ء
محمود الٰہی	المصدق جلد اول	نظام دکن پریس حیدرآباد	۱۳۴۲ھ
محمود الٰہی	المصدق جلد دوم تا پنجم	نظام دکن پریس حیدرآباد	۱۳۴۳ھ
یوسف الدین	ادیب	فخر نظامی پریس	۱۸۸۰ء
نیاز فتحپوری	ماہنامہ نگار	لکھنؤ	۱۹۵۳ء

چنداپرشاد ہیرالال	محبوب الکلام جلد اول	محبوب پریس حیدرآباد	۱۳۱۶ھ
چنداپرشاد ہیرالال	جلد دوم	محبوب پریس	۱۳۱۷ھ
چنداپرشاد ہیرالال	جلد دوم	محبوب پریس	۱۳۱۸ھ
چنداپرشاد ہیرالال	جلد دہم	محبوب پریس	۱۳۲۶ھ
سراج الدین احمد	معیارالانشاء	محبوب پریس حیدرآباد	۱۹۰۳ء
عبداللہ خاں ضیغم	گلدستہ جشن آصفیہ	مطبع فخر نظامی	۱۳۱۵ھ
عبداللہ خاں ضیغم	گلدستہ جشن آصفیہ	مطبع فخر نظامی	۱۳۱۹ھ
عبداللہ خاں ضیغم	گلدستہ سفر ہمایوں	مطبع فخر نظامی	۱۳۱۷ھ
صغرا ہمایوں مرزا	النسا	نظام دکن پریس	۱۳۱۶ھ
محب حسین	جذبات محب	اختر دکن پریس حیدرآباد	۱۳۲۲ھ
محب حسین	افکار محب	چشتیہ پریس حیدرآباد	۱۳۳۴ھ
مشرف جنگ فیاض	گلدستہ فیض	مطبع فخر نظامی	۱۳۲۴ھ
منشی محمد مشتاق احمد	مذاق سخن	محبوب پریس حیدرآباد	۱۸۸۳ء
نوراللہ محمد نوری	مشاعرہ	مطبع سیدی حیدرآباد	۱۹۲۹ء

مقالات

اطہر النساء بیگم	آصفجاہی عہد کے نعت گو شعرا	جامعہ گلبرگہ	۱۹۸۹ء
اشرف رفیع پروفیسر	نظم طباطبائی حیات و کارنامے	جامعہ عثمانیہ	۱۹۶۹ء
امتہ السلام عالمہ	عہد آصفجاہی کے صوفی شعرا	جامعہ عثمانیہ	۱۹۹۰ء
انورالدین محمد ڈاکٹر	حیدرآباد کے علمی و ادبی رسائل	یونیورسٹی آف حیدرآباد	۱۹۸۲ء
حبیب ضیاء پروفیسر	مہاراجہ کشن پرشاد ادبی خدمات	جامعہ عثمانیہ	۱۹۵۶ء
شاہانہ امیر	میر محبوب علی خاں حیات کارنامے	یونیورسٹی آف حیدرآباد	۱۹۸۵ء
عثمان محمد ڈاکٹر	امجد حیدرآبادی	جامعہ عثمانیہ	۱۹۸۱ء
عباس متقی ڈاکٹر	قاضی احمد علی قاضی	......	۱۹۸۸ء

علی احمد جلیلی ڈاکٹر	جلیل مانکپوری حیات کارنامے	......	۱۹۹۱ء
......صلاح پروفیسر	میر شمس الدین فیض	جامعہ عثمانیہ	۱۹۷۸ء

قلمی دواوین

احمد علی عصر	دیوان عصر	او۔یم۔یل (۱۲۹۸)	۱۲۸۲ھ
احمد علی عصر	نعت عصر	......(۱۲۲۶)	۱۲۹۳ھ
آفتاب علی خان مہر	دیوان مہر	......(۱۳۳۱)	۱۳۱۸ھ
امیر مینائی	واسوخت امیر	......(۱۲۰۹)	۱۲۸۴ھ
حبیب اللہ ذکا	انتخاب کلام	......(۱۸۵۱)	۱۲۷۵ھ
دلاور علی دانش	قصیدہ حضور	سالار جنگ (۷۸۵)	۱۳۱۴ھ
رحمت اللہ خاں رحمت	دیوان رحمت	کتب خانہ ذاتی (راقم)	۱۳۵۵ھ
غلام امام خاں ہجر	تاریخ رشید الدین خانی	سالار جنگ (۷۵۷)	۱۳۸۹ء
فرید الدین	کشکول	سالار جنگ (۷۲۴)	۱۳۲۷ھ
قادر حسین قادر	دیوان قادر	سالار جنگ	۱۳۰۰ھ
نظم طباطبائی	دیوان نظم	او۔یم۔یل (۱۳۲۴)	۱۳۲۴ف

ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خاں کی تصانیف

نمبر	کتاب		نوعیت	سال
1-	انتخاب کلام رحمت	:	شاعری	1992ء
2-	پروفیسر محمد علی اثر ایک مطالعہ			1993ء
3-	کلیات فدوی	:	(دکنی شاعری) تحقیق	1994ء
4-	گلستانِ رحمت کی تنقید تدوین	:	(شاعری)	1997ء
5-	دیوان عبداللہ قطب شاہ	:	(اشتراک پروفیسر اثر)	2000ء
6-	سخن ورانِ عہدِ محبوبیہ	:	(تحقیق)	2003ء
7-	نگارشات اثر	:	(مقدمات وتبصرے)	2004ء
8-	مقالات محمود قادری	:	(تحقیقی مقالات)	2006ء
9-	دیوان شاہ ضیاء الدین پروانہ	:	(اشتراک ڈاکٹر اختر)	2008ء
10-	معاصرینِ داغ دہلوی	:		2009ء

زیرِ طباعت

نمبر	کتاب	مصنف	نوعیت
11-	مثنوی روپ سنگھار (دکنی)	مولانا باقر آگاہ	(تحقیق)
12-	کلیات قلی قطب شاہ جدید تحقیق کی روشنی میں		(تحقیق)
13-	مثنوی قصہ ملکہ مصر	سید محمد عاجز	(تحقیق)
14-	مجلّہ عثمانیہ کا اشاریہ		(تحقیق)

☆☆☆

MAASREEN-E-DAGH DEHELVI

Edited by

Dr. Mohd. Ataullah khan

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com